قاضی عبدالودود نمبر

معاصر

اگست ۱۹۷۶ء

مرتب: کلیم الدین احمد



معاصر

قاضی عبدالودود نمبر

مرتب: کلیم الدین احمد

معاصر

قاضی عبدالودود نمبر

مرتب: کلیم الدین احمد

ضخامت :- ۴۴۸ صفحات

قیمت :- پچیس روپے

سالِ طباعت :- اگست ۱۹۷۶ء

تعدادِ اشاعت :- تین سو

مالک :- دائرۂ ادب، پٹنہ

مطبع :- دی آرٹ پریس، سلطان گنج، پٹنہ ۶

ناشر :- دائرۂ ادب، سنگی مسجد، پٹنہ ۶

فہرست

حرفِ آغاز

دائرۂ ادب نے اب تک "معاصر" کا کوئی خاص نمبر نہیں نکالا ہے۔ ایک بار تحریک ہوئی تھی کہ اقبال سے متعلق خاص نمبر نکالا جائے لیکن وہ تحریک آگے نہ بڑھ سکی۔ یہ نمبر نکال کر **دائرۂ ادب** نے اپنی مخصوص روایت سے انحراف کیا ہے۔

قاضی عبدالودود صاحب دائرۂ ادب کے رکن نہیں ہیں۔ وہ دائرۂ ادب کے جلسوں میں البتہ شریک ہوتے رہے ہیں اور معاصر کی قلمی معاونت کرتے رہے ہیں۔ شاید ان کے زیادہ سے زیادہ مضامین معاصر میں شائع ہوئے ہیں۔

تقریباً نصف صدی سے ان کا محبوب مشغلہ کتب بینی، تحقیق اور مضمون نویسی رہا ہے۔ اگر ان کے سارے مضامین کو اکٹھا کیا جاتا تو نہ جانے کتنی ضخیم جلدیں مرتب ہو جاتیں۔ لیکن انھوں نے اس کی طرف کبھی توجہ نہ کی۔ کیونکہ انہیں نہ ستایش کی تمنا تھی اور نہ صلے کی پروا۔ اور ستایش کی تمنا کیسے ہوتی جب صورت حال یہ ہو کہ "ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں" وہ غالب ہوں یا آزاد، شاد ہوں یا عبدالحق ہوں یا مسعود حسن رضوی، خواجہ احمد فاروقی، مالک رام، سید اختر احمد اورینوی ہوں یا اور کوئی، انہوں نے کسی کو نہیں بخشا۔ دو چار دیدہ ور محققوں کے علاوہ کسی نے ان کی قدر نہ کی اور کرتے بھی تو کیسے جب وہ ان کے ناوک کے صید تھے۔ رہا صلہ تو ایک تو گورنمنٹ آف انڈیا نے انہیں دس بارہ سال ہوئے Certificate of merit دی اور ابھی چند دن ہوئے

الف

انہیں غالب اوارڈ ملا۔

یہ شاید اردو میں ممکن ہے کہ کوئی نصف صدی سے زیادہ تحقیق میں غرق رہے اور تحقیقی مضامین لکھتا رہے اور وہ مضامین ہندوستان کے اکثر و بیشتر پرچوں میں چھپتے رہیں لیکن نہ ساہتیہ اکادمی اسے انعام دے، نہ کوئی ادارہ اس کے مضامین کو شائع کرنے کے لئے آمادہ ہو۔ اور زیادہ دانشور یہ سمجھتے رہیں کہ قاضی عبدالودود صاحب کا مطالعہ تو بہت وسیع ہے لیکن انہوں نے مضامین بہت کم لکھے ہیں۔ اس خاص نمبر کا مقصد یہی ہے کہ یہ غلط فہمی دور ہو جائے اور لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ انہوں نے کتنا لکھا ہے اور کیسا لکھا ہے۔ کتنے کی بات تو ان کے مضامین کی نامکمل فہرست سے واضح ہو جائے گی۔ اور یہ بات بھی واضح رہے کہ ان کے بعض بعض مقالے یا مضامین کتاب کی حیثیت رکھتے ہیں جیسے غالب بحیثیت محقق، آزاد بحیثیت محقق، عبدالحق بحیثیت محقق ـــ یہ صرف تین مثالیں ہیں۔ رہا کیسا تو یہ حقیقت ان مقالوں سے واضح ہو جائے گی جو اس نمبر کی زینت ہیں اور بہت دیدہ ریزی اور کاوش سے لکھے گئے ہیں۔ ان مقالوں میں قاضی عبدالودود بحیثیت محقق کا نقش، روشن اور پائندہ نقش ابھرتا ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ معاصر کا یہ نمبر ایک جامع تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں قاضی عبدالودود صاحب کے خاندانی حالات، ان کی جیتی جاگتی شخصیت، ان کی وسعت مطالعہ، ان کا طرز تحقیق، ان کی تحقیقی کاوشیں، ان کا سائنٹفک اسلوب، ان کے سیاسی اور مذہبی عقائد یہ ساری چیزیں پہلی بار صاف صاف نظر آتی ہیں اور آئندہ آنے والوں کے لئے اس کی حیثیت سنگ میل کی ہوگی۔

مجھے خوشی ہے کہ زیادہ سے زیادہ بزرگوں، مشفقوں اور عزیزوں نے میری دعوت کو رد نہیں کیا اور میری کوششوں کو کامیاب بنانے میں ہر ممکن تعاون کیا۔ میں خاص طور سے عالی جناب فخرالدین علی احمد صاحب صدر جمہوریہ ہند کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اپنی بے انتہا مصروفیتوں کے باوجود میری درخواست پر اپنے قیمتی وقت کا کچھ حصہ نکال

کہ ایک مختصر لیکن جامع اور زریں مضمون اس نمبر کے لئے عنایت فرمایا جس سے اس کی قیمت دوچند ہوگئی ہے۔

مرتّب



عزت مآب فخرالدین علی احمد

صدر جمہوریہ ہند

افتتاحیہ

مجھے یہ جان کر دلی مسرت ہوئی کہ دائرہ ادب (پٹنہ) اردو کے ممتاز اسکالر اور محقق قاضی عبدالودود صاحب (بار ایٹ لا) کے بارے میں "معاصر" کا ایک خصوصی نمبر شائع کر رہا ہے۔

قاضی عبدالودود صاحب سے میرے تعلقات کو نصف صدی ہوگئی ہے۔ ان سے میرا تعارف ۲۹-۱۹۲۵ء میں ہوا تھا، جب وہ اور میں کیمبرج میں زیر تعلیم تھے۔ میں سینٹ کیتھرن میں تھا اور قاضی صاحب فیٹز ولیم ہاؤس میں تھے۔ میں نے انر ٹیمپل سے اور قاضی صاحب نے مڈل ٹیمپل سے بیرسٹری کی۔ انگلینڈ میں اس وقت ہمارے حلقے میں قاضی عبدالودود، نورالدین احمد، پدم بھنڈاری، واجد محمود اور حفاظت حسین صاحب وغیرہ تھے۔ چھٹیوں کے دنوں میں، میں، قاضی صاحب اور نورالدین اکثر ساتھ ہی باہر جاتے تھے۔ ویسے بھی زیادہ وقت ہمارا ساتھ ہی گزرتا تھا۔ قاضی صاحب کو اچھے کھانوں کا بیحد شوق تھا ان کے ذریعہ پسندیدہ ہوٹلوں اور رستورانوں میں جانے کا موقع ملتا تھا۔ تعلیم کے زمانے میں قاضی صاحب کو پلوریسی ہوگئی تھی۔ علاج اور آرام کے لئے وہ سوئیزرلینڈ گئے۔ اُس زمانے میں ہندوستان کے محبوب لیڈر اور قومی تحریک کے رہنما پنڈت جواہر لال نہرو اپنی اہلیہ شریمتی کملا نہرو کے علاج کے سلسلے میں وہاں تھے۔ قاضی صاحب کی ملاقات

پنڈت جی سے وہاں ہوئی اور بعد میں جب پنڈت جی کیمبرج آئے تو قاضی صاحب نے میرا تعارف ان سے کرایا۔

یہ زمانہ ہندوستان کی تاریخ کا بہت اہم زمانہ تھا۔ انگلینڈ میں رہ کر تعلیم حاصل کرنے والے ہندوستانی طلبہ کو بھی فارغ التحصیل ہونے کے بعد واپس آکر ملک اور قوم کی خدمت کرنے کی پوری لگن تھی۔ کیمبرج میں ایک انڈین مجلس ایسوسیئیشن قائم تھی۔ اس کا جلسہ ہر اتوار کو ہوتا تھا جس میں ہندوستان کے سیاسی اور معاشی حالات پر بحث و مباحثہ اور غور و خوض ہوتا تھا۔ اکثر موقعوں پر اس مجلس کو ہندوستان کی ممتاز شخصیتیں جیسے اینی بسنت، شری نواس شاستری، پنڈت جواہر لال نہرو اور محمد علی جناح وغیرہ خطاب کرکے اپنے خیالات کا اظہار کرتے تھے۔

۱۹۲۸ء میں میں تعلیم ختم کرکے آسام آگیا اور بعد میں قاضی صاحب بھی اپنی تعلیم پوری کرکے پٹنہ آگئے۔ ۱۹۳۲-۳۳ء میں جب میں کلکتہ آیا تو قاضی صاحب سے اکثر ملاقاتیں ہونے لگیں۔ وہ جب کلکتہ آتے تو ہمارے ساتھ ہی ٹھہرتے۔

ہندوستان آنے کے بعد سب ساتھیوں کے مشاغل مختلف ہو گئے لیکن سب نے اپنے اپنے میدانِ عمل میں اپنی صلاحیتوں کا استعمال کرتے ہوئے ملک و قوم کی خدمات انجام دیں۔ قاضی عبدالودود صاحب نے عملی سیاست سے ہٹ کر علم و ادب اور تحقیق و تنقید کی دشوار گذار وادیوں میں قدم رکھا اور اس میں منہمک ہو گئے۔

میں نے ان گذشتہ پچاس برسوں میں قاضی صاحب کے کردار کی استواری اور اخلاق وضعداری کا برابر مشاہدہ کیا ہے۔ وہ بذلہ سنج اور نکتہ رس انسان ہونے کے ساتھ ساتھ راست گو، بیباک، حق پسند اور منطقی طرزِ فکر کے حامل ہیں۔ انھیں دورانِ تعلیم سے ہی موضوع کوئی پیچیدہ الجھن ہوتی تھی اور اگر کسی کی غلط بیانی کا ان کو علم ہوتا تو وہ اس کی مذمت اور نکتہ چینی کرتے۔ یہ ان کا شروع سے ہی مزاج رہا ہے۔ وہ پٹنہ کے ذی ثروت اور باحیثیت

گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں جو مذہبی خیالات میں بھی راسخ رہا ہے۔ قاضی صاحب خود بھی حافظِ قرآن ہیں لیکن اجتماعی اور مذہبی معاملات میں ان کا اندازِ فکر ابتدا ہی سے آزادانہ رہا۔ انھوں نے ایسے مسائل میں مفتیٔ عقل کے فتویٰ کو ہمیشہ ترجیح دی ہے اور ان کی یہ دلائل پسندی اور آزادخیالی ان کی شخصیت اور اندازِ فکر ہی پر نہیں بلکہ ان کی تحریروں پر بھی حاوی رہی ہے۔

اس دلائل پسندی اور آزادخیالی کا ایک پہلو یہ ہے کہ انھوں نے مذہبی، سیاسی، سماجی، علمی یا تاریخی مسائل و معاملات میں بھی اپنے اندازِ فکر کو کبھی رواجِ عام کا تابع نہیں بنایا اور اپنے منفرد زاویۂ نگاہ سے ہر مسئلے کا مطالعہ کر کے اس کے بارے میں اپنی رائے قائم کرنے کی کوشش کی۔ قاضی صاحب کی خودداری اور وضعداری عموماً ہندوستانی معاشرے کی عکاسی کرتی رہیں۔

قاضی صاحب زمانۂ طالب علمی ہی سے مطالعہ کے شوقین رہے۔ انھوں نے انگلستان کے قیام کے دوران انگریزی ادب کی بہت سی اہم کتابوں کے علاوہ فرنچ زبان سے بھی واقفیت حاصل کی اور اس کے ادبی جواہر پاروں کا مطالعہ کیا۔ اس کے علاوہ برٹش میوزیم اور انڈیا آفس لندن کی لائبریری کے ذخیرۂ مخطوطات سے انھوں نے بھرپور استفادہ کیا۔ اگر قوتِ حافظہ کمزور ہو تو صرف کثرتِ مطالعہ بھی کافی نہیں ہوتی۔ قدرت نے قاضی صاحب کو یادداشت کی غیر معمولی قوت بھی عطا کی ہے جو کم خوش نصیبوں کو ملتی ہے۔ انھوں نے جن کتابوں کا مطالعہ کیا تھا۔ ان میں سے بعض کتابوں کے مشمولات ان کی یادداشت میں آج تک محفوظ ہیں۔

قاضی عبدالودود صاحب کا شمار بالعموم پہلے درجہ کے محقق عالموں اور محققوں میں ہوتا ہے لیکن ان کی علمیت کا دائرہ اردو ہی تک محدود نہیں ہے۔ انھوں نے فارسی زبان و ادب کی بھی اتنی ہی خدمت کی ہے۔ ان کے مطالعے کا میدان لسانیات، لغات، قواعد، ادب،

نثر، شعر، تذکرہ، تاریخ، سوانح سب کچھ رہا ہے۔ ان موضوعات پر انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ اپنی اہمیت، افادیت اور قدر و قیمت میں بے مثال ہے اور شام و سحر کی گردشیں اسے کہنہ و فرسودہ نہیں کر سکتیں۔

قاضی صاحب کی حیثیت اب ایک فرد کی نہیں۔ وہ ایک انجمن، ایک تحریک اور ایک ادارہ ہیں۔ انھوں نے اپنے بعد آنیوالی نسلوں کو متاثر کیا ہے اور اردو زبان میں سنجیدہ تحقیق اور عالمانہ تنقید کی ایک ایسی روایت قائم کر دی ہے جس سے اردو زبان کے علمی ذخیرہ میں نہایت قیمتی اضافے ہوئے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔ اس اعتبار سے قاضی صاحب کی علمی خدمات کو اردو دنیا میں ہمیشہ احسان مندی کے جذبات کے ساتھ یاد رکھا جائے گا۔ قاضی صاحب بہت سے ادبی اداروں سے وابستہ ہیں۔

"اشتر و سوزن" اور "عیارستان" میں قاضی صاحب کے مفصل اور تحقیقی تبصرے شامل ہیں۔ تذکرۂ شعر مصنفہ امین اللہ طوفان، شعرائے اردو کا ایک مختصر تذکرہ ہے مگر قاضی صاحب کے عالمانہ حواشی نے اس کی قدر و قیمت کو درخشاں کر دیا۔ ادارۂ تحقیقات اردو پٹنہ کی جانب سے قاطع برہان کی اشاعت قاضی صاحب کا غالبیات پر ایک بڑا کارنامہ ہے۔ غرض قاضی صاحب نے جو کچھ لکھا، اس کا مطالعہ انکی شخصیت کے تمام جوہر ہماری بصیرت کے آگے روشن کر دیتا ہے۔

قاضی صاحب کو یوں تو غالبیات پر سند ہونے کا شرف حاصل ہے۔ اس کے علاوہ ۱۹۶۹ء میں ہونے والی غالب صدی تقریبات کو قاضی صاحب کا بڑا تعاون ملا اور ان کے گرانقدر مشوروں سے ان تقریبات کو خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوئی۔ بین الاقوامی سیمینار میں انھوں نے جو خطبۂ افتتاحیہ پڑھا تھا وہ اس مجموعۂ مقالات میں شامل ہے جسے ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب نے مرتب کر کے غالب انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے چھپایا ہے۔ یہ غالبیات

کے موضوع پر قاضی صاحب کے وسیع ترین معلومات کا ایک بے مثال نمونہ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اگر ہمیں قاضی صاحب کے گرانقدر اور مخلصانہ مشورے حاصل نہ ہوتے تو غالب انسٹی ٹیوٹ کو اتنے شاندار پیمانے پر قائم کرنے میں خاصی دشواریوں کا سامنا ہوتا۔

ذاتی دوستانہ و برادرانہ روابط کے علاوہ ان اسباب سے بھی میں سمجھتا ہوں کہ قاضی صاحب کی شخصیت اور بحیثیت اسکالر ان کا بلند مرتبہ ہر طرح اس کا متقاضی تھا کہ ان کی خدمات کا شائستہ اعتراف کیا جائے۔ یہ کام "معاصر" جیسے علمی جریدے نے اردو کے ممتاز ناقد کلیم الدین احمد صاحب کی ادارت میں انجام دے کر ساری اردو دنیا کی طرف سے ایک بڑا فرض ادا کیا ہے۔ میں سعئ مبارک کی کامیابی کی تمنا کرتا ہوں۔

نئی دہلی
۲۴ رجون ۱۹۷۶ء

فخر الدین علی احمد



قاضی عبدالودود

عکسی تحریر

دہر جز جلوۂ یکتائیِ معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں
لافِ دانش غلط و نفعِ عبادت معلوم
دُردِ یک ساغرِ غفلت ہے چہ دنیا و چہ دیں

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لیے کچھ کم نہ تھے کروبیاں

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہِ شیشہ گری کا

کہا میں نے گل کا ہے کتنا ثبات
کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

تو گرفتاری کے باعث مضطرب صیاد ہو
لگتے لگتے جی قفس میں بھی مرا لگ جائیگا

سودا جو ترا حال ہے اتنا تو نہیں وہ
کیا جانیے تو نے اسے کس آن میں دیکھا

قاضی عبدالودود
۲۹ جولائی ۱۹۷۶ء

قاضی عبدالودود

"میں کون ہوں، میں کیا ہوں"[1]

یہ مضمون معاصر کی فرمایش پر لکھا جا رہا ہے، اور کوشش کی گئی ہے کہ کل سوالات کے، جو کیے گئے ہیں، جواب دیے جائیں۔ اگر کوئی بات کہیں اور مختلف طور پہ ہے تو اس سے قطع نظر کر کے صریحاً اس کی تردید ہوئی ہے یا نہیں، اس جگہ جو لکھا جا رہا ہے۔ صحیح سمجھا جائے۔ (۱) قاضی عبدالودود، بن قاضی عبدالوحید، بن قاضی عبدالحمید، بن قاضی اکرم الحق، بن قاضی امین الحق، بن قاضی کمال الحق، بن قاضی غلام یحیٰ، بن غلام شرف الدین از اخلاف ملا عبدالشکور تاج فقیہی۔

قاضی عبدالوحید متولد ۱۲۸۹ھ عربی کی تکمیل اور انٹرنس کا امتحان پاس کرنے کے بعد کالج میں داخل ہوئے۔ ایف۔ اے کے بعد میرے دادا انھیں قاضی رضا حسین[2] کے مشورے پر انگلستان تعلیم کے لیے بھیجنا چاہتے تھے لیکن وہ کسی طرح اس پر راضی نہیں ہوئے۔ یہی نہیں۔ انھوں نے یہاں رہ کر بھی مزید انگریزی تعلیم حاصل کرنے سے انکار کر دیا۔ وجہ یہ کہ ان کے خیالات میں انقلاب آ گیا تھا اور وہ مغربی تعلیم کو مذہب کے لیے

---

[1] عنوان کا اضافہ ہم نے کیا ہے ۔ ک ۔ ا۔

[2] قاضی رضا حسین کے والد کی دوسری شادی قاضی اسد علی (جدِ مادری قاضی عبدالحمید) کی بیٹی سے ہوئی تھی مگر یہ لاولد رہیں۔ قاضی رضا حسین کے تعلقات سرسید احمد خاں سے تھے اور انھوں نے بڑی کوشش کی تھی کہ مسلمانان بہار مغربی تعلیم حاصل کریں۔

سم قاتل سمجھنے لگے تھے۔ "نیچریوں" (پیروان سرسید احمد خاں) کے متعلق جو ان کی رائے ہوگی، اس کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ وہ ندوۃ العلما تک کے سخت مخالف تھے۔ ان کے نزدیک ۷۲ یا اس سے بھی زیادہ فرقے جو مسلمان ہونے کے مدعی ہیں، ان میں صرف ایک ناجی ہے اور یہ وہ فرقہ ہے جو بریلی کے مشہور عالم، احمد رضا خاں کا معتقد ہے۔ پٹنہ میں ندوۃ العلما کا ایک سالانہ اجلاس ہوا تو انہوں نے بھی بڑے پیمانے پر ایک جلسہ کیا جس میں بریلوی صاحب اور دوسرے علما جو ان کے ہم خیال تھے، شریک ہوئے تھے۔ کلکتہ میں ندوۃ العلما کا سالانہ اجلاس ہونے لگا تو وہ کلکتہ والوں کو اس کی مخالفت پر آمادہ کرنے کے لیے کلکتہ گئے، وہاں وہ ابوالکلام آزاد کے والد سے بھی ملے تھے۔ عبدالرزاق ملیح آبادی نے ابوالکلام آزاد سے متعلق جو کتاب لکھی ہے اور جس کے بارے میں ان کا دعویٰ ہے کہ خود ابوالکلام آزاد کی لکھوائی ہوئی ہے۔ مرقوم ہے کہ قاضی عبدالوحید اپنے کو عقائد میں بہت متشدد سمجھتے تھے۔ مگر ابوالکلام آزاد کے والد سے ملے تو انہوں نے انہیں اپنے سے بھی زیادہ متشدد پایا۔ قاضی عبدالوحید خود بہت متشرع تھے۔ لیکن اس معاملے میں سخت گیر نہ تھے۔ برادری میں ایسے لوگ تھے جو علانیہ فسق و فجور میں مبتلا تھے لیکن ان سے قطع تعلق نہیں ہوا۔ ان برادری والوں سے جو غیر مقلد تھے، برادری ترک کردی تھی۔ انہوں نے احمد رضا خانی عقائد کی تبلیغ کے لیے ایک ماہنامہ "تحفۂ حنفیہ" نکالا تھا جو ان کی وفات کے بعد بھی برس دو برس تک جاری رہا۔ انہوں نے ایک مدرسہ بھی قائم کیا تھا جس پر ان کی آمدنی کا ایک بڑا حصہ صرف ہوا کرتا تھا۔ یہ ان کی موت کے کچھ

---

(۱) ان کی ایک تصنیف مجھے اپنے والد کی کتابوں میں ملی تھی۔ اس میں انہوں نے لکھا ہے کہ شیطان سے ابوجہل بدتر ہے اور ابوجہل سے وہابی بدتر ہیں۔

ہی بعد بند ہو گیا۔ قاضی عبدالوحید نے اپنے ابتدائی زمانے میں شعر بھی کہے۔ انہوں نے وحید الہ آبادی کی صحبت پائی تھی اور ان کا تخلص وحید تھا۔ میں نے لڑکپن میں ان کی طرحی غزلیں غازی پور کے ایک گلدستے میں دیکھی تھیں مگر اب اس کا کوئی شمارہ میرے پاس نہیں شاہ مقبول احمد صاحب (کلکتہ) نے مجھے اطلاع دی ہے کہ کراچی سے جو کتاب بنام "مسلم شعرائے بہار" شائع ہوئی ہے اس میں ان کا حال اور کلام ہے۔ ڈاکٹر حامد علیخاں (علیگڑھ) نے مجھ سے ان کے حالات مانگے تھے اور لکھا تھا کہ ان کے عربی اشعار میری نظر سے گزرے ہیں۔ ہندوستان کے عربی گو شعراء سے متعلق ان کا مقالہ مکمل ہو گیا ہے مگر مجھے علم نہیں کہ ان کا ذکر اور کلام اس میں ہے یا نہیں۔ ان کے عربی اشعار میں نے نہیں دیکھے۔ یہ کہا جا چکا ہے کہ وہ بہت متشرع تھے۔ میرے دادا نے کئی آدمیوں کو سودی قرض دے رکھا تھا۔ ان کی موت کے بعد انہوں نے سود کے ہزاروں روپے معاف کر دیئے۔ وہ سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ اور ان کے بہت روپے دوسروں پر صرف ہوا کرتے تھے۔ وہ بہت راست گفتار تھے اور معاملات کے کھرے۔ کوئی شخص اگر ان کے ساتھ بدمعاملگی کرتا تو وہ اس سے، خواہ وہ قریبی عزیز ہی کیوں نہ ہو، بہت خفا ہوتے تھے، اور اس کا اظہار بھی کر دیا کرتے تھے خدا پر انہیں بہت بھروسا تھا میرے حقیقی ماموں طاعون میں مبتلا ہو گئے۔ مجھے ان کے پاس جانے سے بالکل نہ روکا۔ وہ تو ماموں تھے، میرے معلم کا ایک بھانجا اسی مرض کا شکار ہو گیا۔ اس کے پاس جانے کی بھی مخالفت نہ تھی۔ دونوں اسی مرض میں مر گئے۔

قاضی عبدالوحید کی شادی سید شاہ لطف الرحمن متوطن کاکو (قریب جہان آباد) کی بیٹی سے ہوئی۔ میرے نانا میرے دادا کے حقیقی خالہ زاد بھائی تھے۔ قاضی عبدالوحید کی وفات ربیع الاول ۱۳۲۶ھ میں ہوئی۔ ان کے مرض الموت میں بریلوی صاحب ہمارے یہاں آئے تھے۔ اور ان کے چہارم کے بعد بریلی واپس گئے تھے۔ باقر عظیم آبادی (یہ وہی باقر ہیں جن

کا ذکر داغ کی فریاد داغ میں ہے) نے ایک طویل نظم ان کی وفات پر لکھی تھی اور لفظ "مغفور" سے سال وفات نکالا تھا۔ یہ نظم تحفۂ حنفیہ میں شائع ہوئی تھی۔

قاضی عبدالحمید بخشی محلہ میں رہتے تھے۔ ان کے خالو شیخ احمد اللہ کا انتقال ہوا تو ان کی ساری جائداد ان کی زوجہ کے قبضے میں آئی۔ انہوں نے اس کے انتظام کے لئے اپنے بھانجے کو لودی کٹرا بلا لیا اور وہ اسی محلے میں رہنے لگے۔ وہ ایک دنیادار آدمی تھے۔ اور ان کے مشاغل علمی نہ تھے۔ مگر شاعری سے انہیں کچھ لگاؤ ضرور تھا۔ ایک شخص، بندہ علی نشتر ان کے یہاں نوکر تھے۔ اور میں نے سنا ہے کہ ان کے استاد، انوار عالم متخلص بہ شاہ شاگرد دبیر نے اپنی زندگی کے آخری چند سال ان کے ساتھ گزارے تھے۔ ایک خط جو شاہ نے قاضی عبدالحمید کے نام لکھا تھا۔ وہ اس زمانے میں شاید نثر کا اچھا نمونہ سمجھ کر چھپوا دیا گیا تھا۔ میں نے یہ نہیں سنا کہ خود قاضی عبدالحمید نے شعر کہا ہو۔ ان کی شادی سید امجد علی ساکن جرجوا (قریب حاجی پور) کی بیٹی سے ہوئی تھی۔

قاضی محمد اسمٰعیل کا نام دہلی کے مشہور عالم کے نام پر سید احمد بریلوی کے کہنے سے رکھا گیا تھا۔ وہ ان کی ولادت کے زمانے میں پٹنہ آئے ہوئے تھے۔ یہ صوفی مشرب تھے اور بریلوی صاحب کو ان کے عقائد کی اطلاع ہوتی تو بلاشبہ انہیں بدعتی قرار دیتے۔ ان کا تخلص قدیمی تھا۔ اور ان کی نظم و نثر میرے پاس موجود ہے۔ انھوں نے ایک فسانے میں رموز تصوف بیان کئے ہیں۔

قاضی اکرام الحق سید احمد بریلوی کے مرید یا معتقد تھے۔ ان کی وفات ہنگامۂ ۵۷ء سے قبل ہی ہو چکی تھی۔ لیکن اس وقت ان کے برادر خورد، واعظ الحق زندہ تھے۔ اور وہ ان ۳ علما میں تھے جو نظر بند کئے گئے تھے۔ اس کا ذکر اس ہنگامے کی تاریخ میں ہے۔

قاضی امین الحق کی شادی قاضی امام بخش بن قاضی حسن رضا بن عابد خاں ملقب

بہ نقاہت خاں (مہر سہ قاضی شہر پٹنہ) کی بیٹی سے ہوئی تھی۔

قاضی کمال الحق کی شادی قاضی سید عوض (از سادات بارہہ) کی بیٹی سے ہوئی تھی۔ یہ فارسی گو تھے اور ان کا تخلص کمالی تھا۔ ان کا کلیات انکی زندگی ہی میں ضائع ہوگیا تھا۔ مختصر دیوان میرے پاس موجود ہے۔

قاضی غلام یحییٰ المحشی شرح آداب المریدین تھے۔ ان کی اور کتابیں بھی ہیں۔ ان کے زمانے میں ایک غلام یحییٰ تھے جو قاضی القضات تھے۔ مقدم الذکر ان سے مختلف ہیں۔ تاج فقیہہ کا نسب نامہ الدرر المنثور فی تراجم اہل صادقفور (معروف بہ تذکرۂ صادقہ) میں ملے گا۔

(۲) میری عمر کے اکاسی سال گزر چکے ہیں اور سال ہشتاد و دوم گزر رہا ہے۔ یہ تخمین پر مبنی ہے۔ اگر میں نے کبھی اس کے خلاف لکھا ہے تو وہ بھی تخمین پر مبنی تھا۔ مجھے یقین ہے کہ صحیح وہ ہے جو اس جگہ میں نے لکھا ہے۔

میری پرورش زنان خانے میں نہیں ہوئی۔ میری قدیم ترین یادیں اپنے دادا سے وابستہ ہیں۔ ان کے بعد والدین آتے ہیں۔ ایک بات جو مجھے یاد ہے، اس سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ میرے والد مجھ سے بہت محبت کرتے تھے۔ مگر یہ واضح رہے کہ وہ ایک بار کے سوا، کبھی انھوں نے اس کا اظہار نہیں کیا۔ متوسطات فارسی پڑھنے کے بعد میں نے عربی پڑھنا اور قرآن حفظ کرنا شروع کیا۔ میرے قدیم ترین معلموں میں سے ایک سید سلیمان اشرف تھے جو بعد کو علی گڈھ کالج میں استاد دینیات ہوئے۔ والد کی وفات کے بعد بریلوی صاحب کی طرف سے تحریک ہوئی کہ میں تعلیم کے لیے بریلی جاؤں مگر میں نے انکار کر دیا۔ پھلی بھیت کے ایک عالم وصی احمد جو محدث سورتی کہے جاتے تھے اور والد کے قائم کردہ مدرسے میں مدرس اول رہ چکے تھے۔ اسی غرض سے مجھے لینے کے لیے پٹنہ آئے۔ مگر میں پیلی بھیت جانے پر راضی نہ ہوا۔ عربی صرف و نحو میں نے پٹنہ ہی میں مکمل کرلی۔ نحو کی آخری کتاب جو میں

نے پڑھی۔ شرح کافیہ جو جامی نے لکھی ہے۔ منطق میں شرح تہذیب کے اتمام کے
بعد میں نے قطبی پڑھنی شروع کی تھی مگر وہ ناتمام رہ گئی۔ یہی حال شرح وقایہ اور مختصر المعانی
کا ہوا۔ قرآن میں نے پورا حفظ کرلیا۔ یہ ٹھیک یاد نہیں کہ اس وقت میری کیا عمر تھی۔ میری
والدہ نے تعلیم کے معاملے میں مجھ پر بالکل جبر نہیں کیا۔ اور مجھے اپنی راہ پر چھوڑ دیا۔ میں نے
گھر پر انگریزی ات شروع کی اور کچھ دنوں کے بعد شہر کے محمڈن اسکول کے درجہ پنجم میں داخل
ہوگیا۔ درجہ سوم میں داخل ہونے والا ہی تھا کہ میں نے ایک صاحب کی ترغیب سے
علی گڑھ جانے کا فیصلہ کیا۔ وہاں تیسرے درجے میں میرا داخلہ تو ہوگیا مگر مہینوں
کے بعد ماریسن کورٹ میں جگہ ملی۔ اس درمیان میں کچھ دن سرسید کورٹ کے بعض طلبہ
کے ساتھ رہا۔ اور اس طرح مجھے کالج کی زندگی کے دیکھنے کا موقع ملا۔ کچھ دن میں سید سلیمان
اشرف کے ساتھ رہا۔ بالآخر مجھے ماریسن کورٹ میں جگہ مل گئی اور وہاں سے میکڈونل ہاؤس
گیا۔ میں نے تیسرے درجے کا امتحان پاس کیا تھا کہ یہ فیصلہ ہوگیا کہ میں تعلیم کے لیے انگلستان
جاؤں گا اور میں بلگرامی ٹیوٹوریل کالج میں داخل ہوگیا۔ یہ درسگاہ میجر سید حسن بلگرامی نے علیگڑھ
میں ان طلبہ کے لیے قائم کی تھی جو تعلیم کے لیے یورپ جانا چاہتے تھے۔ یہاں انگریزی، لاطینی
جرمن اور فرانسیسی زبانیں سکھائی جاتی تھیں اور ریاضی، تاریخ وغیرہ بھی پڑھائی جاتی تھی۔
میں نے لاطینی پڑھی۔ صرف و نحو کی ایک کتاب، ایک رسالہ Gradatim اور ورجل
کی اینیڈ کا ایک حصہ سبقاً سبقاً پڑھا۔ میں بلگرامی کالج میں ڈیڑھ سال رہا ہوں گا کہ میجر بلگرامی
کا یکایک انتقال ہوگیا اور ان کا کالج بند ہوگیا تھا۔ یورپی جنگ چھڑ چکی تھی۔ اس وقت یورپ
جانے کا سوال ہی نہ تھا۔ میں نے پٹنہ آکر ۱۹۱۶ء میں نجی کے طور پر میٹرکیولیشن کا امتحان دیا اور
کامیابی کے بعد پٹنہ کالج میں داخل ہوا۔ میں نے میٹرکیولیشن کی طرح آئی اے میں بھی فرسٹ
ڈویژن حاصل کیا اور بی اے امتیاز کے ساتھ پاس کیا۔ آئی اے میں بہ حیثیت مضامین انگریزی

اردو، فارسی، منطق اور تاریخ تھے۔ بی۔اے میں بھی یہی مضامین تھے باستثنائے منطق۔ اس کے بعد ہی تحریک ترک موالات میں شریک ہوگیا اور تعلیم کا سلسلہ بند ہوگیا۔ پانچ سنہ ۱۹۲۳ء میں تکمیل تعلیم کے لیے انگلستان گیا اور بیرسٹری کے مڈل ٹیمپل میں داخل ہوا۔ اس وقت کیمبرج میں داخلے کا سوال ہی نہ تھا مگر میں یاد میں۔ اور چند دوستوں کے ساتھ لمبی تعطیل میں جرمنی گیا۔ وہاں کئی مہینے رہا اور میں نے جرمن سیکھی۔ اکتوبر میں کیمبرج آیا۔ اور وہاں میرا داخلہ فٹزولیم ہاؤس میں ہوگیا۔ میں نے اکنومکس ٹرائی پوس لیا تھا۔ تعطیلات میں میں فرانس چلا جایا کرتا تھا۔ اور وہاں میں نے فرانسیسی سیکھی۔ کیمبرج میں ٹرائی پوس کا دوسرا حصہ لینے نہ پایا تھا کہ سخت بیمار ہوگیا۔ چند ماہ کیمبرج کے قریب ہی ایک سینیٹوریم میں رہا۔ بعد ازاں جاڑوں کے اوائل میں کئی مہینے موتانا (سوئٹزرلینڈ) گیا اور وہاں رہا۔ واپسی کے بعد میں امتحان میں شریک ہوا اور مجھے سکنڈ ڈویژن ملا۔ حصہ ۲ میں میں نے علم السیاست بھی لیا تھا اور بطور خود کچھ فلسفے اور نفسیات کی کتابیں بھی پڑھیں۔ اس کے بعد میرا قیام زیادہ تر لندن میں رہا۔ اور میں نے بیرسٹری کے امتحانات پاس کیے۔ مارچ سنہ ۱۹۲۹ء میں میں پٹنہ آیا۔ میری صحت مضبوط نہ رہی۔ میں پریکٹس نہ کرسکا اور مجھے بار بار سینیٹوریم جانا پڑا۔ بھوالی میں میں نے ہندی رسم الخط سیکھا۔ بعد کو جب غالب سے متعلق تحقیقات مدنظر ہوئی تو میں نے فارسی ادب کا مطالعہ کیا، اور کسی قدر پہلوی بھی سیکھی۔

اب میرا حال یہ ہے کہ قرآن بہت تھوڑا سا یاد ہے۔ عربی بہت کچھ بھول گیا لاطینی اب اتنی کم جانتا ہوں کہ نہ جاننے کے برابر ہے۔ کچھ الفاظ اور چند جملے جو یاد ہیں، ان کا بہت بڑا حصہ انگریزی اور فرانسیسی کتابوں میں دیکھا تھا۔ جرمن بہت کچھ بھول گیا۔ مگر لاطینی کی طرح نہیں۔ ہندی اب میں بالکل نہیں پڑھ سکتا۔ پہلوی کا رسم الخط بھی بھول گیا۔ معاشیات اب میں اس قدر کم جانتا ہوں کہ پیچیدہ بحث ہو تو سمجھ ہی نہیں سکتا۔

اس سے زیادہ تو مجھے فلسفہ و نفسیات سے واقفیت ہے۔

(۳) میرے والد کے زمانے میں ہفتہ وار آگرہ اخبار آیا کرتا تھا۔ لیکن مجھے یاد نہیں کہ کوئی اور اخبار اردو یا انگریزی آتا تھا یا نہیں۔ انہیں جہاں تک میں اندازہ کر سکا ہوں، سیاست سے دلچسپی نہ تھی۔ اور میں نے اپنے یہاں کبھی سیاسی گفتگو نہیں سنی۔ ان کی وفات کے چند سال بعد میں نے حسرت موہانی کے ماہنامے۔ اردوئے معلّٰی کی کئی پرانی جلدیں منگوائیں۔ غرض تو یہ تھی کہ اس کے ادبی مضامین پڑھے جائیں لیکن ان کے ساتھ، ان میں جو سیاسی مضامین تھے وہ بھی نظر سے گزرے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میں پکا کانگریسی بن گیا۔ اور ان مسلمانوں کو جو کانگریس کی مخالفت کرتے تھے، برا سمجھنے لگا۔ اس زمانے میں میں حسرت کے علاوہ مظہر الحق، محمد علی اور ابوالکلام آزاد کے مداحوں میں تھا۔ الہلال کے نئے شمارے کا جس بے چینی سے انتظار کیا کرتا تھا۔ وہ اب تک یاد ہے۔ میں کالج میں تھا کہ انڈین نیشنل کانگریس کے اجلاس دہلی میں جس کے صدر پنڈت مدن موہن مالوی تھے، ایک تماشائی کی حیثیت سے شریک ہوا۔ استقبالی کمیٹی کے صدر حکیم اجمل خاں نے اپنے خطبے میں مونٹیگو چیمسفورڈ اسکیم پر فارسی کے یہ اشعار چسپاں کئے تھے۔

ایں اُسترِ لنگ زن بابا ازاں من	ویں گُرگ بہ مصاحب بابا ازاں تو
از صحن خانہ تا لب بام ازاں من	وز سقف خانہ تا بہ ثریا ازاں تو

میرے گریجویٹ ہو جانے کے بعد انڈین نیشنل کانگریس نے اپنے ایک خاص اجلاس میں جو کلکتہ میں ہوا تھا اور جس کے صدر لاجپت رائے تھے، ترک موالات سے متعلق تجویز منظور

ملہ اشعار غالباً ایرانی شاعر میلی کے ہیں۔ شاعر نے دکھایا ہے کہ ایک بھائی متروکات پدری میں سے خود کیا لینا چاہتا ہے اور دوسرے کے لئے کیا چھوڑتا ہے۔ خود جو لینا چاہتا ہے اس کا ذکر اس طرح کرتا ہے کہ یہ گویا کچھ نہیں۔ دوسرے کے لئے جو چھوڑتا ہے اس کا معاملہ برعکس ہے۔

کی۔ اس کے بعد پراونشیل کانگریس کمیٹی کے عہدہ داروں اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ممبروں کا انتخاب درپیش تھا۔ اس وقت جو لوگ اس کمیٹی پر قابض تھے، ترکِ موالات کے مخالف تھے۔ اس زمانے میں اس کے صدر ڈاکٹر سچدانند سنہا اور سکریٹری چندر بنسی سہائے بیرسٹر تھے۔ چند مسلم نوجوان جو کانگریس میں نئے نئے شریک ہوئے تھے۔ یہ چاہتے تھے کہ کمیٹی مخالفین ترکِ موالات کے قبضے میں نہ رہے اور آل انڈیا کانگریس میں بہار کی طرف سے وہ لوگ جائیں جو اس تحریک کے موافق ہیں۔ اس وقت کوئی شخص جو ایک خاص عمر سے کم کا نہ ہو۔ دس روپے ادا کر کے پراونشیل کانگریس کمیٹی کا رکن ہو سکتا تھا۔ بہت سے مسلمان اس کے ممبر ہو گئے۔ اور جب انتخاب ہوا تو ایک شخص بھی جو تحریک کا مخالف تھا۔ نہ عہدہ دار رہا نہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا ممبر ہوا۔ میں خود پراونشیل کانگریس کمیٹی کی مجلس عاملہ اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا رکن منتخب ہوا۔ اس زمانے میں ابوالکلام آزاد رانچی میں رہتے تھے۔ وہ اس زمانے میں آل انڈیا کانگریس کے رکن نہ تھے۔ وہ پہلی بار ہم لوگوں کی وجہ سے اس کے رکن ہوئے۔ ان لوگوں کے روزانہ انگریزی اخبار بہار نے ایک مقالہ افتتاحیہ میں بڑی برہمی کا اظہار کیا لیکن اس سے ہوتا کیا تھا۔ اصل یہ ہے کہ مخالفین تحریک کو جو پراونشیل کانگریس کمیٹی پر قابض تھے، یہ وہم بھی نہ تھا کہ ہم لوگ انہیں اس طرح نکال پھینکیں گے ورنہ ان کا مقابلہ ہم لوگوں کے لیے اتنا آسان نہ ہوتا۔ آل انڈیا نیشنل کانگریس کا سالانہ اجلاس ناگپور میں ہونے والا تھا اور گرما گرم خبر تھی کہ سی۔ آر۔ داس تحریک کی مخالفت کی بڑی زبردست تیاریاں کر رہے ہیں۔ میں ناگپور گیا۔ وہاں یہ دیکھا کہ ہم خیال لوگوں کو بڑا اندیشہ ہے کہ تحریک کی مخالفت کی تجویز منظور نہ ہو جائے لیکن نہ جانے گاندھی جی نے کیا جادو کیا کہ سی۔ آر۔ داس ان کے ہم عقیدہ ہو گئے اور کلکتہ میں جو تجویز منظور ہوئی تھی۔ اس پر اس اجلاس نے صاد کیا۔ مخالفین میں جناح بھی تھے۔ مگر بڑی اکثریت تجویز کے حق میں تھی۔ میں کا ذکر یہ تھا علحدہ اس لیے ہوا کہ بتدریج مجھ پر یہ

بات واضح ہوگئی کہ ہندوؤں میں ایک بڑی جماعت ایسی ہے جو یہ فراموش نہ کرسکی ہے کہ مسلمانوں نے ان پر صدیوں حکومت کی ہے اور ان پر مظالم ہوئے ہیں۔ میں یورپ سے ہندوستان واپس آیا تو جو کچھ ہوتا گیا، اس سے یہ بات واضح تر ہوتی گئی۔ میں سیاسیات سے الگ ہا لیکن جب مسلم لیگ زور آور ہوئی تو کچھ لوگ میرے پاس آئے اور شاکی ہوئے کہ صوبے کی مسلم لیگ پر وہ لوگ قابض ہیں جن کی ذہنیت ان لوگوں کی تھی جو خان بہادر یا خان صاحب ہوا کرتے تھے۔ میں ان لوگوں کے ساتھ ہوا۔ کامیابی جزئی ہوئی حالانکہ مسلم لیگیوں کی اکثریت ان لوگوں کے ساتھ تھی۔ وجہ یہ کہ مرکز والے نہ جانے کس غلط فہمی کی بنا پر، ان کی ہر خلاف قاعدہ بات کو صحیح قرار دیتے تھے۔ میں جلد ان لوگوں سے الگ ہوگیا۔ اس وقت سے اس وقت تک میں سیاسیات سے الگ ہوں۔ اس حد تک کہ آج تک میں نے کسی الکشن میں ووٹ نہیں دیا۔ مگر ایک الکشن میں میں نے ایک کمیونسٹ کی کانگریس کے مقابلے میں مدد کی تھی۔ اس کی وجہ خاص یہ تھی کہ مجھے اس پر حیرت تھی کہ کانگریسی امیدوار کا ایک کانگریسی کس طرح ہوگیا۔

اکثریت کو میرا مشورہ یہ ہے کہ وہ یہ بھول جائے کہ مسلمانوں نے اس پر ظلم کئے۔ نہیں بھول سکتا تو یہ یاد کرے کہ آریاؤں نے اس ملک کے اصلی باشندوں کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا اور اس کے مقابلے میں مسلمانوں کا سلوک اس کے ساتھ کیسا تھا۔ اسے اپنے حقوق کی حفاظت کرنے والے مسلمانوں کو فرقہ پرست نہیں کہنا چاہئے اور ان مسلمانوں کی سرپرستی نہیں کرنی چاہئے جن کی خود غرضی کی وجہ سے مسلمان انھیں ذلیل سمجھتے ہیں۔ رُرکالا اور رانچی کے فسادات کے بعد میں اور خلیل احمد صاحب ڈاکٹر ذاکر حسین سے ملنے گئے تھے۔ انھوں نے خود ہی فسادات کا ذکر چھیڑا اور ایک کتاب کے بارے میں مجھ سے پوچھا کہ کیا میری نظر سے گزری ہے۔ یہ کتاب ایک یہودی نے ان مظالم کے متعلق لکھی تھی جو یہودیوں پر ہوتے انھوں نے مجھے مشورہ دیا کہ نہ پڑھی ہو تو پڑھوں۔ اس کے بعد ان کی زبان سے ایک جملہ

نکلا جو بعد میں درج کیا جاتا ہے: "Musalmans should develope toughness"

انھوں نے یہ بھی کہا کہ مسلمانوں نے مصائب کا جس طرح مقابلہ کرنا چاہئے تھا، نہیں کیا۔ اور بلند کردار ہونے کا ثبوت نہیں دیا۔ مجھے دونوں باتوں سے اتفاق ہے۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ مسلمان ذرا ذرا سی باتوں پر مشتعل نہ ہوں۔ اپنے مطالبات میں جائز حدود سے متجاوز نہ کریں۔ لیکن اکثریت کے خوف سے اس کے ہر مطالبے کے آگے سر تسلیم خم نہ کریں۔ انہیں اس سے ڈرنا نہیں چاہیئے کہ وہ اپنے حقوق کی حفاظت چاہیں گے تو فرقہ پرست کہے جائیں گے۔ فرقہ پرست دراصل اکثریت کے وہ لوگ ہیں جو اقلیتوں کے جائز حقوق سے انہیں محروم کرنا چاہتے ہیں۔ ایک مشورہ کل اقلیتوں کے لئے ہے۔ انہیں قانون ساز مجالس میں پروپورشنل ریپریزنٹیشن کا مطالبہ کرنا چاہئے انہیں اقلیتوں کے ان افراد پر جو اکثریت کی دلالی کرتے ہیں، ہرگز بھروسا نہیں کرنا چاہیئے۔ اور قانون کے حدود کے اندر رہ کر ہر ممکن صورت یہ ظاہر کرنے کی اختیار کرنی چاہئے کہ ان دلالوں کو اقلیتوں کے خیالات کی ترجمانی کا کوئی حق نہیں۔

میں نے بحیثیت علم سیاسیات اور معاشیات کا باقاعدہ مطالعہ کیا تھا۔ اس میں کمیونزم بھی آگیا۔ مجھے لاسکی کے اس قول سے اتفاق ہے کہ کمیونزم ایک مذہب ہوگیا ہے اور میرے لیے یہ ممکن ہے کہ میں اسے تسلیم کر لوں کہ معاشی مساوات ہونی چاہئے لیکن یہ کبھی تسلیم نہیں کر سکتا کہ حصول مقصد کے لئے سب کچھ جائز ہے۔ اور حقیقت وہی ہے جس سے کمیونزم کو پھیلانے میں مدد ملے۔ لینن کا قول ہے کہ معاہدے توڑے جانے ہی کے لیے ہوتے ہیں۔ میں کبھی ایسی جماعت پر جس کا یہ عقیدہ ہو بھروسا نہیں کر سکتا۔ کمیونسٹوں نے زمانہ ماسبق سے انقلاب پر ایک دوسرے کو جو سزا دی ہے وہ میں بھول نہیں سکتا۔ اور فرد جس طرح غلامی کی سطح پر پہنچا دیا جاتا ہے اسے

میں نظر انداز نہیں کر سکتا۔ بے شک غریبوں اور کمزوروں کی ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے لیکن حکومت کو یہ نہ چاہیے کہ قانون سازی میں صرف اسے مدنظر رکھے کہ زیادہ ووٹ کس طرح ملیں گے۔ بہت زمانہ ہوا کہ ایچ۔جی۔ ولز نے افراد کے حقوق کا چارٹر بنایا تھا میں اس سے بڑی حد تک متفق نہ ہوں۔ سب سے بڑی بات یہ کہ میں ورلڈ اسٹیٹ چاہتا ہوں۔ اور مجھے یقین ہے کہ اگر یہ وجود میں نہ آیا تو دنیا کا خاتمہ ہو یا نہ ہو تمدن و تہذیب کا ضرور خاتمہ ہو جائے گا۔

۴ ابتدا میں میرا مذہب وہی تھا جو میرے والد کا تھا۔ ان کی وفات کے بعد میں نے سر سید احمد خاں کی "خطبات احمدیہ" اور شبلی کی علم الکلام پڑھی تو عجیب تذبذب میں پڑ گیا جس کا میری صحت پر بڑا اثر پڑا۔ مختلف احباب سے تبادلہ خیالات، جدید یورپی ادب جدید نفسیات کے مطالعے کے بعد بالآخر میں جن نتائج پر پہنچا ہوں، وہ یہ ہیں۔

انسان کی ذہنی صلاحیت ایسی نہیں کہ الٹمیٹ ریلیٹیز کے متعلق کوئی فیصلہ کن بات کہہ سکے۔ میں جب اس امر پر غور کرتا ہوں کہ عالم کس طرح وجود میں آیا تو مبہوت ہو جاتا ہوں۔ میں خود قاصر ہوں تو اس کے یہ معنی نہیں کہ دوسرے جو کچھ کہیں اسے بے چون وچرا باور کر لوں۔ کہا جاتا ہے کہ پیمبروں کے پاس معجزے ہوتے تھے جو لوگوں کو قائل کر دیتے تھے۔ ویسے معجزے جن کا کتابوں میں ذکر ہے، آج پیش ہوں تو میں بھی قائل ہو جاؤں۔ یہ بات مجھے بالکل قرین انصاف نظر نہیں آتی کہ مجھ سے اس کی توقع کی جائے کہ معجزوں کی جگہ ان کی رپورٹوں کو قبول کر لوں۔ مذاہب میرے نزدیک انسانوں کے بنائے ہوئے ہیں اور اس کا امکان کہ انسان مرنے کے بعد پھر زندہ ہوگا، بہت کم ہے۔ مجھے اس کا اعتراف ہے کہ مذہب سے بہت سے لوگوں کو اطمینان قلب نصیب ہوتا ہے اور بہتوں کو یہ برائیوں سے باز رکھتا ہے لیکن یہ میرا ذاتی مشاہدہ ہے کہ کثرت احباب جو

شریعت کے احکام ظاہری کی سختی کے ساتھ پابندی کرتے ہیں، اچھے انسان نہیں مسلمانوں کو چاہئے کہ احکام ظاہری کی پابندی کریں مگر یہ نہ سمجھیں کہ یہ سب کچھ ہے۔ انھیں خدمت خلق کی اہمیت کا احساس ہونا چاہئے۔ اور اس میں مسلم وغیر مسلم کا امتیاز نہیں چاہئے۔ انھیں محرم کے فضولیات اور درگاہ پرستی سے احتراز چاہئے۔ اس میں کروڑوں روپے ضائع ہوتے ہیں جو دوسرے کاموں میں، جو مفید خلق ہیں، صرف ہو سکتے ہیں۔

(۵) عنفوان شباب میں میں اور چند احباب (سید محمود، شیر، زبیر صدیقی، فضل علی خاں وغیرہ) نے ایک انجمن بنام انجمن ترقی اردو قائم کی تھی۔ انگلستان سے واپسی کے بعد میری تحریک پر یہ پراونشیل انجمن بن گئی۔ میں اس کا سکریٹری ہوا۔ اور لیڈی انیس امام صدر۔ یونیورسٹی کی سنڈیکیٹ نے ایک تجویز یہ منظور کی کہ مدارس میں علوم کی تعلیم ہندوستانی زبان میں ہو۔ اس سے اردو بولنے والوں کو اندیشہ ہوا کہ ہندوستان کے نام سے ہندی رائج کی جائے گی۔ حامیان اردو نے ایک جلسہ کیا۔ اور اس معاملے کو انجمن ترقی اردو کے سپرد کیا۔ میں نے اس سلسلے میں انجمن کے سکریٹری ڈاکٹر عبدالحق سے مراسلت کی۔ یہ طے پایا کہ مرکزی انجمن ایک کمیٹی قائم کرے اور اس کا جلسہ پٹنہ میں ہو اور وہ اس پر غور کرے۔ اس سلسلے میں جو مراسلت ہوئی تھی، اس سے میں اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ ڈاکٹر عبدالحق ہندوستانی کو اس قابل نہیں سمجھتے کہ وہ علمی زبان ہو سکے۔ میں نے صوبۂ بہار میں جو اردو ہندی کا جھگڑا ہوا تھا۔ اس کے متعلق معلومات فراہم کر کے انہیں بھیجے تھے۔ جو کچھ میں نے اور کچھ دوسرے نے اکٹھا کیے تھے۔ ڈاکٹر عبدالحق نے اپنے نام سے ایک کتابچہ چھپوایا جس میں اپنی طرف سے وہ معلومات پیش کئے اور کتابچہ کمیٹی کے ارکان کو بھیجا۔ میں نے ڈاکٹر راجندر پرشاد سے اس سلسلے میں ملاقات کی تھی۔ اور یہ استدعا کی تھی کہ کمیٹی کے ممبروں سے ملیں۔ انہوں نے کہا کہ ضرور ملتا۔ لیکن گاندھی جی کے یہاں جا رہا ہوں۔ انہوں نے یہ

بھی کہا کہ میں ایسی زبان لکھ سکتا ہوں جو اردو والوں اور ہندی والوں، دونوں کے لیے
قابلِ قبول ہو سکتی ہے۔ بعد کو انہوں نے مجھے بلا بھیجا اور کہا کہ گاندھی جی کو یہاں کے معاملات
کی اطلاع ہو گئی اور انہوں نے مجھے تار دیا ہے کہ میں کمیٹی کے ممبروں سے ملوں۔ اس کے لیے
ایک وقت مقرر ہو گیا۔ کمیٹی کا جلسہ ہوا تو ڈاکٹر عبدالحق نے اس کی صدارت کے لیے ڈاکٹر
سید سلیمان ندوی کا نام پیش کیا اور مجھ سے کہا کہ اغراضِ جلسہ سے ارکانِ کمیٹی کو مطلع کروں۔
میری تقریر کے بعد پروفیسر مجیب نے جو ایک رکن تھے، کہا کہ یہ تو کوئی بات ہی نہیں۔ میں
نے جواباً کہا کہ ڈاکٹر عبدالحق کے کتابچے سے آپ کو یہ سب معلوم ہو چکا تھا۔ ان امور کی کچھ
اہمیت ہی نہیں تو پٹنہ آنے کی زحمت ہی کیوں گوارا کی۔ جلسہ صبح کے وقت ہوا تھا۔

اور ڈاکٹر راجندر پرشاد سے ملنے کا وقت دوسرے دن مقرر تھا۔ ڈاکٹر عبدالحق نے کہا کہ ہم
لوگوں کو اس کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ اور کچھ تجویزیں منظور کر لینی چاہئیں جو ان کے سامنے
پیش کی جا سکیں۔ بغیر اس کے کہ کافی غور و فکر سے کام لیا جائے چند تجویزیں منظور ہو گئیں۔ ڈاکٹر راجندر پرشاد
آئے تو ان کے ساتھ بلدیو سہائے جنہوں نے سنڈیکیٹ سے متعلق تجویز پیش کی تھی اور جو بعد کو ایڈووکیٹ جنرل ہوئے اور ایک صاحب
جو اس زمانے میں پراونشیل کانگریس کمیٹی کے صدر تھے، ان کے ساتھ تھے۔ کمیٹی کی منظور کردہ
تجویزیں میرے پاس تھیں۔ میں نے انہیں ڈاکٹر عبدالحق کے حوالے کیا کہ وہ ڈاکٹر راجندر پرشاد
کو دکھائیں۔ انہوں نے آہستہ سے یہ کہا کہ ان سے "وکیلانہ" گفتگو کرنی چاہیے۔ اس کے بعد
ہی ایک مسودہ غلام السیدین نے جو کمیٹی کے ایک رکن تھے۔ نکالا، ڈاکٹر عبدالحق کو دکھایا۔ انہوں
نے مجھے دیکھنے کو دیا۔ اس کے بعد یہ ڈاکٹر راجندر پرشاد کو دیا گیا۔ انہوں نے سرسری طور پر اسے
دیکھا اور اس کے بعد اس پر ڈاکٹر راجندر پرشاد اور ڈاکٹر عبدالحق کے دستخط ہو گئے۔ یہی
راجندر پرشاد عبدالحق پیکٹ ہے۔ اس کے بموجب ہندوستان کی زبان ہندوستانی قرار پائی
جو ہندی اور اردو دونوں رسم الخطوں میں لکھی جائے گی۔ ہندی میں اگر کوئی علمی اصلاح

آئی تو اس کے ساتھ ہی تو سین میں اس کا اردو بدل ہوگا اور اردو کی تحریر میں ہندی بدل میں نے کہا کہ اس معاہدے کا تعلق تو سارے ہندوستان سے ہے، بہار میں جو معاملہ در پیش ہے، اس کا کیا ہوگا۔ بدیہ سہائے نے جواب دیا کہ اردو والوں کے مفاد کے تحفظ کے لیے انجمن کی پراونشیل شاخ جو باتیں پیش کرے گی منظور کر لی جائیں گی۔ یہ معاہدہ انجمن ترقی اردو کی مقرر کردہ کمیٹی کے سامنے آنے سے قبل ہی وجود میں آ گیا۔ اور کمیٹی کی منظور کردہ تجویزیں ڈاکٹر راجندر پرشاد کو دکھائی بھی نہیں گئیں۔ غلام السیدین اور پروفیسر مجیب ڈاکٹر محمود کے ساتھ ٹھہرے ہوئے تھے جو اس زمانے میں صوبہ بہار کے وزیر تعلیم تھے۔ مجھے یقین ہے کہ معاہدے کا مسودہ ڈاکٹر راجندر پرشاد، ڈاکٹر عبدالحق اور بعض دیگر اصحاب نے پہلے ہی دیکھ لیا تھا۔ اس کی خبر اگر نہ تھی تو مجھے اور بعض دوسرے ارکان کمیٹی کو۔ اس کے بعد سنڈیکیٹ یا وزیر تعلیم نے ایک ہندوستانی کمیٹی بنائی جس کے صدر ڈاکٹر سچدانند سنہا اور ڈاکٹر عبدالحق اس کے ایک رکن مقرر ہوئے صوبہ کی انجمن ترقی اردو کا کوئی رکن اس میں نہیں لیا گیا۔ سنہا کمیٹی نے باتفاق ڈاکٹر عبدالحق جو فیصلے کئے ان میں سے ایک یہ تھا کہ جامع اللغات اور فرہنگ آصفیہ میں جو ہندی الفاظ ہیں، اور ناگری پرچارنی سبھا کی شبد ساگر میں جو عربی فارسی الفاظ ہیں، ہندوستانی سمجھیں جائیں۔ ایسے ایسے الفاظ ہندوستانی قرار دیئے جانے لگے جو اردو والوں نے خواب میں بھی نہ سنے تھے۔ بدیہ سہائے نے صوبے کی انجمن کے بارے میں جو کچھ کہا تھا بالکل فریب نکلا۔ بہر حال۔ اور ایک جلسے میں یہ منظور ہوا کہ اس معاملے پر غور کرنے کے لیے ایک کانفرنس منعقد کی جائے۔ اس جلسے میں ایسے حامیان اردو بھی تھے جو انجمن کے رکن نہ تھے۔ صوبے کی انجمن کی طرف سے ایک کمیٹی مقرر کی گئی جو ان الفاظ کے متعلق جو فیصلہ مذکور کی رو سے ہندوستانی قرار پاتے ہیں، اپنی رپورٹ دے۔ میں نے دونوں کتابوں سے بہت سے ایسے الفاظ نکالے جو اردو والوں کے لیے قابل قبول نہیں ہو سکتے۔ تماشا یہ کہ سنہا کمیٹی کے متعدد منظور کردہ

الفاظ پر مرکزی انجمن کے اخبار میں بھی اعتراض ہوئے تھے۔ یہ رپورٹ چھپی اور اسی زمانے میں یا اس کے بعد الہ آباد کے ایک ماہنامے میں بھی شائع ہوئی۔ پٹنہ میں کچھ لوگ تھے جنہوں نے اس موقع سے خالی فائدہ اٹھانا چاہا۔ ڈاکٹر عبدالحق کو اطلاع دی کہ کانفرنس کی اصلی غرض آپ کے خلاف ملامت کی تجویز منظور کرانی ہے۔ معتبر ذرائع سے معلوم ہوا تھا کہ ان لوگوں نے اسے ناکامیاب بنانے کے لیے ان سے ہزاروں روپے وصول کیے۔ قاضی محمد سعید مجلس استقبالی اور صوبے کی انجمن کے سکریٹری تھے۔ ان لوگوں نے ان کا اعتماد حاصل کیا اور مجلس استقبالیہ کے رکن بنانے شروع کیے۔ مجلس استقبالیہ کا صدر چننے کے لیے ارکان مجلس کا جلسہ تھا۔ میں اس میں شرکت کے لیے گیا۔ مجھے دیکھتے ہی مسعود عالم ندوی نے کہا کہ آپ کو صدر ہونا چاہیئے۔ میں نے انکار کیا۔ یہ بظاہر موافق تھے لیکن دراصل مخالف۔ ڈاکٹر سید سلیمان ندوی کی ایک کتاب پر [illegible] صاحب (فی الحال پروفسر) نے تبصرہ لکھا تھا اور ان کی بہت سی غلطیوں کی نشاندہی کی تھی۔ اس سلسلے میں ان سے بھی کچھ غلطیاں ہوئی تھیں۔ اور ان کا لہجہ قابل اعتراض تھا۔ میرے ان کے تعلقات تھے۔ اور مسعود عالم ندوی وغیرہ خلاف واقعہ یہ سمجھے کہ تبصرہ میرا لکھا یا لکھوایا ہوا ہے۔ یہ لوگ اس بنا پر مجھ سے عداوت رکھتے تھے۔ اور چاہتے تھے کہ صدارت کے لیے میرا نام پیش ہو۔ اور مجھے شکست دی جائے۔ انجمن کی طرف سے ایک شخص کا نام پیش ہوا۔ ان لوگوں کی طرف سے ایک اور شخص کا نام پیش ہوا جو کسی حیثیت سے بھی ان کے برابر نہ تھے۔ اور یہ صاحب کامیاب ہوئے۔ اگر میرا نام پیش ہوتا تو شکست مجھے ہوتی۔ یہ لوگ سمجھے کہ اب سب کچھ ان کی مرضی کے مطابق ہوگا۔ لیکن کانفرنس انجمن کی منعقد کردہ تھی۔ اور اس زمانے میں میں اس کا صدر تھا۔ انجمن نے طلبہ کے لیے بہت رعایت کر دی اور بہت سے طلبہ استقبالیہ کمیٹی کے رکن ہوئے۔ سبجکٹس کمیٹی کے ارکان کے انتخاب کے لیے جو جلسہ ہوا اس میں مخالف جماعت کا ایک شخص بھی منتخب نہ ہوا۔ لیکن صدر مجلس استقبالیہ

کے خطبے میں بہت سی غلط باتیں تھیں اور ڈاکٹر عبدالحق کی مدح سرائی کی گئی تھی۔ کانفرنس کے صدر لاہور کے مشہور اخبار نویس ظفر علی خاں تھے۔ جو ڈاکٹر عبدالحق سے ملے ہوئے تھے۔ سبجکٹس کمیٹی کے جلسے میں انہوں نے ایک تجویز پیش کی جس میں ڈاکٹر عبدالحق کی خدمات کا اعتراف تھا۔ اور مجھے اسے پیش کرنے کے لیے کہا۔ میں نے قطعاً انکار کر دیا۔ وہ تجویز جو منظور ہوئی اس میں ڈاکٹر عبدالحق کا نام نہ تھا۔ مگر سنہا کمیٹی کے فیصلوں سے سخت ناپسندیدگی ظاہر کی گئی تھی۔ اس کے کچھ بعد ناگپور میں مرکزی انجمن کی طرف سے ایک کانفرنس منعقد ہونے کا اعلان ہوا۔ یہاں جو کچھ ہوا تھا اس کی مفصل روداد ناگپور مختلف اصحاب کو بھیجی گئی۔ اور وہاں خود مرکزی انجمن کی منعقد کردہ کانفرنس نے سنہا کمیٹی کے فیصلوں کو ناپسند کیا۔ سید ضمیر الدین احمد صوبے کی انجمن کے ایک رکن نے ڈاکٹر سنہا کو اس کی خبر دی تو وہ سخت حیران ہوئے کہ جو فیصلے خود ڈاکٹر عبدالحق کی اتفاق رائے سے ہوئے ہیں، خود ان کی کانفرنس نے اسے ناپسند کس طرح کیا۔ تقسیم ہند کے بعد جب قاضی عبدالغفار مرکزی انجمن کے سکریٹری ہوئے تو اپنی مصلحتوں کے اقتضا سے انہوں نے یہاں کے کچھ لوگوں کو ملا کر ایک اور صوبے کی انجمن قائم کرائی۔ مگر یہ انجمن بھی کئی سال تک باقی رہی۔ اور اردو ہندی کے متعلق اظہار رائے کے لیے ایک بڑی کانفرنس بھی اس کی طرف سے منعقد ہوئی تھی۔

(۶) میرے والد کو جس زمانے میں میں باشعور ہوا، شعر و شاعری سے زیادہ دلچسپی نہ تھی۔ مگر ان کے خالو سید شاہ محمد حسین، رحمۃ جو ان کی جائیداد کے منتظم بھی تھے۔ اکثر شعر پڑھا کرتے تھے۔ اور یہی حال نشتر کا بھی تھا۔ مجھے یاد نہیں کہ کس طرح حسرت موہانی کا اردوئے معلی میں نے دیکھا اور اس کے کئی پرانے مجلدات منگوائے اور ان میں شعرائے اردو سے متعلق جو مضامین تھے، پڑھے۔ شعر العجم کی جلدیں بھی دیکھیں۔ بعد کو مجھے غالب سے دلچسپی ہوئی اور

میں نے اتنی بار اس کا دیوان دیکھا کہ اس کا بڑا حصہ مجھے یاد ہو گیا تھا۔ میں نے پہلا مضمون جو شعرائے اردو کے بارے میں لکھا۔ پٹنہ کے ایک ماہنامے میں، جو جلد ہی بند ہو گیا، شائع ہوا تھا۔ اس میں اور کچھ نہ تھا۔ گلزار ابراہیم مؤلفہ علی ابراہیم خاں خلیل نے شعرائے عظیم آباد کے متعلق جو کچھ لکھا ہے، اس کا کچھ حصہ نقل کر دیا گیا تھا۔ معارف میں گارساں دتاسی کی تاریخ ادبیات کے ماخذ کے متعلق خود اس کے بیان کا ترجمہ شائع ہوا۔ میں نے ایک خط میں جو بنام مدیر معارف تھا، اسکے اغلاط کی نشاندہی کی جو میری اجازت سے مدیر نے چھاپ دیا۔ اسکا جواب معارف میں نکلا۔ اسکے کچھ ہی دن بعد انگلستان چلا گیا اور جواب الجواب نہ شائع ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس زمانے میں میرے معلومات زیادہ نہ تھے۔ اور میرے بعض اعتراض غلط تھے، رہا دتاسی تو اس کے متعلق بعد کو میں بہت کچھ لکھ چکا ہوں۔ یورپ میں میں نے بہت سے پرانے اور نئے شعرا کا کلام دیکھا۔ لیکن میں یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ میں نے یورپی شاعری کا باقاعدہ مطالعہ کیا۔ یورپ کے متعدد کتب خانوں میں جو شعرائے اردو کے تذکرے اور دواوین ہیں، ان میں سے بہتوں کے متعلق میں نے یادداشتیں لکھیں، جن کا بڑا حصہ ضائع ہو گیا ہے۔ یورپ جانے سے قبل میں نے چند شعر بھی کہے تھے ان میں سے کچھ فارسی کا ترجمہ تھے۔ ایک شعر جو میں نے لڑکپن میں بیت بازی کی ضرورت کے لیے لکھا تھا، یہ ہے ؎

زولیدہ بال کیوں ہیں چہرہ ہے کیوں پریشاں
مرگ رقیب کی کیا تم نے خبر سنی ہے

پروفسر مختار الدین احمد نے میرے متعلق آج کل میں جو مضمون لکھا تھا، اس میں جو میرے اشعار منقول ہیں، ان میں سے کچھ ترجمہ ہیں، نہ جانے کیوں انہوں نے یہ بات نہ لکھی۔ شعر اب بھی میں موزوں کر لیتا ہوں مگر میں شاعر نہیں۔ یورپ سے واپسی کے بعد پٹنہ میں مستشرقین کی کانفرنس ہوئی۔ اس کے لیے میں نے ایک بسیط مقالہ مصحفی پر لکھا تھا۔ اس وقت تک

مصحفی کے تذکرے شائع نہیں ہوئے تھے اور اس کے دواوین بھی غیر مطبوعہ تھے میں نے اپنے مقالے میں ان سب سے کام لیا تھا۔ مدیران اردو معارف نے اسے اشاعت کے لیے لینا چاہا تھا مگر میں اس پر کچھ اضافہ کرنا چاہتا تھا۔ اور اس کے بغیر اشاعت مناسب نہیں سمجھتا تھا۔ اضافہ ہوا نہیں اور مقالہ ضائع ہو گیا۔ میں نے ۱۹۳۶ء میں صوبے کی انجمن ترقی اردو کی طرف سے ایک رسالہ "معیار" نکالا تھا۔ اس کے پانچ چھ شمارے نکلے۔ اس کے بعد یہ میری خرابی صحت کی وجہ سے بند ہو گیا۔ میں نے مصحفی کے آٹھوں دیوانوں کا انتخاب ایک خاص نقطۂ نظر سے کیا۔ اس میں چار پانچ ہزار اشعار تھے۔ پروفیسر سرور نے جب وہ انجمن ترقی اردو کے سکریٹری ہوئے تھے، اسے شائع کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ لیکن پھر ادھر متوجہ نہ ہوئے۔ اب اس کے چند اوراق باقی رہ گئے ہیں۔ میں نے جب جب پریکٹس شروع کرنی چاہی، بیمار ہو گیا۔ بالآخر میں نے اس کا خیال ہی دل سے اٹھا دیا۔ اور ادبی تحقیقات کو بطور مشغلہ اختیار کیا۔ میں نے اسے تنقید پر کیوں ترجیح دی، اس کی وجہ یہ رہی ہو گی کہ میں نے اپنے کو اس کے لیے زیادہ موزوں سمجھا ہو گا۔ جب غالب سے متعلق تحقیقات کا شوق ہوا تو فارسی کی طرف توجہ ہوئی۔ اور میں نے فارسی زبان و ادب کا باقاعدہ مطالعہ کیا۔ میں نے پٹنہ، رامپور، علی گڑھ، دہلی، حیدرآباد، بمبئی، لاہور، کراچی اور ڈھاکہ کے کتب خانوں کے اردو مخطوطات کا معتد بہ حصہ دیکھا ہے۔ میں نے ان سے متعلق جو یادداشتیں لکھی تھیں وہ کچھ ہیں، کچھ ضائع ہو گئیں۔ جو ہیں بھی وہ اس طرح منتشر ہیں کہ ان سے کام لینا مشکل ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین جس زمانے میں بہار کے گورنر تھے، ادارہ تحقیقات اردو کا کتب خانہ قائم ہوا۔ اس کا افتتاح انہوں نے کیا تھا۔ اور جس جلسے میں یہ رسم انجام ہوئی تھی اس کی صدارت شری کرشن سنہا نے کی تھی جو اس زمانے میں بہار کے چیف منسٹر تھے۔ اس موقع پر ایک ادبی نمائش بھی ہوئی تھی۔ اس میں جو مخطوطات پیش ہوئے تھے، ان کی فہرست جو قاضی محمد سعید نے

تیار کی تھی، چھپ چکی ہے۔

• غالب بحیثیت محقق کم و بیش ۲۵۰ صفحوں کا مقالہ ہے جو نقدِ غالب مرتبہ پروفیسر مختار الدین احمد میں شامل ہے۔ جہانِ غالب کے عنوان سے میں نے دو ڈھائی سو صفحے لکھے ہوں گے۔ یہ غالب انسائیکلوپیڈیا اگر مکمل ہو جائے تو ہزار صفحوں سے کم کی نہ ہو مگر اس کی تکمیل کی بالکل امید نہیں۔ اس کے علاوہ بھی میں نے غالب کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے۔ غالب نے فارسی اردو میں برہان قاطع کے متعلق جو رسالے لکھے تھے، میں نے یکجا کر کے "قاطع برہان و رسائل متعلقہ" کے نام سے شائع کر دیئے ہیں۔ ارادہ تھا کہ ایک دوسری جلد میں اس کتاب کے مباحث سے مفصل بحث کی جائے۔ مگر اب تک یہ ارادہ قوت سے فعل میں نہیں آیا۔ غالب کے علاوہ جن شعرا سے مجھے خاص طور پر دلچسپی رہی ہے، سودا، میر، مصحفی اور انشا ہیں۔ ذکر میر و نکات الشعرا مؤلفہ میر پر جو تبصرہ میں نے لکھا ہے چھپ چکا ہے۔ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی کی کتاب متعلق میر کی مفصل تنقید عیارستان میں ہے۔ سودا، مصحفی اور انشا کے متعلق بھی بہت کچھ لکھ چکا ہوں۔ اور ان کے متعلق اتنا مواد میرے پاس یا میرے علم میں ہے کہ کتابیں تیار ہو سکتی ہیں۔ تعین زمانہ کے تحت میں نے سو ڈیڑھ سو صفحے لکھے ہوں گے اور کئی سو صفحے اور لکھ سکتا ہوں۔ یہی حال لسانیات سے متعلق مباحث کا ہے۔ میرا ایک طویل مقالہ "آزاد بحیثیت محقق" ہے، اور میں نے ڈاکٹر اختر اورینوی کی کتاب متعلق زبان و ادب بہار پر ایک طویل تبصرہ لکھا تھا۔ فارسی مخطوطات کے بارے میں میرے بہت سے مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ فارسی کی خدمت کے اعتراف کے طور پر صدر ہندوستان نے مجھے سرٹیفیکٹ اوف اونر دیا تھا۔ میری اڈٹ کی ہوئی کتابیں دیوان جوشش، دیوان رضا، اور قطعات دلدار ہیں۔ مصحفی کا دیوان ہشتم اڈٹ کر رہا ہوں یہ کتب خانہ خدا بخش کی طرف سے شائع ہوگا۔

(۷) میرے والد کو داستان امیر حمزہ کے مطالعے کا شوق تھا اور ان کے پاس اس کی بہت سی جلدیں تھیں۔ میں نے یہ سب بڑی دلچسپی کے ساتھ پڑھیں۔ بوستان خیال کی ایک جلد کہیں اور ملی مگر اس میں میرا دل نہ لگا۔ بعد کو میں نے شرر، سرشار کے ناول اور رینالڈس کے ناول کے تراجم دیکھے۔ پریم چند کی بہت سی کہانیاں بھی پڑھیں۔ عنفوان شباب میں میں نے خود رومانی انداز کی ایک کہانی لکھی۔ اس کا عنوان مجھے یاد نہیں۔ یہ آگرہ اخبار میں ایک فرضی نام ("جذبات حسرت کا مصور") سے چھپی تھی۔ میں بلگرامی ٹیوٹوریل کالج میں داخل ہوا، تو میں نے بہت سے انگریزی ناول دیکھے۔ اور یہ سلسلہ پٹنہ واپس آنے کے بعد بھی جاری رہا۔ یورپ میں شاعری کی بہ نسبت مجھے ناول دیکھنے کا زیادہ شوق رہا۔ اور انگلستان، فرانس، اٹلی، اسپین، ناروے، روس، جرمنی اور امریکہ کا شاید ہی کوئی بڑا ناول لکھنے والا ہو جس کے ناول میری نظر سے نہ گزرے ہوں۔ میرے زمانۂ اقامت یورپ میں جیمس جوائس اور مارسل پروست کا بہت چرچا تھا۔ یورپ سے واپسی کے بعد بھی میری دلچسپی ناولوں سے باقی رہی۔ اور میں نے "معیار" کے لیے خود بھی ایک کہانی لکھی جو ایک فرضی نام سے اس میں شائع ہوئی۔ کہانی کا عنوان "ایک ہونہار نوجوان" ہے۔ میں نے دو تین کہانیوں کا انگریزی سے ترجمہ بھی کیا ہے۔

(۸) بلگرامی ٹیوٹوریل کالج میں میں سینیر کیمبرج کی تیاری کر رہا تھا۔ اور مرچنٹ اوف وینس نصاب میں تھا۔ میجر بلگرامی نے اسے اسٹیج کرنا چاہا اور مجھے بھی ایک پارٹ دیا۔ اس زمانے میں مجھے یہ ڈراما قریب قریب سب یاد تھا۔ بی۔ اے کے لیے میں نے ایز یو لائک اٹ پڑھا۔ مجھے ڈراموں سے واقعی دلچسپی اس وقت ہوئی جب میں نے انگلستان میں تھیٹر میں ڈرامے دیکھے۔ میرے زمانۂ اقامت انگلستان میں کوئی اہم ڈراما جو وہاں اسٹیج ہوا ہو، ایسا نہ تھا جو میں نے نہ دیکھا ہو۔ یونانیوں کے ڈراموں سے لے

کرپرانڈیلو (اطالوی تمثیل نگار جس کا اس زمانے میں بڑا چرچا تھا) تک کوئی بڑا تمثیل نگار نہیں، جس کے ڈرامے میں نے نہ دیکھے ہوں۔ تنقیدی ادب کی بھی بہت سی کتابیں میری نظر سے گزری ہیں۔

(۹) میں نے دوران قیام یورپ میں فرانس، سوئٹزرلینڈ، جرمنی، ہالینڈ اور اٹلی کے کچھ حصے دیکھے۔ ان ممالک میں سب سے زیادہ میں فرانس سے واقف ہوں۔ ہندوستان واپس آنے کے بعد میں نے یہاں کے بہت سے شہر دیکھے۔ جہاں عموماً میں رسرچ کے سلسلے میں گیا۔ تقسیم ہند کے بعد میں کراچی۔ حیدرآباد۔ سندھ، لاہور اور ڈھاکہ گیا ہوں۔

(۱۰) قاضی عبدالوحید نے تین بیٹے اور ایک بیٹی چھوڑی۔ میں سب سے بڑا اور میرے بعد میری بہن عائشہ۔ ان کی شادی خان بہادر سید محبوب عالم سے ہوئی جو قاضی اسد علی کے بیٹے کے نواسے تھے۔ ان کے یہاں ۱۹۲۲ء میں ایک بیٹی انجمن آرا عرف احمدی پیدا ہوئی اس کے بعد وہ چند روز بیمار رہ کر قضا کر گئیں۔ میری والدہ کو ان سے جتنی محبت تھی کسی اور اولاد سے نہ تھی۔ ان کی موت کے بعد انہوں نے ایک بار خودکشی کی کوشش کی ۱۹۲۴ء میں ان کی وفات ہو گئی۔

تقسیم ہند کے بعد سید محبوب عالم کراچی چلے گئے۔ ان کی تو وفات ہو چکی ہے۔ ان کی بیٹی اور ان کی اولاد وہاں ہے۔ قاضی محمد سعید ان کے بعد تھے۔ انہوں نے تحریک ترک موالات کے زمانے میں سرکاری مدرسے میں پڑھنا چھوڑ دیا اور جامعہ ملیہ میں داخل ہو گئے۔ وہاں سے انہوں نے بی۔ اے کی ڈگری لی۔ انگلستان سے میری واپسی کے بعد وہ برلن گئے۔ اور برلن یونی ورسٹی میں داخل ہوئے۔ ان کا موضوع فشٹے کا فلسفہ تعلیم تھا۔ وہاں وہ بہت دن رہے مگر اپنا کام مکمل نہ کر سکے۔ جنگ سے کچھ قبل وہ ہندوستان آئے۔ ممکن تھا کہ پھر وہاں جاتے لیکن جنگ چھڑ گئی۔ یہاں وہ ہم لوگوں کی مشترک جائداد کا انتظام کرتے رہے۔ صوبے

کی انجمن ترقی اردو کے سکریٹری ہے اور ادارۂ تحقیقات اردو کے قائم کرنے والوں میں ایک وہ بھی تھے۔ ۱۹۴۶ء میں اس صوبے میں جو فسادات ہوئے اور ایک ریلیف کمیٹی قائم ہوئی۔ اس کے وہ سکریٹری تھے۔ اور انہوں نے اپنا کام بڑی جانفشانی سے کیا۔ وہ اس کا اعلان نہیں کرتے تھے لیکن مجھے خوب معلوم ہے کہ ہزاروں روپے اپنے بھی ریلیف میں خرچ کئے۔ بعد کو یہاں مشورت کمیٹی کی جو شاخ قائم ہوئی تھی، اس سے ان کا گہرا تعلق تھا اور الکشن کے زمانے میں الکشن کے متعلق جو کمیٹی قائم ہوئی تھی اس کے وہ سکریٹری تھے۔ وہ مجرد ہے۔ اور یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ انہوں نے اپنے کو قومی خدمت کے لیے وقف کر دیا تھا۔ ۱۹۶۰ء میں ان کی وفات ہوگئی۔ ان کے بعد قاضی محمد فرید تھے۔ کیمبرج میں معاشیات اور تاریخ کی ڈگریاں لینے کے بعد وہ ہندوستان واپس آئے تو انہیں بہار میں کوئی نوکری ہی نہ ملی۔ امرتسر کے اسلامیہ کالج میں مل گئی۔ اور انہوں نے لاہور میں شادی کر لی۔ بعد کو وہ پشاور میں نوکر رہے اور بالآخر کراچی یونی ورسٹی میں معاشیات کے پروفسر اور صدر شعبہ ہوئے۔ ان کی وفات ۱۹۶۶ء میں ہوئی۔ ان کی بیبی اور ان کی اولاد پاکستان میں ہے۔

(۱۱) میری عمر پندرہ سولہ سال کی تھی کہ میری والدہ نے میرا عقد نکاح شاہ نظام الدین کی بیٹی سے جو خان بہادر سید ضمیر الدین احمد (صدر گلی شہر پٹنہ) کی نواسی تھیں، کر دیا۔ رخصتی نہیں ہوئی تھی کہ ایک دو برس بعد ان کا انتقال ہوگیا۔ اس کے کئی برس بعد میری شادی شاہ رشید اللہ کی بیٹی سے ہوئی۔ یہ اپنے زمانے کے سربرآوردہ وکیلوں میں تھے۔ اور کچھ دن سرکاری پلیڈر بھی رہے تھے۔ یہ دراصل غازی پور کے رہنے والے تھے۔ شادی یہاں ہوئی تو یہیں بس گئے۔ ان کی وفات ۱۹۶۲ء میں ہوئی۔ میری اولاد صرف ایک ہے، قاضی محمد مسعود جو سوشیولوجی میں ایم۔ اے ہیں اور قانون کا آخری امتحان پاس کر چکے ہیں۔

(۱۲) منطق نے بتایا کہ تناقض و تضاد کیا ہے، اور صحت فکر کے لیے مغالطوں سے

بچنا کس قدر ضروری ہے۔ نفسیات نے سکھایا کہ اعمال کے محرکات لازماً وہ نہیں ہوتے جو ظاہر میں نظر آتے ہیں۔ شخصیت کا مسئلہ کس قدر پیچیدہ ہے، اور کسی انسان کے متعلق رائے قائم کرنا کس قدر مشکل ہے۔ قانون شہادت کی تعلیم یہ ہے کہ واقعات اور آراء میں تمیز کی جائے۔ یہ دیکھا جائے کہ گواہ جو کچھ کہتا ہے، وہ کس حد تک ذاتی مشاہدے پر مبنی ہے اور کس حد تک سماعت پر۔ گواہوں کے بیانات پر کسی اچھے وکیل کی جرح جس شخص نے دیکھی ہے، اسے اس کا احساس ہوا ہوگا کہ جو باتیں پہلے بڑے اعتماد سے کہی گئی تھیں، وہ کتنا ناقابل قبول تھیں۔ گواہ صادق القول ہو جب بھی اس کا امکان رہتا ہے کہ اس کا مشاہدہ صحیح نہ ہو اور اس کا بیان غلط فہمی پر مبنی ہو۔ ان لوگوں کو جو تحقیقات سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ میں یہ مشورہ دوں گا کہ وہ اسٹینلی گارڈنر کے وہ ناول دیکھیں جس میں پری میسن گواہوں پر جرح کرتا ہے۔ جدید یورپی اور امریکی (کمیونسٹوں کا ادب اس میں شامل نہیں) ادب کی روح کا اظہار، ایک یورپی نقاد کے قول کے مطابق، ایک بڑی علامت استفہام سے ہوتا ہے۔ کوئی بات محض اس لیے قبول نہیں کی جاتی کہ مدت دراز سے لوگ اسے مانتے آئے ہیں۔ ہر مسئلے پر از سر نو غور کیا جاتا ہے۔

(۱۳) عنفوان شباب سے قطع نظر، مجھے کوئی شخص ایسا نہیں ملا، جس کی "اِقْتَدَیْتُ بِہٖ اِنَّہٗ اِمَام" کہہ کر پیروی کرنے لگوں اور وہ لوگ جو ابتدا میں مجھے بہت بڑے نظر آتے تھے۔ ان میں سے بعض بہت پست نظر آنے لگے۔ میں نہ جانے کتنی کتابوں سے متاثر ہوا۔ اور جن لوگوں سے زیادہ تعلقات رہے۔ میں نے ان کا اثر بھی قبول کیا ہوگا۔

میرا خیال ہے کہ ادب کو سیاسی و معاشی عقائد کی تبلیغ کا ذریعہ نہیں بنانا چاہئے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ادیب کا کوئی عقیدہ نہ ہو۔ ادیب کا اپنے عہد کے مسائل سے اس قسم کا تعلق نہیں ہونا چاہیے جو ایک پارٹی کے ممبر کا ہوتا ہے۔

شاعری ہو یا تمثیل یا کہانی، اس میں جدت ہو تو ٹھیک ہے۔ مگر جدت محض برائے جدت نہیں۔ میں ایسے ادب کا جو لکھنے والے کے سوا کسی کی سمجھ میں نہ آئے۔ قائل نہیں۔ نثر کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ لکھنے والے کا مافی الضمیر، وہ غلط ہو یا صحیح، بالکل واضح طور پر ظاہر ہو جائے۔

میں چاہتا ہوں کہ ورلڈ اسٹیٹ وجود میں آئے۔ میری یہ بھی خواہش ہے کہ معاشرت بھی ایک طرح کی ہو۔ میں مغربی لباس پہنتا ہوں۔ مغربی کھانے کو بحیثیت مجموعی مشرقی کھانوں پر ترجیح دیتا ہوں۔ یہ صحیح نہیں (جیسا کہ پروفیسر مختار الدین احمد نے لکھا ہے) کہ میری محبوب غذا مرغ پلاؤ ہے۔ مشرقی کھانوں میں میں کباب کو بہت پسند کرتا ہوں۔ بعض اوقات مجھے جانوروں کا گوشت کھانا نامناسب معلوم ہوتا ہے۔ میں نے ایک بار مہینوں تک گوشت نہ کھایا۔ مگر اس پر قائم نہ رہ سکا۔ آم میرا محبوب پھل ہے۔ لیکن یہ صحیح نہیں کہ میرے نزدیک سب سے اچھا آم سپیا ہے (قول پروفیسر مختار الدین احمد)۔ کم از کم دس آم ہیں جنہیں میں اس سے بہتر سمجھتا ہوں۔ سردہ، ناشپاتی۔ اسٹرابری، چیری، سنگترا، انناس بھی مجھے بہت مرغوب ہیں۔ سگریٹ پینا میں نے انگلستان جا کر شروع کیا۔ میں ترکی سگریٹ کو امریکی سے بہتر سمجھتا ہوں۔ سگار کا مجھے کبھی شوق نہیں رہا۔ چار پانچ برس سے میں نے سگریٹ پینا بالکل بند کر دیا ہے اور اس سے مجھے کچھ تکلیف نہیں ہوئی۔ شراب میں نے کیمبرج میں پینی شروع کی۔ وہاں میرے بہت کم دوست تھے جو نہ پیتے ہوں۔ میں دو تین بار حد اعتدال سے متجاوز ہو گیا۔ اور اس کا برا اثر ہوا۔ اس کے بعد میں نے کبھی زیادہ نہیں پی۔ میں برگنڈی کو اور شرابوں کی بنسبت زیادہ پسند کرتا تھا۔ دو تین برس سے میں نے شراب پینی بالکل بند کر دیا ہے۔ اس سے بھی مجھے کچھ تکلیف نہیں ہوئی۔ میں نے کرکٹ ٹینس وغیرہ کھیلے۔ لیکن اس قسم کے کسی کھیل میں آگے نہ بڑھ سکا، اور میں نے انہیں کھیلنا ترک

کر دیا۔ شطرنج کا مجھے بہت شوق تھا لیکن میں اچھا شاطر نہ بن سکا اور مدتوں سے میں نے اس کی شکل بھی نہیں دیکھی۔ برج میں نے انگلستان جاتے ہوئے جہاز پر سیکھا اور اس کے بعد یہ میرا محبوب کھیل ہو گیا۔ نہ جانے کتنی بار میں نے رات رات بھر برج کھیلا ہے۔ اس کا شوق ہندوستان واپسی کے بعد بھی رہا مگر اب اس سے کچھ تعلق نہیں۔ گذشتہ ۲۵ سال میں میں نے صرف ایک بار برج کھیلا ہے۔

میں نے اشخاص اور معاملات کو ان کی اصلی شکل میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ ظاہر ہے کہ کامیابی ہوئی بھی ہو تو جزوی ہو سکتی ہے۔ میں نے اپنے آپ کو بھی سمجھنے کی کوشش کی ہے مگر جیسا کہ بودلیر نے کہا ہے، اس کے لیے بڑی جرأت کی ضرورت ہے۔ نہ جانے کس حد تک میں کامیاب ہو سکا ہوں۔

حمیدہ سلطان

ودود بھائی

کلیم الدین احمد صاحب نے ودود بھائی پر مضمون لکھنے کی فرمائش کی تو میں نے سالہا سال کی گرد جھاڑ کر اپنے ماضی میں جھانکا۔ یاد بخیر، وہ زمانہ جب میرے لکھنے کا ولولہ بالکل تازہ تھا اور چاہنے والی ماں اور شفیق بھائی کے زیر سایہ شوقِ ادب پروان چڑھ رہا تھا۔ غالباً ۱۹۳۴ء یا ۱۹۳۵ء کا ذکر ہے، دسمبر کے مہینے میں آکا بھائی[1] کے تمام کیمبرج کے ساتھی کرسمس منانے کے لئے کلکتہ پہنچے تھے۔ دلی سے نور الدین احمد بار ایٹ لاء، آسام سے مسٹر خورشید آئی۔ سی۔ ایس اور مسٹر حباب افسر محکمۂ جنگلات، پٹنہ سے قاضی عبدالودود صاحب۔ غرضیکہ ہمارے گھر میں بھانت بھانت کے لوگ جمع تھے والدہ صاحبہ تو نماز وظیفے میں زیادہ مشغول رہتی تھیں باوجود نوعمر ہونے کے میزبانی کے فرائض مجھ پر ہی تھے۔ ان سب صاحبان کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملتا تھا۔

ایک متوسط قد، گداز جسم کے سانولے رنگ اور روشن آنکھوں والے صاحب کا تعارف آکا بھائی نے یہ کہہ کر کرایا "ان سے ملو قاضی عبدالودود، بہت بڑے اردو کے سکالر، شعر و ادب کے دلدادہ ہیں اپنے ادبی کاموں میں تم کو ودود سے بہت اچھی صلاح ملے گی۔" ودود بھائی نے میرے آداب کا مخلصانہ لہجے میں جواب دیا اور پھر شفقت بھرے انداز سے میرے ادبی شغف کے متعلق گفتگو کرتے رہے۔ میں نے اس زمانے تک جو کچھ بھی لکھا تھا ان کے سامنے پیش کر دیا۔ میرا پہلا مضمون "پھولوں والوں کی سیر" دیکھ کر انہوں

---

[1] جناب فخرالدین علی احمد

نے فرمایا "بھئی واہ، اس مضمون میں تو تم کچھ فرحت اللہ بیگ سے بھی بازی لے گئی ہو۔ ان زمانے میں شعر کہنے کا بھی مجھے شوق تھا۔ میری غزل سننے کے بعد ارشاد کیا "سایل کا رنگ اس میں جھلکتا ہے"۔ قاضی صاحب کی وجہ سے ہمارے گھر پر اردو کے مشاہیر ادیب اور شاعر جو کلکتہ میں تھے یا باہر سے آتے ضرور پہنچتے۔ ادبی مباحثے ہوتے، شعر و ادب کی محفلیں جمتیں۔ اس طرح میرے ذوق کی تسکین بھی ہوتی اور میں ان صاحبان سے استفادہ بھی کرتی تھی۔ اسی زمانے میں مشہور شاعر عندلیب شادانی بھی تشریف لائے اور اپنی دلکش نظمیں انہوں نے دلآویز ترنم سے سنائیں اور اسکے بعد وہ جب کبھی بھی ہندوستان تشریف لائے بطور خاص ملے اور ہمیشہ چھوٹی بہن کی طرح شفقت برابر تادم مجھ سے کرتے رہے۔

مجھے یہ کہنے میں ذرا تامل نہیں کہ میرے ذوقِ ادب کی رہنمائی دو دو بھائی نے نہ کی ہوتی اور ڈاکٹر وزیر الحسن عابدی جیسے عالم میرے استاد نہ ہوتے تو میں افسانوی ادب کے گورکھ دھندے ہی میں پڑی رہتی یا اوٹ پٹانگ شعر کہتی رہتی۔ ان دونوں بزرگوں کے توسل سے سنجیدہ ادب کی طرف میری توجہ ہوئی۔ مجھے اس پر فخر کرنے کا حق ہے کہ قاضی صاحب جیسے بے مثل نقاد و متبحر عالم کے قیمتی مشورے مجھے ہمیشہ حاصل رہے۔ 1966ء کے بعد سے تو قاضی صاحب متواتر اپنے دونوں[1] عزیز دوستوں سے ملنے یا کسی ادبی جلسے کی شرکت کے لئے سال دو سال میں دلی تشریف لاتے رہے اور میں ان سے استفادہ کرتی رہی۔ اگر کسی معاملے میں مجھے ان کی مدد درکار ہوتی تو بلا تکلف خط لکھ کر فرمائش کر دی اور چند دنوں بعد ہی جواب باصواب مل گیا۔

عام طور پر ادبی دنیا قاضی صاحب کے خشک رویے سے مرعوب ہے، بڑے بڑے جغادری ادیبوں کو میں نے ان سے کانپتے دیکھا ہے جب قاضی صاحب کو کسی کی غلط تحریر پر جلال آتا ہے تو وہ اس طرح اس کو ڈانٹتے ہیں کہ بیچارے پر لرزہ آجاتا ہے۔ پڑھے لکھے لوگ بھی قاضی

---

[1] فخرالدین علی احمد صاحب ۔ نورالدین احمد بار ایٹ لا

صاحب کا رعب لیا طاری ہے کہ وہ ان کے قریب آتے گھبراتے ہیں۔ ان سب کو غالباً یہ معلوم نہیں کہ بظاہر ایسی کڑی نکتہ چینی کرنے والے قاضی صاحب اپنے پہلو میں کتنا شفقت بھرا دل رکھتے ہیں۔ ان کو تحقیقی معاملات میں ہر درجے کا ادیب دریافت طلب امور پر خط لکھ دیتا ہے اور وہ اس کا اتنی جلدی جواب دیتے ہیں کہ سوال کرنیوالا ان کی اس عنایت پر متحیر رہ جاتا ہے۔ نئے لکھنے والوں کا وہ حوصلہ بڑھاتے ہیں۔ اور جن اصحاب کو ان کی خدمت میں حاضری دینے کا موقع بارہا ملتا ہے وہ ان کی سیر حاصل معلومات کی بدولت نوٹ پر نوٹ تیار کر لیتے ہیں اور ذرا سی کوشش سے پوری کتاب مرتب کر کے پیش کر دیتے ہیں۔ ان اصحاب کی کارگزاری جب قاضی صاحب کے سامنے آتی ہے تو بجائے کچھ کہنے سننے کے ایک ہلکی سی شفقت آمیز مسکراہٹ ان کے لبوں پر آجاتی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے ایک بہت بڑا سرمایہ دار کسی گداگر کی جھولی میں چند سکے ڈال کر ایک اطمینان بھری ہنسی ہنس دے۔ قاضی صاحب جس اونچے درجے کے ادیب اور نقاد ہیں انھوں نے اس کے مقابلے میں اپنے سرمایہ علم سے کام لینے میں بڑا بخل سے کام لیا ہے حالانکہ ان کی دریا دلی روپے پیسے کے معاملے میں حد اعتدال سے بڑھی ہوئی ہے۔ لیکن مجھے اس پر افسوس ہے کہ انھوں نے اپنا بہت قیمتی وقت یونہی ضائع کر دیا۔ اگر وہ چاہتے تو ایک دو نہیں کئی علمی ادبی کتابوں کے مصنف ہوتے۔ ان کے پایے کا محقق ہند و پاک میں اور کوئی دوسرا نہیں، بحر العلوم اگر قاضی صاحب کو کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ کوئی کسی بھی شاعر کا شعر، تاریخ ولادت یا وفات معلوم کرنا چاہے قاضی صاحب بغیر کتاب دیکھے یا سوچے حوالوں کے ساتھ اس طرح جلدی جواب دیتے ہیں کہ ان کی غیر معمولی یادداشت اور تبحر علمی پر انسان حیرت زدہ رہ جاتا ہے۔ میں صرف دو عالموں کا دل سے احترام کرتی رہی اور میرا ذہن ہمیشہ ان دونوں سے مرعوب رہا۔ ایک تھے حضرت مولانا ابوالکلام آزاد۔ دوسرے خدا ان کو سلامت رکھے وہ ہو دبھائی

مجھے اس کا اعتراف ہے کہ ہم لوگوں نے یعنی ادیبوں اور شاعروں نے انجمن ترقی اردو ہند، ساقیہ

اکیڈمی، کسی کو خدا نے اس کی توفیق نہیں دی کہ قاضی صاحب کے کاموں کو سراہنے کے لئے تقریب منعقد کرتے۔ یا ان کے جو چند مضامین ہیں ان کا کوئی مجموعہ ترتیب دینے کا انتظام کر سکتے۔ کلیم الدین احمد صاحب کی کوشش یقین ہے بارآور ہوگی اور "معاصر" کا یہ خاص نمبر دودو بھائی کے شایان شان نکلے گا۔

سید امتیاز علی عرشی

ایک خط

محترمی و کرمی، تسلیم مع التکریم

آپ کے دو والا نامے موجب مسرت و سرفرازی ہو چکے ہیں، مگر میں ہنوز ان کا جواب نہیں لکھ سکا۔ درخواست ہے کہ اس کوتاہی کو معاف فرمایا جائے۔

میں صرف بوڑھا ہی نہیں، گردے اور دل کے درد کا کشتہ بھی ہوں۔ ضعف اعصاب اب اس درجے کو پہنچ گیا ہے کہ دماغ کے تخلیقی سوتے خشک ہو کر رہ گئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ حالت ذہنی اپج کی دشمن ہے، اور کوئی علمی و تنقیدی کام ذہن کی مدد کے بغیر انجام نہیں دیا جا سکتا، اب کروں، تو کیا کروں . . .

میں محب مکرم قاضی عبدالودود صاحب کو اردو زبان کے تمام تحقیقی کام کرنیوالوں کا راہ نما جانتا ہوں، اور بیباک تنقید کرنے میں انھیں یکتا مانتا ہوں۔ ان کے بارے میں میری یہ رائے برسوں پہلے کی ہے، جس میں آج تک مجھے ترمیم کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی ہے۔ مگر اپنی اس رائے کو دوسروں سے منوانے کے لئے لازم ہے کہ اس کے شواہد پیش کروں۔ اور شواہد تلاش کرنے کے لئے ان کے تمام مقالات کا از سر نو مطالعہ کروں۔ بحالات موجودہ یہ کام مجھ سے بن آتا معلوم نہیں ہوتا۔ اور یہ میرا دل نہیں مانتا کہ صرف دفع الوقتی انداز کا چھوٹا موٹا مضمون پیش کر کے اپنی جان چھڑا لوں۔

لہٰذا، مجھے اجازت دیجئے کہ ان کے لئے یہ دعا کروں کہ پروردگار عالم ان کی عمر دراز

فرمائے تاکہ ان کے علم سے مزید فیض اٹھایا جاسکے۔ اور ملک و قوم میں ان جیسے اور عالم پیدا فرمائے تاکہ ان کی قائم کی ہوئی روایت برابر پھلتی پھولتی رہے۔ آمین

امید ہے کہ مزاج عالی قرین عافیت ہوگا۔ والسلام

مخلص

امتیاز علی عرشی

یوسف حسین خان

قاضی عبدالودود

قاضی صاحب سے میری پہلی ملاقات ۱۹۲۶ء میں پیرس میں ہوئی تھی۔ وہ کیمبرج سے اکثر پیرس آتے رہتے تھے اور میں ۱۹۲۶ء میں ساربون یونیورسٹی میں شریک ہو گیا تھا۔ ریسانی یہیں افتخار علی کی دکان تھی جہاں وہ بنارسی زربفت اور کمخواب ہندوستان سے منگا کر پیرس کی ایکٹرسوں اور رقاصاؤں کو فروخت کیا کرتے تھے۔ ان کی دکان پر انگلستان سے آنے والے اور پیرس میں رہنے والے ہندوستانی طالب علموں کا اڈا بن گیا تھا۔ قاضی صاحب سے وہیں میری پہلی مرتبہ ملاقات ہوئی۔ پھر جب کبھی وہ کیمبرج سے پیرس آتے تو کبھی کبھی کھانا ساتھ ہوتا اور اکثر اوقات کسی قہوہ خانے میں گھنٹوں گفتگو کا موقع ملتا۔ قاضی صاحب فرانسیسی ادب سے براہ راست لطف اندوز ہوتے تھے۔ ڈراما نگاروں میں پورت رِش ژاں کاکتو، فرانسوا موریاک اور میٹرلنک کی تخلیقات کے متعلق گفتگو رہتی تھی۔ فرانس میں اسی زمانے میں سرریلی ازم کی تحریک اندرے بریتوں نے شروع کی تھی اور اس کا ہر طرف ادبی حلقوں میں چرچا تھا۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ یہ تحریک تحت شعور کو بڑی اہمیت دیتی تھی۔ اس لئے قاضی صاحب کو اس سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ وہ تعقل پسند ادیبوں کو سراہتے تھے اور خاص کر اناتول فرانس انھیں پسند تھا۔ فرانسیسی نقادوں میں وہ سینٹ بووکی عظمت کو مانتے تھے جس نے انیسویں صدی کے وسط میں ادبی تنقید کے جو اصول پیش کئے ان میں نفسیاتی تجزیے کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ اس نے اس بات پر زور دیا کہ نقاد کا فرض ہے کہ وہ انسانوں کو ان کی اصلی حالت میں

دیکھے، ان کی زندگی کے مختلف رنگوں کا ٹھیک ٹھیک مطالعہ کرے اور پھر بلا کم و کاست اپنی رائے ایک غیر جانبدار محقق کی حیثیت سے قائم کرے۔ جب وہ اپنی رائے پیش کرے تو زور ہے کہ کم سے کم لفظوں میں زیادہ سے زیادہ مطالب سمیٹ لے۔ میں سمجھتا ہوں قاضی صاحب نے اپنی تنقیدوں میں انشا پردازی کے بجائے لفظوں اور مطالب کی صحت اور کفایت کا جو التزام کیا وہ سینت بوو کی تحروں کے زیر اثر ہے۔ انہوں نے بعد میں بھی مجھ سے کئی مرتبہ کہا کہ فرانسیسی تنقید کے اصول انہیں بہت پسند ہیں۔ اس کا امکان ہے کہ انھوں نے غیر شعوری طور پر اپنی تنقیدوں میں ان اصول کا تتبع کیا ہو۔

میں نے تقریباً دس سال قبل "یادوں کی دنیا" میں قاضی صاحب کے متعلق جو لکھا تھا اس میں مجھے کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا۔

"انگلستان میں جو ہندوستانی طالب علم تھے ان میں سے بعض چھٹیاں گذارنے پیرس آجاتے تھے۔ چنانچہ اس طرح ان سے ملنے کا موقع ملتا تھا۔ قاضی عبدالودود بڑی پابندی سے پیرس آتے تھے۔ کیمبرج میں ان کا مضمون معاشیات اور سیاسیات تھا لیکن یورپین ادب سے انھیں خاص لگاؤ تھا، خاص کر فرانسیسی ادب سے۔ ان سے گھنٹوں ادبی اور سیاسی مسائل پر گفتگو رہتی تھی۔ انہوں نے اپنے سوئٹزرلینڈ کے قیام کے دوران میں، جہاں وہ علاج کے لئے گئے تھے، فرانسیسی اچھی خاصی سیکھ لی تھی۔ براہ راست فرانسیسی ناول اور ڈرامے پڑھ سکتے تھے۔ ادب سے دلچسپی ہم دونوں میں قدر مشترک تھی۔ اس لئے اچھی نبھتی تھی۔ ہندوستان آکر انہوں نے فارسی اور اردو ادب میں جو تحقیق کی اس کا معیار نہایت بلند ہے۔ وہ ہمیشہ سے صداقت پسند، صاف گو اور کھرے انسان رہے ہیں۔ جس سے ملتے ہیں خلوص سے ملتے ہیں جس طرح روزمرہ کی زندگی میں صداقت کے قائل ہیں، اسی طرح لٹریچر میں بھی ان کا نصب العین صداقت ہے۔ اس لئے اپنی بے لاگ تنقید میں کسی کی لگا لپٹی نہیں رکھتے۔ ان کی تنقید کا معیار یورپ اور امریکہ کے ادبی

نقادوں کے معیار سے کسی طرح کم نہیں ہے۔"

قاضی صاحب نے اردو میں تحقیق کو ایک باضابطہ شعبہ بنایا ہے اور اسے نہ صرف تنقید سے ممیز بلکہ ممتاز بھی کر دیا ہے۔ انہوں نے اپنے عالمانہ مضامین سے یہ ثابت کر دیا کہ تنقید میں صحیح نتائج کا استخراج کرنے کے لیے تحقیق کے اصول کی پیروی کرنا قطعی طور پر ضروری ہے۔ قاضی صاحب نے یہ بتایا کہ بعض شعرا سے منسوب دواوین ان کے نہیں ہیں یا ان سے منسوب کتابوں میں کثرت سے الحاق ہوا ہے۔ ظاہر ہے کہ جعلی تصانیف یا الحاقی کلام کی بنا پر تنقید کے جو نتائج بھی برآمد ہوں گے وہ بے سر و پا ہوں گے اور ان پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ اس طرح قاضی صاحب کا یہ کارنامہ ہے کہ انہوں نے تحقیق اور تنقید کو ایک دوسرے سے وابستہ کر دیا۔ اس کی مثالیں دوسری زبانوں میں بھی کم ملیں گی۔

ہندوستان میں عام طور پر چھپے ہوئے لفظ کو خواہ مخواہ سند کا درجہ حاصل رہا ہے اور علمی ادارے کے نقادوں اور مضمون نگاروں کا بھی یہ رویہ رہا ہے کہ وہ قدما کی تصانیف کو تنقید سے بالاتر خیال کرتے ہیں۔ اس صدی کے ربع دوم تک بھی کسی کو یہ جرأت نہیں تھی کہ قدما کی کتابوں کے بیانات پر جرح کرے یا ان کے پایۂ استناد کو مشکوک سمجھے۔ اس ضمن میں قاضی صاحب نے بڑی جرأت سے بت شکنی کے فرائض کو انجام دیا اور تحقیق کی راہ میں قدم رکھنے والوں کو ایک نئی تنقیدی بصیرت عطا کی جس سے واقعات کی صحت اور صداقت تک پہنچنا آسان ہو گیا۔ اس سلسلے میں انہوں نے کسی مورخ، تذکرہ نگار، محقق یا نقاد کو جرح اور تنقید سے نہیں چھوڑا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پچھلے تیس چالیس سالوں میں قاضی صاحب کی تحریروں کی وجہ سے اردو میں نہ صرف تحقیق کا رجحان بڑھا، معیار بلند ہوا بلکہ اس کے ساتھ لکھنے والوں میں شعوری طور پر احتیاط کا مادہ پیدا ہوا۔ سینٹ بودکی تنقید کی طرح قاضی صاحب کی تنقید وں سے علمی دیانت، ذمہ داری اور صحیح نتائج کے استخراج کی طرف رہنمائی

لکھنے والے متوجہ ہوتے۔ قاضی صاحب نے نتائج کے منطقی استخراج پر اس طرح زور دیا کہ اصل واقعات
سے وہ خود بخود برآمد ہوں، لکھنے والے کو انہیں پیدا کرنے کی کوشش نہ کرنی پڑے۔

قاضی صاحب کی تنقید و تحقیق کا اسلوب سینٹ بود کے طرز تحریر سے بہت کچھ ملتا جلتا ہے۔
وہ غیر ضروری لفاظی اور انشا پردازی کو تنقید و تحقیق کا عیب سمجھتے ہیں۔ اس ضمن میں سینٹ بوؔ
کی طرح ان کا نظریہ یہ ہے کہ کسی لفظ کا بے جا صرف نہ ہو اور جہاں منطقی طور پر جس لفظ کے
استعمال کا اقتضا ہے وہی وہاں استعمال کیا جائے۔ وہ اپنے نتائج کے استخراج میں بیحد محتاط
ہیں اسی وجہ سے ان کی تحریروں میں اس طرح کے الفاظ کثرت سے آتے ہیں جیسے، قیاس
ہے کہ، قوی امکان ہے کہ، قوی قرائن ہیں کہ، بظاہر یا لازمی طور پر، یا قریب بصحت ہے۔
قاضی صاحب کی بیشتر تحریروں کے مخاطب عالم لوگ ہوتے ہیں۔ قاضی صاحب کے اسلوب
کا یہ بڑا فائدہ ہے کہ کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ مواد پیش کر دیا جاتا ہے۔ یہی مواد
اگر دوسرے پیش کریں تو قاضی صاحب کی عبارت کا ایک صفحہ ان کے تین چار صفحوں میں آئے گا۔

قاضی صاحب کا مشرقی اور مغربی ادب کا مطالعہ بہت وسیع ہے اور حافظہ بھی غیر
معمولی ہے۔ یہ دونوں خوبیاں تحقیق کے لیے بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔ اپنے مطالعے کی وسعت کے
تناسب سے انھوں نے بہت کم لکھا ہے لیکن انھوں نے کیا اور کتنا لکھا ہے اس سے زیادہ اہم یہ
ہے کہ انھوں نے کیسے لکھا ہے۔ ان کی تحریروں نے ہماری تحقیق اور تنقید کو نئی سمت و جہت سے
روشناس کیا ہے۔ مشرقی مخطوطات سے اتنی کثرت سے استفادہ بھی ان سے پہلے کسی نے نہیں کیا۔ انھوں
نے صرف بڑے اور مشہور کتب خانوں کے ذخیروں ہی سے استفادہ نہیں کیا بلکہ چھوٹے
شہروں کے گمنام ذخیروں کو بھی جا کر کھنگالا اور ریسرچ کا عام رجحان پیدا کرنے میں مدد دی۔
غرضکہ فارسی اور اردو کی تحقیق و تنقید میں انھوں نے جو خدمات انجام دی ہیں انھیں کبھی فراموش

نہیں کیا جاسکتا۔

ترتیب وتدوین

۱۔ دیوان جوشش عظیم آبادی (انجمن ترقی اردو)

۲۔ تذکرۂ شعرا مصنفہ ابن امین اللہ طوفان

۳۔ عیارستان (تین کتابوں پر مفصل تبصرے)۔ میر تقی میر، حیات اور شاعری خواجہ احمد فاروقی۔ دیوان فائز دہلوی، مرتبہ مسعود حسن رضوی۔ مرقع شعرا، مرتبہ رام بابو سکسینہ۔

۴۔ قطعات دلدار۔ دلدار بیگ دلدار۔ بہار کے قدیم اردو شاعر کا کلام

۵۔ شہر آشوب قلق

۶۔ اشتر و سوزن (دو کتابوں پر محققانہ تبصرے۔ عمدہ منتخبہ یا تذکرہ سرور شائع کردہ دہلی یونیورسٹی اور شاد کی کہانی شاد کی زبانی)

۷۔ قاطع برہان و رسائل متعلقہ

۸۔ کلیات نظم غالب (زیر طبع)

۹۔ خطبۂ افتتاحیہ بین الاقوامی غالب سمینار۔ اس میں غالب کے متعلق تحقیق و تنقید کا نچوڑ پیش کیا ہے۔ اس میں غالب بحیثیت محقق و نقاد بحث کی ہے۔

چند اہم مضامین

۱۔ غالب بحیثیت محقق۔ غالب کی لغت دانی اور برہان قاطع کے مصنف پر اعتراضات کا جائزہ

۲۔ آزاد بحیثیت محقق۔ محمد حسین آزاد کی تصانیف کا محققانہ جائزہ
۳۔ عبدالحق بحیثیت محقق۔ مولوی عبدالحق کی مرتبہ کتابوں پر تنقیدی نظر
۴۔ آثر غالب۔ غالب کے نادر خطوط
۵۔ ہندوستان کی دانشگاہوں میں تحقیق کا جائزہ
۶۔ آوارہ گرد اشعار۔ اردو اور فارسی کے ایسے اشعار کی نشاندہی جو مختلف ماخذوں میں ایک سے زیادہ مصنفوں کی طرف منسوب کئے گئے ہیں۔ قاضی صاحب نے ان کے اصلی مصنف کی بڑے تفحص و کاوش سے نشاندہی کی ہے۔
۷۔ تعیین زمانہ۔ مختلف شاعروں کے زمانۂ ولادت و وفات یا ایسے اہم وقائع جن کا سنہ کتابوں میں متعین نہیں ہے۔ قرائن سے ان کی تعیین۔
۸۔ جہان غالب۔ غالب کی نظم و نثر میں جن اشخاص، کتب یا مقامات کے حوالے ملتے ہیں ان کی تحقیق
۹۔ غالب کے فارسی خطوط (ایک نیا مجموعہ)
۱۰۔ مجموعۂ دہلی اور غالب (مجموعۂ فارسی انڈین نیشنل آرکاوز دہلی)
۱۱۔ بعض فارسی کتابوں کے مستعملہ مفردات و مرکبات۔

ان سب مضامین سے تحقیق کی نئی راہیں کھل گئی ہیں۔ قاضی صاحب سے پہلے اردو زبان کی تحقیق و تنقید انشا پردازانہ، سطحی اور استخراج نتائج میں غیر محتاط تھی۔ قاضی صاحب کی بدولت ہماری زبان کی یہ کوتاہیاں دور ہوئیں اب نئی پیڑھی کا فرض ہے کہ وہ قاضی صاحب کے بتائے ہوئے راستے پر چلے اور حق اور حقیقت کی تلاش اور علمی صداقت کی دائمی جستجو کو اپنا مقصود و منتہا قرار دے۔

قاضی عبدالودود صاحب

۱۹۴۸ء (یا شاید ۱۹۴۷ء) کی بات ہے۔ میں اس زمانے میں اپنے کارِ منصبی کے سلسلے میں اسکندریہ (مصر) میں مقیم تھا۔ مجھے جناب مختار الدین احمد کا، جو ان دنوں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں طالبعلم تھے، خط ملا کہ ہم علی گڑھ میگزین کا غالب نمبر شائع کرنا چاہتے ہیں، اس کے لیے ایک مضمون دیجیے۔ ہم ایک دوسرے کو نہیں جانتے تھے، نہ اس سے پہلے ہماری باہمی خط کتابت ہی تھی۔ شاید اسی سے انھیں اندیشہ ہوا کہ ممکن ہے، میں ان کے خط پر توجہ نہ کروں، اس لیے انھوں نے اپنے مکتوب کے ساتھ مولانا امتیاز علی خاں عرشی مدظلہ کا ایک سفارشی خط بھی بھیجا تھا، جس میں موصوف نے مجھے اس خاص نمبر کے لیے مضمون لکھنے کی ہدایت کی تھی۔

جناب مختار الدین احمد نے اپنی کارگزاری دکھانے اور غالباً مجھے ترغیب دلانے کو اپنے خط کے ساتھ علی گڑھ میگزین کا اس سے پہلے کا شمارہ بھی بھیجا تھا، جو انہیں کی ادارت میں شائع ہوا تھا۔ اس ضخامت میں منجملہ اور مضامین کے قبلہ قاضی عبدالودود مدظلہ کا بھی ایک مضمون شامل تھا "غالب کی راست گفتاری"۔ میں کوئی نو دس برس سے ہندستان سے باہر تھا، چونکہ وہاں اردو کے رسائل و جرائد نہیں جاتے تھے۔ اس لیے مجھے اس سے پہلے ان کا کوئی مضمون دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ ان کا یہ پہلا مضمون ہے، جو میری نظر سے گزرا

جن اصحاب نے یہ مضمون دیکھا ہے، انہیں معلوم ہے کہ اس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش

کی گئی ہے کہ غالب راست گوئی کے زیادہ پابند نہیں تھے، اور انہیں ضرورت پڑنے پر دروغ بافی سے بھی دریغ نہیں تھا۔ مجھے یہ مضمون پسند نہ آیا۔ خطائے بزرگان گرفتن خطا است کے مقولے سے قطع نظر میری سمجھ میں نہ آیا کہ آخر اس مضمون کی اشاعت سے علم وادب کی کونسی خدمت ہوئی، یا غالب کی شاعرانہ عظمت کس طرح کم ہوگئی؟ چنانچہ میں نے جب مختار الدین احمد صاحب کے خط کا جواب دیا، تو میگزین کے لیے مضمون کے وعدے کے ساتھ اس مضمون (غالب کی راست گفتاری) کی اشاعت پر احتجاج بھی کیا۔ غالباً یہ تھا میرا پہلا تعارف جناب قاضی صاحب قبلہ سے، یعنی غائبانہ تعارف۔ اس کے کچھ دن بعد ہی میری ان سے خط کتابت شروع ہوگئی۔ موصوف طویل خط لکھنے کے عادی نہیں۔ اگر کوئی بات ایک جملے میں کہی جاسکتی ہے، تو وہ اس کی جگہ دو جملے نہیں لکھیں گے، اور اگر کسی جملے میں پانچ لفظوں سے ان کا مافی الضمیر ادا ہوسکتا ہے، تو وہ چھ لفظ بھی استعمال نہیں کریں گے۔ بہت بعد کی بات ہے کہ انھوں نے ایک مرتبہ گفتگو کے دوران میں بتایا تھا کہ میں نے مدتوں مختصر نویسی کی باقاعدہ کوشش کی ہے، اور طویل مشق کے بعد میں اس پر قادر ہوا ہوں کہ کم سے کم الفاظ میں اپنا مدعا بیان کردوں۔ "قلّ و دلّ" کی یہ خصوصیت ان کے مضامین کا بھی طرۂ امتیاز ہے۔ بعض اصحاب ان کی مختصر نویسی پر جز بز ہوتے ہیں اور شکایت کرتے ہیں کہ ان کے مضمون کا پڑھنا مجاہدے سے کم نہیں ہے۔ یہ حضرات بھول جاتے ہیں کہ وہ کوئی ادبی انشائیہ نہیں، بلکہ تحقیقی مضمون پڑھ رہے ہیں؛ اس میں تحریر کی رنگینی اور بیجا طول کلامی، نہ صرف اس کی خوبی نہیں شمار کی جائیگی، بلکہ یقیناً یہ قاری کی توجہ مضمون کے اصلی موضوع سے ہٹانے کا باعث ثابت ہوگی، اور اسی لیے مضمون اپنے مقصد میں ناکام خیال کیا جائیگا۔

جناب قاضی صاحب کے مضامین کے "خشک" اور "غیر دلچسپ" ہونے کی شکایت

خود ان تک بھی پہنچی ہے، اور وہ جانتے ہیں کہ لوگ ان کے اسلوب تحریر کے شائق ہیں۔ لیکن ان کا قول ہے کہ یہ دوسرے لوگوں کا فرض ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس طرح کے مضمون پڑھنے کا عادی بنائیں، نہ کہ وہ مجھ سے اس کی توقع کریں کہ میں ان کی خاطر اپنی روش ترک کر دوں جب کہ میں اسے صحیح خیال کرتا ہوں۔ ایک اور موقع پر انھوں نے یہ بھی کہا کہ میں ہندستان اور پاکستان کے لے دے کے کوئی دس آدمیوں کے لیے مضمون لکھتا ہوں۔ میں نے اس کی وضاحت تو نہیں پوچھی لیکن غالباً اس سے ان کی مراد یہ تھی کہ میرے مضمونوں سے صحیح طور پر استفادہ کرنے والے دس آدمی ہیں۔

میں ۱۹۵۲ء کے اوائل میں عارضی رخصت پر ہندستان آیا تھا۔ یہاں دلی میں میرا کوئی تین مہینے قیام رہا۔ لیکن مجھے یاد نہیں آتا کہ کیا وہ اس زمانے میں پٹنے سے دلی تشریف لائے تھے یا نہیں، اور کیا ہماری ملاقات بھی ہوئی تھی! البتہ اس کا یقین ہے کہ تین سال بعد جب ۱۹۵۵ء میں میرا مستقل تبادلہ دلی ہو گیا، اور اب کے میں ۱۹۵۸ء تک یہاں مقیم رہا، تو اس دوران میں ان سے متعدد ملاقاتیں ہوئیں، اور رفتہ رفتہ آپس کے تعلقات بھی گہرے ہوتے گئے۔

اس دور میں وہ یہاں اپنے کیمبرج کے زمانے کے قدیم دوست نورالدین احمد بیرسٹر مرحوم کے ہاں ٹھہرا کرتے تھے۔ ان کے آنے کی اطلاع ہوئی، تو میں وہیں ان کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔

ان کی حیثیت فرد سے زیادہ ایک ادارے کی ہے۔ فرصت کے اوقات میں آپ انھیں بہت کم اکیلا پائیں گے، ہمیشہ دو چار ملنے والے موجود ملیں گے۔ یونیورسٹی کے مدرس، طلبہ، اہلِ قلم، اخبار نویس ــــ غرض علمی دنیا کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے حضرات آتے رہتے ہیں۔ کوئی اس غرض سے آتا ہے کہ اسے کسی مسئلے کے بارے میں کچھ دریافت کرنا

ہے، کوئی اپنے مقالے یا مضمون کے لیے مآخذ کی فہرست تیار کرنا چاہتا ہے، بعض حضرات صرف ان کی علمی شہرت کے باعث ان سے ملنے اور عمومی استفادے کی غرض سے چلے آتے ہیں۔

تحریر کی طرح، ان کی گفتگو بھی رطب و یابس سے مبرا ہوتی ہے۔ جس بات کا انھیں یقین نہیں، یا جس سے متعلق انھوں نے تحقیق نہیں کی، اسے وہ ہمیشہ مشروط طور پر بیان کریں گے، اور قطعیت سے اجتناب کرینگے۔ بلکہ اب تو ان کی یہ عادت اتنی راسخ ہو چکی ہے کہ یہ علمی اور تحقیقی مسائل ہی تک محدود نہیں رہ گئی، وہ روزمرہ کی زندگی کے واقعات کے بیان میں بھی اسی پر عمل پیرا ہیں۔

ممکن ہے، پہلی ملاقات میں آپ کو کچھ مایوسی بھی ہو کیونکہ وہ، روش عام کے خلاف غیر ضروری اور بے مقصد باتیں کرنے کے عادی نہیں۔ ان کی کم گوئی سے بعض لوگوں کو ان کی طبیعت کی خشونت کا گمان ہوتا ہے، بلکہ مختصر یا دو ٹوک جواب سے نیا اور ناواقف آدمی بعض اوقات بدک جاتا ہے۔ اسے یہ شبہہ ہوتا ہے، گویا وہ مخاطب کو زیادہ بات چیت سے منع کر رہے ہیں، اور پسند نہیں کرتے کہ گفتگو طویل ہو۔ لیکن یہ خیال کسی عنوان ٹھیک نہیں ہوگا۔ بات صرف اتنی ہے کہ وہ اپنی مدت العمر کی عادت سے مجبور، سائل کی مطلوبہ معلومات مہیا کر دینے کے بعد، مزید کچھ کہنے سے اجتناب کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک ان کا جواب مکمل ہے اور چاہیے کہ سائل اس سے مطمئن ہو جائے۔ اگر آپ ان کا یہ ابتدائی لیے دیے رہنے کا انداز انگیز کر گئے، اور بھاگ نہ کھڑے ہوئے، تو آپ کو بتدریج معلوم ہوگا کہ وہ کتنے دلچسپ "باتونی" ہیں۔

غرض آپ ان کے پاس بیٹھیے، گفتگو لازماً کسی علمی موضوع سے متعلق ہوگی۔ ان کا حافظہ بہت قوی ہے، جو کچھ پڑھا ہے، اس کا بیشتر حصہ دماغ میں محفوظ و مستحضر ہے۔

حوالا دے دیتے ہیں، اور اس میں غلطی کا امکان بہت کم ہوتا ہے۔ بہت دن کی بات ہے، ایک مرتبہ مزوبتا میں نے دریافت کیا کہ یہ شعر کس کا ہے۔

حاصلِ عمر نثارِ رہِ یارے کردم

شادم از زندگیِ خویش کہ کارے کردم

بلا توقف فرمایا کہ تحفۂ سامی دیکھیے۔ چنانچہ میں نے تذکرہ دیکھا۔ تو معلوم ہوا کہ شعر سام میرزا کا ہے۔ اسی طرح کئی اور مواقع پر بھی ان کے حافظے نے حلِ مشکلات میں مدد کی۔ غرض جب کوئی شخص ان سے ملنے کے بعد واپس آتا ہے، تو محسوس کرتا ہے کہ وہ ان سے کچھ نہ کچھ حاصل کر کے لوٹا ہے۔ اور یہ بہت بڑی بات ہے۔

ان کا مطالعہ بہت وسیع اور متنوع رہا ہے۔ علمی مذاق انھیں ورثے میں ملا تھا۔ ان کی ابتدائی تعلیم میں فارسی اور عربی پر خاص توجہ دی گئی تھی، بلکہ شروع میں انھوں نے قرآن بھی حفظ کیا تھا جسے بعد کے زمانے میں عدمِ فراوانی کے سبب وہ بھول گئے، یہاں تک کہ عربی ہی سے بے تعلق ہو گئے۔ فارسی کا شوق البتہ قائم رہا۔ اور جب تندرستی کی خرابی کے باعث انھوں نے وکالت کا پیشہ ترک کر دیا، تو اس کے بعد اردو اور فارسی ادب کا غائر مطالعہ گویا ان کا اوڑھنا بچھونا بن گیا۔ خوش بختی سے ان کے وطن پٹنے میں خدا بخش لائبریری کا بیش بہا اور بے مثال خزانہ موجود ہی تھا، یہاں کی باقاعدہ حاضری نے نہ صرف ان کے ذوقِ مطالعہ کی تسکین کا سامان مہیا کیا، بلکہ ان کے تحقیق و تجسس کے رجحان پر بھی جلا کی۔

اب کی معلوم نہیں، لیکن کسی زمانے میں ان کا مطالعہ کرنے کا طریقہ یہ تھا کہ وہ ایک کاپی اور قلم ساتھ رکھتے تھے، اور حاصلِ مطالعہ اہم نکات اس کاپی میں درج کرتے جاتے۔ انھوں نے اپنے لیے کچھ اشارے مقرر کر رکھے تھے؛ وہ کتاب کے تمام مطالب انھیں

اشاروں میں قلمبند کر لیتے۔ کوئی اور ان یادداشتوں کو دیکھے، تو ممکن نہیں کہ اس کے کچھ پلّے پڑے۔ اس طرح کی بیسیوں کاپیاں اور جیبی ڈائریاں ان کے پاس پڑی ہیں، جن کے مندرجات انھوں نے آج تک شائع نہیں کیے۔

جیسا کہ سب کو معلوم ہے، شمالی ہند میں اردو ادب کے آغاز اور فروغ کا وہی زمانہ ہے، جو اسلامی سلطنت کے زوال کا تھا۔ اگرچہ یہ حقیقت سب مورخینِ ادبِ اردو کے علم میں ہے، لیکن اس سے جو لازمی نتیجہ نکلنا چاہیے تھا، اسے الّا ماشا اللہ سب نے نظر انداز کر دیا۔ کون نہیں جانتا کہ اس دور میں بیشتر ادیب کسی نہ کسی بادشاہ یا وزیر امیر کے دامن دولت سے وابستہ رہے۔ اور جن کا مرکزی حکومت سے رشتہ استوار نہ ہو سکا، یا ان کے دلی میں قیام کا مناسب انتظام نہ ہو سکا، وہ یہاں سے نکل کر کسی نہ کسی ریاستی دربار کے متوسل ہو گئے۔ اس سے عیاں ہے کہ اس عہد کے ادب کی تاریخ اور ادبا کی سوانح عمری اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی جب تک ہمعصر سیاسی تاریخ کا بھی غائر مطالعہ نہ کیا جائے۔ اسی لئے قاضی عبدالودود صاحب نے ہندستان کے اسلامی عہد کی تاریخ کا عمومی، اور خاندانِ مغلیہ کے آخری دور کا خصوصی مطالعہ کیا، جس سے وہ اس عہد کی بیشتر اہم تاریخی شخصیتوں کے نسب ناموں، سوانح حیات، نقل و حرکت اور سنین، اور مختلف ادبا اور شعرا کے ان سے مراسم و تعلقات وغیرہ کے کوائف پر حاوی ہو گئے۔ ان کا ایک مشہور سلسلہ "مضامین "تعینِ زمانہ" ان کے اسی تاریخی مطالعے کا ثمرہ ہے۔

وہ یورپی زبانوں میں انگریزی کے علاوہ فرانسیسی بھی جانتے ہیں۔ اب تو شاید اس سے مزاولت نہیں رہی، کسی زمانے میں انھوں نے فرانسیسی ادب کا بھی خاصا مطالعہ کیا تھا، اسی لئے وہ کلاسیکی فرانسیسی ادب سے خوب واقف ہیں۔ ممکن ہے آپ کو یہ سن کر تعجب ہو کہ وہ آج تک انگریزی کے جاسوسی اور سنسنی خیز، بلکہ تشدد اور مار دھاڑ کے

ناول پڑھتے رہتے ہیں۔

افسوس کہ انھوں نے اپنی طویل تصنیفی زندگی میں کسی موضوع پر مستقل کتاب نہیں لکھی۔ لیکن انھوں نے جو سیکڑوں مقالے ہمیں دیے ہیں ان میں سے ہر ایک کسی نہ کسی پہلو سے معلومات افزا ہے۔ بعض موضوعات ایسے ہیں، جن پر انھوں نے متعدد مقالے قلمبند کیے ہیں مثلاً میر، انشا، سودا، مصحفی، گارسیں دتاسی کے بارے میں ان کے اتنے مضمون ہیں کہ اگر انہیں الگ الگ سلسلے وار جمع کیا جائے، تو ہر ایک سے متعلق ایک کتاب بن جائے۔ بعض مقالے بجائے خود اتنے مفصل اور طویل ہیں کہ وہ ایک کتاب سے کم نہیں مثلاً "غالب بحیثیت محقق"

قاضی عبدالودود صاحب نے ہمارے طلبہ واساتذہ و مصنفین کی دو تین نسلوں کو متاثر کیا ہے ـــــ مثبت طور پر بھی اور منفی طور پر بھی۔ ان کا مثبت کارنامہ یہ ہے کہ ہمارے وہ مصنف جنہیں تحقیقی کام کا شوق تھا، بیحد محتاط ہو گئے۔ انھوں نے موصوف کی متواتر چشم نمائی پر اصلی مراجع سے استفادے کی عادت اختیار کی اور استنباط و استخراج نتائج میں سہل انگاری کا رویہ ترک کر دیا۔ اس طریقہ کار نے نہ صرف ان حضرات کی تصنیفات کو زیادہ قابلِ اعتماد بنا دیا، بلکہ خود ان کے اپنے علمی وقار میں بھی اضافہ ہوا۔ اور اس سے بھی بڑا فائدہ یہ ہوا کہ ان کے طلبہ اور شاگردوں نے بھی ان کے اتباع میں یہی روش اختیار کی۔ ان شاء اللہ اس کے مفید نتائج مستقبل میں بھی نکلتے رہینگے۔

قاضی صاحب قبلہ کی عمر اب ۸۰ سے متجاوز ہے۔ پار سال (۱۹۷۵ء) میرے دریافت کرنے پر انھوں نے بتایا تھا کہ بعض قرائن سے مجھے یقین ہو گیا ہے کہ میری ولادت ۱۸۹۵ء کی ہے، لہٰذا اب وہ ۸۱ پورے کرنے والے ہونگے۔ ادھر ان کی صحت خراب رہنے لگی ہے۔ لیکن چوری چوری سے جائے، ہیرا پھیری سے نہیں جا

سکتا۔ اب بھی موقع ملتا ہے، تو گاڑی میں بیٹھ کر خدا بخش لائبریری کا پھیرا کر آتے ہیں۔ حافظہ اگرچہ پہلے کا سا نہیں رہا، لیکن اب بھی قابلِ اعتماد ہے۔ دل سے دعا نکلتی ہے کہ علم و ادب کی یہ تابناک شمع تا دیر رہروانِ کوچۂ ادب کو روشنی دکھاتی رہے۔
آمین!

ایک قاموسی شخصیت

قاضی عبدالودود ہمارے دور میں حق گوئی اور بے باکی کا دوسرا نام ہے۔ مصلحت پرستی کے دور میں سچ بولنے اور سچ لکھنے کی ہمت کرنا ان کا کارنامہ اور روایت اور تعصبات کے پردے میں چھپی ہوئی صداقتوں کے چہرے سے نقاب الٹنا ان کا محبوب مشغلہ ہے جسے نہ وہ شہرت کی خاطر کرتے ہیں نہ ادب میں عزت پانے کے لئے بلکہ یہی وہ طرز زندگی ہے جس سے وہ واقف ہیں۔ انسان جھوٹ کیوں بولتا ہے اور اس کے اسباب و محرکات کیا ہوتے ہیں؟ یہ سوال انہیں بہ یک وقت علمی تحقیق اور جاسوسی ناولوں کی طرف لے گیا۔

قاضی عبدالودود اردو ادب کا سب سے پراسرار معمہ ہیں۔ پٹنہ کے قاضیوں کے قابل احترام خاندان میں پیدا ہونے والے ایک نوجوان نے یورپ کی بہترین درسگاہوں سے اقتصادیات اور قانون کی تعلیم حاصل کی۔ بہار کی سیاسی زندگی میں بابو راجندر پرساد کے شانہ بہ شانہ کام کیا۔ تحریک خلافت میں سرگرم رہے۔ کیمبرج میں صدر جمہوریہ فخرالدین علی احمد صاحب اور نورالدین احمد دہلوی مرحوم کے رفیق و جلیس رہے اور نام کمایا اور عزت پائی تو اقتصادیات، قانون یا سیاست میں نہیں بلکہ علمی تحقیق میں اور وہ بھی ایسی کہ ایسا جامع الکمال شخص ابوالفضل کے بعد شاید ہی ہندوستان نے پیدا کیا ہو۔ ایک طرف عربی اور قدیم پہلوی ادب کا ایک ایک ورق آئینہ ہے تو دوسری طرف لاطینی سے دلچسپی، فرانسیسی پر قدرت، اور انگریزی ادب کے رموز و اسرار سے آگہی، قانون، فلسفہ، اقتصادیات اور اخلاقیات کا گہرا مطالعہ لیکن اس

اس تجربے کے ساتھ جس حق گوئی کو قاضی صاحب نے اپنایا اس نے انھیں اس دور کا ماجرا بنا دیا ہے جس پر کھلی آنکھوں کبھی بہت کم لوگوں کو یقین آتے گا۔

قاضی صاحب کے نجی لغت میں مصلحت کا لفظ موجود نہیں ہے انسان جن جرائم کا مرتکب ہو سکتا ہے ان میں سب سے شدید جرم منافقت ہے اور قاضی صاحب اسی جرم سے بچنے کے لئے زندگی کو آزادانہ گزارتے آئے ہیں قاضی عبدالودود دراصل ایک شخص کا نام نہیں ایک طرز زندگی کا نام ہے اور یہ طرز زندگی ایسے منافق سماج اور مصلحت پرست ماحول میں بسر ہو رہا ہے جہاں سچائی کا اظہار سب سے بڑا جرم رہا ہے۔ ماحول اور شخصیت کا یہی تضاد قاضی صاحب کی عظمت کا راز ہے۔ قاضی صاحب ان لوگوں میں سے ہیں جو انسانی زندگی کو ایک نظام یا ضابطے کے تحت دیکھنا سمجھنا اور پرکھنا چاہتے ہیں ذہن، شخصیت اور جذبے کی تنظیم و ترتیب ان کے نزدیک علم کی بنیاد ہے اور اس ترتیب کو وہ اصول اور ضابطے کے ماتحت دیکھنا چاہتے ہیں وہ انسانی زندگی کو محض اتفاقات کا مجموعہ سمجھ لینے پر آمادہ نہیں وہ اس کے پیچھے کارفرما اصول دریافت کرنا چاہتے ہیں اور ایک بار یہ فارمولا ہاتھ آجائے تو پھر اسی کا پوری دیانت داری اور غیر جانبداری سے انطباق کرتے ہیں اور اسی وجہ سے منافقت اور مصلحت کا پرستار سماج بار بار انھیں غلط سمجھتا ہے انھیں عیب بین اور نکتہ چیں جانتا ہے یہ نہیں جانتا کہ قاضی صاحب کے مضامین میں یہ اتنا اہم نہیں ہے کہ وہ کس کے خلاف لکھے گئے ہیں بلکہ یہ اہم ہے کہ ان میں کیا لکھا گیا ہے اور دوران تحریر وہ کونسے رموز واسرار آگئے ہیں جن کے لئے تحقیق ایک عرصے سے ترستی تھی تذکرہ ابن طوفان۔ آوارہ گرد اشعار اور جہان غالب جیسی تحریروں کے علاوہ جو قاموسی تبحر کی حیرت انگیز مثالیں ہیں عبدالحق بحیثیت محقق۔ آب حیات کا تنقیدی جائزہ یا میر: حیات اور شاعری۔ فائز دہلوی۔ لکھنؤ کا دبستان شاعری اور بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا

جیسے مضامین ہیں جن میں نکتہ چینی کی لے تیز ہے اس قسم کی معلومات کے نایاب خزینے بکھرے ہوئے ہیں مثلاً میر کے بارے میں آب حیات کی ایک روایت ہے کہ انھوں نے اہل لکھنؤ کو شعر سنانے میں تامل کیا تھا اور کہا تھا کہ آپ لوگ جامع مسجد دہلی کی سیڑھیوں کی زبان سے ناواقف ہیں اور یہ شعر سنیں گے

عشق بُرے ہی خیال پڑا ہے چین گیا آرام گیا

تو کتابی زبان کے عادی ہونے کی بنا پر کہیں گے کہ اس میں خیال کی 'ی' دبتی ہے اب اس روایت کو غلط ثابت کرنے کے لئے قاضی صاحب نے دیگر دلیلوں کے ساتھ یہ دلیل بھی دی ہے کہ میر نے اپنے ضخیم کلیات میں 'خیال' کا لفظ جہاں بھی استعمال کیا ہے وہاں 'ی' دبی نہیں ہے اس لئے اس روایت میں خیال کی 'ی' دبنے کو بازقرار دینے کا جواز موجود نہیں۔ جن حضرات کو تحقیق سے شغف ہے انھیں اندازہ ہوگا کہ جو باتیں قاضی صاحب کے لئے معمولی اور سرسری ہیں وہ کتنا مطالعہ کیسی دیدہ ریزی کیسی جاں کاہ تلاش چاہتی ہیں۔

قاضی عبدالودود کے تحقیقی مضامین حقائق کی کھتونی نہیں ہیں محض معلومات کی فراہمی بہت اہم ہوتے ہوئے بھی ان کے کارناموں کا محض ایک حصہ ہے قاضی صاحب نے اردو تحقیق کو ترتیب مقدمات اور فکر کی تنظیم سکھائی ہے اکثر ایسا ہوتا ہے کہ معلومات کے مختلف ٹکڑے الگ الگ علم میں ہوتے ہیں اور یادداشت کے کسی کونے میں پڑے رہتے ہیں لیکن ان کو یکجا کر کے ان سے نہ تو ترتیب مقدمات میں کام لیا جاتا ہے یا نتائج اخذ کرتے وقت مدد لی جاتی ہے جہاں تک یادداشت کا سوال ہے اور ذہن کو بیدار رکھنے کا سوال ہے صرف ایک مثال کافی ہے مولانا محمد حسین آزاد کی شہرۂ آفاق تصنیف 'آب حیات' ایک مدت سے اہل نظر کے مطالعے میں رہی ہے لیکن قاضی صاحب سے پہلے کسی نے اس طرف توجہ بھی نہیں کی کہ آزاد نے ایک ہی شعر آب حیات کے ایک صفحے پر ایک شاعر سے منسوب کیا ہے اور چند

صفحات کے بعد یہی شعر دوسرے شاعر کی تصنیف بتایا ہے۔ یا پھر سودا کی تاریخ وفات ۱۱۹۵ ہجری سبھی کو معلوم ہے اور میر ضاحک کے بارے میں اتنی بات معلوم ہے کہ ان کا انتقال سودا کے بعد ہوا پھر بھی آب حیات کی یہ روایت برابر نقل ہوتی چلی آ رہی ہے کہ میر ضاحک کے انتقال کے بعد ان کے فرزند میر حسن سودا کے پاس گئے اور ان سے درخواست کی کہ میر ضاحک کے خلاف اپنی ہجویات چاک کر ڈالیں اور خود میر ضاحک کی وہ ہجویات چاک کر ڈالیں جو سودا کے خلاف لکھی گئی تھیں جب ضاحک کا انتقال سودا کے بعد ہوا تو اس قسم کی روایت کا بے بنیاد ثابت ہونا ظاہر ہے۔ سوچنے کے عمل کی بنیادی خصوصیات کے بارے میں لکھا گیا ہے:

"To know the various devices by which a mass of bewildering facts may be reduced to order and system, to discover the trail and follow it to the heart of an unknown region, to command a situation by understanding it, to see the point, to interpret aright what is only implied or suggested, to know where to place the emphasis; to discriminate between what is essential and what is accidental— that is the art of thinking

A study of prejudice by Dr J G Hibben P. 127

قاضی صاحب کی تحقیق کا بنیادی کارنامہ یہی ہے کہ وہ فکر کے اس بنیادی جوہر پر اصرار کرتے ہیں اور مقدمات اور نتائج میں ایک منطقی ربط و ترتیب تلاش کرتے ہیں اور جہاں انھیں یہ ربط نہیں ملتا وہاں بے رحمی سے اس بے ربطی کو بے نقاب کر دیتے ہیں۔ اس کام کے لئے قاضی صاحب نے تحقیق کو محض برتا ہی نہیں بلکہ ان کی تحریروں نے اردو تحقیق کے مبادیات اصول، ضابطے اور طریق کار کے بارے میں تقریباً سبھی مسائل کو پھر سے قابل توجہ بنا دیا ان کی تحریریں نے ادب کے مطالعے میں تحقیق و تدوین کو اہمیت بخشی۔ ادی مجنون گورکھپوری نے اپنے مقالے "میر اور ہم" میں میر کے ہاں تاب مقاومت پر بڑا زور دیا ہے اور اس سلسلے میں سب سے

زیادہ انحصار ان کے اس شعر پر کیا ہے

شکست و فتح نصیبوں سے ہے ولے اے امیر
مقابلہ تو دل ناتواں نے خوب کیا

قاضی صاحب نے ضمنی طور پر اشارہ کیا کہ اس شعر سے کلیات میر خالی ہیں اور یہ شعر کسی قدر مختلف شکل میں دراصل امیر تخلص ایک غیر معروف شاعر کا ہے اس لئے اس شعر کی بنیاد پر میر کے کلام کے بارے میں نتائج اخذ کرنا غیر مناسب ہوگا اسی ایک بات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ادب کے مطالعے اور ادبی تنقید میں تحقیق کی اہمیت کتنی بنیادی ہے جب تک یہ طے نہ ہو جائے کہ جن تحریروں کو سامنے رکھ کر نتائج نکالے جا رہے ہیں ان تحریروں کی اصل شکل کیا ہے اور ان تحریروں کی کتنی خود مصنف کے قلم کی مرہون منت ہیں اس وقت تک تمام ادبی تنقید محض قیاس آرائی ہے اب اگر صحت متن اور تحقیق کی اہمیت اس قدر بنیادی ہے تو لازم ہوگا کہ اس کے بنیادی وسائل اور ذرائع فراہم کئے جائیں اور یہ وسایل و ذرائع مستند اور قابل اعتبار ہوں مختلف وسایل و مآخذ سے حاصل شدہ معلومات کی تدوین و ترتیب اس طرح کی جائے کہ ان سے حاصل کردہ معلومات کے نکات اتفاق و اختلاف واضح ہو جائیں اور اس کام کے لئے محض وسایل و مآخذ کی فراہمی ہی کافی نہیں ہے بلکہ ان سے کام لینے کے اصول و ضوابط متعین ہونے چاہئیں اور ان میں ترجیحات قائم کرنے اور ان سے مناسب منطقی نتائج نکالنے کے اصول وضع کئے جانے چاہئیں۔ قاضی عبدالودود کی تحقیق نے اردو والوں کو پہلی بار ان کاموں کی اہمیت کا احساس دلایا اور تحقیق کو ادبی مطالعے کے طریق کار میں اس کا موزوں مقام بخشا۔ ان امور پر ان کے خیالات معاصر اور آج کل کے تحقیق نمبر میں بارہا سامنے آچکے ہیں۔

قاضی صاحب کی سخت گیری کا شکوہ عام ہے لیکن یہ سخت گیری اردو تحقیق اور اردو کے ادبی مطالعے کے لئے نعمت سے کم نہیں اس نے اردو میں تنقید و تحقیق کا معیار ہی بلند نہیں کیا

بلکہ ہر اہل قلم کو زیادہ احتیاط، زیادہ محنت اور زیادہ علمی دیانت داری کی ضرورت کا احساس کرایا ہے قلم اٹھاتے وقت اب یہ احساس ہوتا ہے کہ ان تحریروں کے ایک ایک لفظ کو پڑھنے والا اور غور کرنے والا اس دور میں موجود ہے جس کی نظر قلم کی ہر لغزش اور فکر کی ہر بے ربطی کا احساب مانگتی ہے جس سے تہی مائگی اور کوتاہ فکری چھپ نہیں سکتی۔

قاضی صاحب انداز بیان کی وضاحت، صراحت، منطقی ربط اور سادگی کے قائل ہیں ان کے نزدیک نثر کا حسن تصنعات پن میں ہے اگر اس میں شاعرانہ آراستگی کو دخل دیا جائے اور خیالی طوطا مینا بنائے جائیں تو یہ نثر کے آئین و آداب کی خلاف ورزی ہے اسی لئے وہ محمد حسین آزاد کے نثری اسلوب کے قائل ہیں نہ ابوالکلام آزاد کے اسلوب کے۔ قاضی صاحب کے نزدیک نثر کا حسن سادگی اور وضاحت میں مضمر ہے جس قدر صفائی، صراحت اور مدلل طریقے پر نثر اپنے مضمون کو ادا کر سکے گی اسی وقت اچھی اور معیاری نثر کہلانے کی مستحق ہو گی اس کے لئے لفظ اور معنی کی قطعیت اور استدلال کے منطقی ربط پر وہ برابر زور دیتے ہیں وہ تمام نثری تحریریں جن میں شعروں کے ٹکڑے کھپائے گئے ہوں اور ان کی مدد سے ایک طلسمی شاعرانہ فضا پیدا کر کے ابہام کا سہارا لیا گیا ہو قاضی صاحب کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتیں لفظوں کے استعمال سے قبل ان کے مفہوم کے تعین اور ان کی جامع و مانع تعریف کی صراحت ان کے نزدیک ضروری ہے لفظ پارے کی طرح بے قرار ہوتے ہیں اور سیاق و سباق کی ذراسی تبدیلی سے یا برتنے والے کی ذراسی غفلت یا ذہنی کاہلی اور تساہل کے بدولت مختلف معنی دینے لگتے ہیں اس کا تدارک یہی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو لفظ کو معنی کے اعتبار سے زیادہ سے زیادہ قطعیت سے برتا جائے دراصل اردو نثر ابھی تک سن بلوغ تک نہیں پہنچا ہے جس قطعیت، منطقی استدلال، صراحت اور واقعیت کا مطالبہ قاضی صاحب اردو نثر سے کرتے ہیں اس کے لئے اردو نثر کو صنعتی انقلاب اور سائنسی تہذیب کی منزلوں سے گزرنا ضروری ہے جن کے بغیر

سائنسی مزاج اور منطقی کردار نصیب ہونا مشکل ہے اتنا ضرور ہوا کہ آج تک اردو تنقید جس باغ و بہار نیم شاعرانہ اسلوب سے آزاد نہیں ہو سکی قاضی عبدالودود کے زیر اثر اردو تحقیق اس آرائشی پیرایۂ اظہار سے آزاد ہو گئی قاضی صاحب نے تو سائنسی قطعیت اور ریاضیاتی صراحت کی خاطر اپنی تحریروں میں علامتیں اور نشانات کا استعمال شروع کیا جو ان کی خاص ایجاد ہے ان کے تحقیقی مضامین محض انداز بیان کے چٹخارے کے لئے نہیں پڑھے جا سکتے بلکہ پڑھنے سے پہلے علامتوں اور نشانات کو پہچان لینا ضروری ہے البتہ ان علامتوں، نشانات، ریاضی کے فارمولوں جیسے مندرجات کے باوجود قاضی صاحب کی تحریروں کی اپنی دلکشی ہے جس میں بات کو سیدھے سادے انداز میں کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ وضاحت، قطعیت اور استدلال کے ساتھ بیان کرنے کا کمال پایا جاتا ہے کہیں کہیں بین السطور میں ان کا حس مزاح اور لطیف طنز بھی جلوہ دکھاتا ہے مثلاً اشتر و سوزن کا دیباچہ اس قسم کے لطیف طنزیہ جملوں سے معمور ہے۔ قاضی صاحب کے اسلوب کے بارے میں ملحوظ رہنا چاہئے کہ وہ ایک عمر کی تحقیق سے حاصل کردہ معلومات کو نہایت سادگی اور اختصار کے ساتھ اس طرح بیان کر دیتے ہیں جیسے یہ پیش پا افتادہ سی بات ہو مثلاً ذکر غالب اشاعت ثانی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

وساتیر ایک جعلی کتاب ہے جو عہد اکبری میں تصنیف ہوئی ہے (تفاصیل کسی دوسرے موقع پر)

اسی طرح آوارہ گرد اشعار کے مصنفین کی نشان دہی میں انھوں نے جو معلومات درجنوں تذکروں اور نایاب ادبی صحیفوں کی ورق گردانی سے حاصل کی ہیں وہ ایک یا آدھی سطر میں اسی سادگی اور قطعیت سے بیان کر دی ہیں یہ بھی ملحوظ رہے کہ ان کی تحریروں میں خواہ وہ کسی کتاب یا مقالے کا تبصرہ ہی کیوں نہ ہوں تحقیقی معلومات ہی بھری ہوئی نہیں ہوتیں بلکہ آداب تحقیق اور انداز بیان کے ضابطے کی جا بجا صراحت ملتی ہے ذکر غالب مرتبہ مالک رام کی طبع ثانی پر تبصرہ کرتے ہوئے اس قسم کے کچھ چند ضابطوں کا انھوں نے ذکر کیا ہے وہ درج ذیل ہیں:-

۱۔ "میرزا غالب ۸ رجب ... کو پیدا ہوئے" ۸ رجب کو مرزا غالب نہیں ایک بچہ عزت النساء بیگم کے بطن سے پیدا ہوا تھا جو تخلص ساتھ لے کر دنیا میں نہیں آیا تھا حالات زندگی کا اس طرح شروع کرنا عہدِ حاضر کی روش نہیں (فٹ نوٹ میں درج ہے کہ "لٹن اسٹراچی کی سیرت وکٹوریا میں یہ دیکھیے کہ وہ وکٹوریا کی پیدائش کا ذکر کس طرح کرتا ہے)

۲ سیرت نگار کو واقعات لازماً تاریخی ترتیب کے ساتھ بیان کرنے چاہئیں

۳ عادت و اخلاق کا ایک خاص باب قائم کیا ہے یہ بھی عہد حاضر کی روش کے خلاف ہے (فٹ نوٹ میں درج ہے "عہد حاضر کی پسندیدہ روش کیا ہے اس کے بارے میں آندرے مورواا اور میرلڈ نکلسن وغیرہ کی تحریریں دیکھئے) واقعات زندگی اس طرح بیان کرنے چاہئیں کہ عادات و اخلاق کا الگ سے ذکر کرنے کی ضرورت نہ ہے

۴ محققین کا قاعدہ ہے کہ اگر کوئی ایسی بات لکھتے ہیں جو عام طور پر معلوم نہیں تو اگر خود ان کی تحقیق ہے تو ماخذ بتاتے ہیں اور کسی ہم عصر کی تحقیق ہے تو اس کا حوالہ دیتے ہیں مصنف ان امور کے لئے بھی جواب محقق ہو گئے ہیں بیشتر حوالے دیتے ہیں۔

۵ ذمہ دار مصنف کسی ایسے امر کی نسبت جسے وہ اچھی طرح نہیں جانتے کچھ کہنے سے گریز کرتے ہیں اور اظہار رائے ناگزیر ہو تو اپنے حدود علم بیان کر دیتے ہیں۔

۶ مصنف کا رویہ غیر جانبدارانہ (ہونا چاہیئے)

یہ اور اس قسم کے متعدد ضابطے اور اصول ان کی تحریروں میں بکھرے ہوئے ہیں وہ بے ربطی اور تساہل کے دشمن ہیں اور اہل قلم سے قطعیت اور ربط اور ضابطہ بندی کی توقع رکھتے ہیں مثلاً ذکر غالب میں عادات و اخلاق کے باب کی ابتدا میں غالب کے حلیے کا ذکر یا فرانسیسی شراب کی فہرست میں اولڈ ٹام کا ذکر جو فرانسیسی نہیں ہے یا دستنبو کے بارے

میں یہ بیان کہ یہ خالص پارسی میں ہے اور ناموں کے سوا عربی یا کسی اور زبان کا کوئی لفظ استعمال نہیں ہوا ہے (جب کہ ایسے متعدد الفاظ کی فہرست قاضی صاحب نے تبصرے میں دی ہے) یہ سب باتیں قاضی صاحب کے نزدیک آئین تحقیق کے خلاف ہیں۔ قاضی صاحب اصل جس بات پر اصرار کرتے ہیں وہ بیدار، مستعد اور منطقی ذہن ہے جس کے بغیر ان کے نزدیک انسانی علم ہی نہیں انسانی شخصیت بھی ناتمام ہے۔

برٹرینڈ رسل اور قاضی عبدالودود کے درمیان کیمبرج مشترک ہے رسل کی سوانح عمری کا سادہ، شفاف، منطقی اور نکھرا نثری اسلوب انگریزی کے نثری ادب میں بھی مثالی حیثیت رکھتا ہے رسل نے جی ای مور کے بارے میں لکھا ہے۔

He had a kind of exquisite purity. I have never but once succeeded in making him tell a lie, and that was a subterfuge. "Moore," I said, 'do you always speak the truth ?" "No" he replied. I believe this to be the only lie he had ever told.

Autobiography
(1872-1914) P. 77

غالباً قاضی صاحب کے بارے میں بھی یہی بات کہی جا سکتی ہے بلاشبہ وہ اپنے دور کے سب سے بڑے حق گو ہیں۔ اس دور میں نایاب سچائی کا ایک نام قاضی عبدالودود ہے۔

قاضی صاحب کے علمی اور تحقیقی کارناموں کی تفصیل کے لئے ایک دفتر درکار ہے لیکن یہ کارنامے اہل علم کی نظر میں ہیں کون فراموش کر سکتا ہے کہ قاضی صاحب نے تحقیق کو طرز زندگی بنا دیا یہ محض علمی مشغلہ نہیں اصول زیست ہے تحقیق کے پرخطر میدان میں قدم رکھنے سے قبل کتنی زبردست خود احتسابی ضروری ہے دوسروں کی فروگذاشتوں کا ذکر کرنے سے پہلے اپنی تحریر کے ہر لفظ کو کتنی توجہ کیسی احتیاط اور کس قدر ریاضت صرف کرنا ہوگی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بے خوفی سے بات کہنے سے قبل اپنے ہر مقالے کو ہر ممکن اعتراض اور ہر چیلنج سے مبرا بنانا ہوگا اور یہ

سب کام قاضی عبدالودود نے بڑی عرق ریزی جانفشانی اور لگن سے کئے ہیں یہی لگن اگر سائنس یا ٹکنالوجی کے میدان میں صرف ہوتی تو یقیناً کسی نہ کسی عہد آفریں ایجاد یا انکشاف کے لئے نوبل پرائز کی مستحق قرار پاتی

قاضی صاحب گنے چنے ان چند لوگوں میں ہیں جن کے لئے لکھنا پڑھنا عبادت ہے ادب جن کی زندگی ہے اور ہر لفظ خواہ تقریر میں صرف ہو یا تحریر میں انتہائی قابل توجہ اور اہم ہے یہی نہیں لفظ کا تلفظ اس کا صحیح استعمال لفظ کی ساخت اور مشتقات جملوں میں لفظوں کا اور عبارت میں جملوں کا باہمی ربط۔ صداقت اور حقیقت سے بیان کا رشتہ، دلیل اور دعویٰ کی ہم آہنگی یہ سب ایسے امور ہیں جن کی قاضی صاحب کے نزدیک بنیادی اہمیت ہے علی گڑھ کے اسٹیشن پر احباب انہیں پٹنہ کے لئے پاڈرا میل پر سوار کرانے آئے ہیں سامان رکھا جا رہا ہے گاڑی چھوٹنے والی ہے مگر قاضی صاحب پلیٹ فارم پر کھڑے بحث کر رہے ہیں کہ "رومانوی" میں 'و' کا استعمال غلط ہے رومانی ہونا چاہئے۔ علم و ادب کو اوڑھنا بچھونا بنانے کا یہ کرشمہ ہمارے ملک میں اب نایاب ہے۔

قاضی صاحب کی شخصیت اکثر ان کے کارناموں کے پیچھے گم ہو جاتی ہے لوگ قاضی صاحب کو ایک بے خطا محقق اور ایک بیدرد نکتہ چیں کی حیثیت سے جانتے ہیں یہ نہیں جانتے کہ قاضی صاحب ان لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے خلافت تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا اور اپنی تعلیمی زندگی کو حب وطن کے ماتحت خیرباد کہہ کر سیاست میں عملی طور پر شرکت کی تھی اسی وجہ سے بہار کی اہم سیاسی شخصیتوں سے وہ اکثر بہت قریب رہے ہیں جن میں ڈاکٹر راجندر پرشاد خاص طور پر قابل ذکر ہیں پھر کیمبرج کی یادیں ہیں جہاں وہ موجودہ صدر جمہوریہ ہند جناب فخرالدین علی احمد اور سابق میسور (جناب نجف الدین مرحوم) کے ہم جماعت رہے وہاں کے قصے آج بھی مزے لے لے کر بیان کرتے ہیں ایک بار تینوں دوست پیرس گھومنے گئے وہاں پہنچ کر پیسے ختم ہو گئے صرف ایک پاؤنڈ

کا سکہ باقی بچا جو واپسی کے کرایے کیلئے بھی ناکافی تھا دوستوں نے صلاح کر کے اس آخری پاؤنڈ کو داؤں پر لگا دیا اور اس سے اتنی رقم جیت لی کہ کیمبرج واپس آ گئے۔

اسی زمانے کا ایک قصہ قاضی صاحب نے ڈاکٹر حسن ظہیر کے بارے میں سنایا تھا اور اسے اس بات کے ثبوت میں پیش کیا تھا کہ انسانی ذہن پر اعداد کا بھی بڑا گہرا اثر پڑتا ہے زمانہ وہ تھا جب جرمنی میں سخت معاشی ابتری پھیلی ہوئی تھی اور وہاں کا سکہ انگریزوں کے سکے پاؤنڈ کے مقابلے میں نہایت ارزاں اور کم قیمت ہو گیا تھا حسن ظہیر صاحب نے ویانا جانے کا ریزرویشن کرایا تھا برلن میں قاضی صاحب سے ملاقات ہوئی۔ دونوں دوستوں نے ساتھ ویانا جانے کا پروگرام بنانا چاہا مگر یہ صرف اسی صورت میں ممکن تھا جب حسن ظہیر صاحب اپنا ریزرویشن دوسرے دن کے لئے کرا لیں اسٹیشن جا کر معلوم کیا تو کئی سو جرمن مارک کا خسارہ تھا دونوں سخت بددل ہوئے مگر جب اس رقم کو برطانوی سکے میں منتقل کیا تو معلوم ہوا کہ یہ کئی سو مارک صرف چھ پینی کے برابر ہوتے تھے۔

مولانا محمد علی سے لندن اور پیرس کی ملاقاتوں کا حال بھی قاضی صاحب لطف لے کر سناتے تھے مولانا محمد علی کی صاف گوئی اور بہت فرزانگی کے وہ معترف ہیں لندن کے ایک ٹیوب اسٹیشن پر قاضی صاحب سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے صاف صاف اس بات کا اعتراف کیا کہ ان کا لندن آنا اس وجہ سے ہوا کہ ایک محفل میں ایک مہاراجہ سے مولانا محمد علی کے ذیابیطس کے مریض ہونے کا ذکر آیا انھوں نے کہا کہ وہ بھی اسی مرض میں مبتلا تھے اور لندن میں کسی ڈاکٹر کے علاج سے شفایاب ہوئے تھے مولانا محمد علی نے اپنی معاشی مجبوریوں کا ذکر کیا تو مہاراجہ صاحب نے سفر خرچ دینے کا وعدہ کر لیا اور انھیں کی بدولت وہ لندن گئے تھے چند روز بعد قاضی صاحب کے کسی دوست کے ہاں مولانا محمد علی کی دعوت تھی قاضی صاحب نے مولانا محمد علی سے ذکر کیا کہ آج شام کے اخبارات میں ان کی تصویر چھپی ہے مولانا محمد علی اس

خبر سے اتنے خوش ہوئے کہ انھوں نے کہا کہ دوڑ کر جاؤ اور اس اخبار کی جتنی کاپیاں اخبار فروش کے پاس ہوں لے آؤ۔ قاضی صاحب پچاس کاپیاں خرید لائے جو معمولی قیمت کی تھیں ان میں مولانا محمد علی کی تصویر چھپی تھی اخبار کے رپورٹر نے کسی کرکٹ میچ کو دیکھنے والوں میں مولانا محمد علی کو عربی قبا اور چاند تارے والی خلافتی ٹوپی میں دیکھا تو ان کی تصویر کھینچ لی اور یہ اخبار میں نام کی غلط ہجے کے ساتھ چھپ گئی۔

پنڈت جواہر لال نہرو اور ان کے خاندان سے بھی قاضی عبدالودود صاحب کی پرانی ملاقاتیں تھی قاضی صاحب یورپ میں تھے کہ پھیپھڑے کے عوارض میں مبتلا ہوئے جنیوا میں ایک پرائیوٹ نرسنگ ہوم میں تپ دق کے مریضوں کے لئے آرام کا خاص انتظام تھا اس وقت تک تپ دق کا علاج دریافت نہیں ہوا تھا مگر اس نرسنگ ہوم میں مریضوں کو آرام ملتا ہے اور یہ مریض باہر برآمدے میں آرام کرسیوں پر دراز خوشگوار ہوا کھاتے تھے اور آرام کرتے تھے یہیں کملا نہرو زیر علاج تھیں اور مسز کرشنا ہتھی سنگھ اور پنڈت جواہر لال نہرو ان کی تیمار داری کیا کرتے تھے پنڈت نہرو یہاں کوہ پیمائی بھی کرتے تھے اور گھوڑے پر دور دراز کا سفر بھی کیا کرتے تھے قاضی صاحب سے کسی یورپی دوست نے پنڈت نہرو کی کوہ پیمائی کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ "آپ کے ہموطن بڑے نڈر ہیں وہ بڑے خطرے مول لیتے ہیں" اس رائے کو قاضی صاحب نے پنڈت نہرو کے سامنے دہرایا تو پنڈت نہرو نے کہا کہ یہ میرے لئے قابل ستائش نہیں کیونکہ جو شخص ڈر سے واقف ہو اور پھر ڈر پر قابو پائے وہ قابل تعریف ہے میں تو ڈر سے واقف ہی نہیں ہوا ہوں" I was born without fear قاضی عبدالودود صاحب کملا نہرو کو شریف ترین خاتون بتاتے ہیں ان کا بیان ہے کہ کملا نہرو ہمیشہ ارد و ناولیں پڑھا کرتی تھیں اور اپنی نند کی تیمار داری سے نالاں بھی رہتی تھیں کہتی تھیں کہ یہ میری تیمار داری کے لئے آئی ہیں اور اپنی رنگ رلیوں کھیل تماشوں میں محو رہتی ہیں۔

قاضی صاحب کا سفر یورپ ان کی شخصیت کی تشکیل میں ایک اہم مقام رکھتا تھا یورپ سے انھوں نے زندگی گزارنے کا سلیقہ سیکھا اور اپنی شخصیت کو ایک نئے سانچے میں ڈھالا بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ قاضی صاحب روحانیت اور مذہب کے معاملات میں نہایت ترقی پسندانہ نقطۂ نظر رکھتے ہیں وہ روایتی عقائد کو آنکھ بند کرکے مان لینے کے سخت مخالف ہیں اور ان امور میں سمجھوتے کے قایل نہیں قاضی صاحب کو اپنے بھائی قاضی محمد سعید سے جو قلبی لگاؤ تھا اس کی نظیر ملنا مشکل ہے دراصل محمد سعید صاحب ہی ان کی جائیداد اور گھر بار کا انتظام کرتے تھے اور انھیں کے حسن انتظام کا نتیجہ تھا کہ قاضی صاحب نے ہمیشہ آزادانہ بسر کی اور ملازمت تجارت یا وکالت کا کھڑاگ نہ پالا سعید صاحب کا انتقال ہوئے چند روز ہی گزرے تھے کہ مجھے کسی کام سے پٹنہ جانا پڑا مجھے انتقال کا علم نہ تھا قاضی صاحب کے ہاں پہنچا تو جمیل مظہری صاحب تعزیت کر رہے تھے اور مرحوم کے لئے دعائے مغفرت کے الفاظ استعمال کر رہے تھے اور قاضی صاحب روح کے وجود اور مغفرت کے تصور پر بحث کر رہے تھے قاضی صاحب اپنے عزیز بھائی کے انتقال پر انتہائی دل گرفتہ ہونے کے باوجود اپنی فلسفیانہ اقدار کے سلسلے میں سمجھوتہ کئے بغیر قایم تھے۔

قاضی صاحب کو دیکھ کر اکثر مجھے سقراط کی شخصیت کا خیال آیا ہے جس کے نزدیک خوشی اور غم دونوں فضول تھے اور ان دونوں سے بے نیاز رہ کر وہ صرف انسانی زندگی کے ادراک و عرفان کا تنہا اکیلا علم کے بے پایاں شوق کے سہارے جیا اور اسی کی خاطر خوشی خوشی عظیم ترین قربانی دی۔ سچ اس کے لئے عظیم ترین تھا اور حق کی اس تلاش کے لئے ہر قیمت ادا کی جاسکتی تھی اور ہر قربانی جائز تھی۔ قاضی صاحب نے بھی علم اور تحقیق کو اس کی تمام خطرناکیوں کے ساتھ اختیار کیا ہے۔

قاضی صاحب کی شخصیت کا ایک اور پہلو افسانوی ادب سے ان کا گہرا لگاؤ ہے

قاضی صاحب انگریزی ناولوں اور ڈراموں کے رسیا ہیں اعلیٰ ترین ناولوں اور ڈراموں کے اکثر مجموعے ان کی نظر سے گزرے ہیں اور جب کبھی موقع پاتے ہیں اچھے انگریزی جاسوسی ناولوں کو بھی بڑے شوق سے پڑھتے ہیں انگریزی اور فرانسیسی ناولوں کو لطف لے لے کر پڑھتے ہیں اور ان کے جملے، کردار اور واقعات تک ان کے ذہن میں محفوظ رہتے ہیں یہاں بھی ان کی غرض انسانی نفسیات کو پہچاننے اور انسان کے اعمال و افکار کے محرکات کو سمجھنے اور اسے جھوٹ اور فریب کی طرف لے جانے والی قوتوں کو جاننے اور اس فریب کا پردہ چاک کرنے کے طریقوں اور انسانی بیانات کے تضادات تک پہنچنے کی مختلف باریکیوں کو افسانہ نگار کے تخلیقی تخیل کے آئینے میں دیکھنا ہی ہوتا ہے وہ افسانوی ادب کو بھی انسانی نفسیات کے آئینے کے طور پر دیکھتے ہیں۔

قاضی صاحب کی شخصیت کا ایک اور جوہر ان کی حس مزاح میں مضمر ہے یہ حس بظاہر قاضی صاحب کے ہاں نمایاں نہیں ہے لیکن درحقیقت ان کی شخصیت میں خاصی رچی بسی ہے ان کے سخت اور درشت ظاہری رویے کے پیچھے ایک نہایت لطیف اور دلچسپ شخصیت چھپی ہوئی ہے اندرا گاندھی وزیر اعظم ہوئیں تو قاضی صاحب نے ان کی اعلیٰ تعلیمی ڈگری نہ ہونے کے باوجود ملک کے اعلیٰ ترین منصب تک پہنچنے پر اظہار خیال کیا اور حافظ کا یہ شعر کسی نے سنایا تو پھڑک اٹھے اور اسے بار بار دہراتے رہے۔

نگار من کہ بہ مکتب نرفت و خط ننوشت
بہ غمزہ مسئلہ آموز صد مدرس شد

قاضی صاحب کو کوئی پر لطف شخصیت مل جائے تو اس پر برابر برمحل جملے چسپاں کرتے رہیں گے اور تفریح لیتے رہیں گے۔ یوں بھی بعض لطائف وہ مزے لے لے کر سناتے ہیں۔ کیمبرج کے دوران قیام ان کے ایک ہم جماعت طالب علم کو کچھ لوگ کسی دوست

کی قیام گاہ پر بنچ کھیلنے لے گئے انھوں نے بہت معذرت کی مگر وہ لوگ نہ مانے اور انھیں ڈریسنگ گاؤن ہی میں گھسیٹ لے گئے قیام گاہ پہ پہنچے تو اتفاق سے مالکہ مکان بھی وہاں موجود تھی وہ انھیں ڈریسنگ گاؤن پہنے دیکھ کر سخت برہم ہوئی انھوں نے بات کو مذاق میں ٹالنا چاہا اس نے کہا

Dont try to be funny. You are quite funny without it"

دوسرا لطیفہ یہ ہے کہ کیمبرج میں طلبہ کی یونین کی نئی کابینہ کی تنصیب ہو رہی تھی کچھ طلبہ وہاں کے دستور کے مطابق صدر کی کرسی کے پیچھے بھی بیٹھے تھے ایک صاحب جو اس سے قبل صدر تھے بار بار قاضی صاحب اور ان کے ایک دوست کے سامنے سے ہو کر ادھر سے ادھر جاتے تھے قاضی صاحب کے پاس جو صاحب بیٹھے تھے انھوں نے سابق صدر کو مخاطب کر کے کہا

Next time when you cross, apologise.

قاضی صاحب کا مکان ادبی اور تحقیقی اعتبار سے تو واجب الزیارت مقامات میں سے ہے ہی کئی دوسری حیثیتوں سے بھی اس کی اہمیت ہے یہ اعزاز شاید ہی پٹنہ کے کسی مکان کو حاصل ہو کہ وہاں تین صدر جمہوریہ آئے ہیں اور دو نے وہاں قیام کیا ہے ان میں ڈاکٹر راجندر پرشاد۔ ڈاکٹر ذاکر حسین اور جناب فخرالدین علی احمد شامل ہیں راجن بابو صدر ہونے سے پہلے بھی کئی بار وہاں آئے تھے لیکن ایک بار ان کی آمد زبان کے مسئلے کو سلجھانے کے لئے تھی اور وہ مشہور معاہدہ جو راجن عبدالحق پیکٹ کے نام سے مشہور ہوا قاضی صاحب ہی کے مکان میں ہوا تھا۔

قاضی صاحب ان دنوں انجمن ترقی اردو بہار کے سکریٹری تھے اور وہاں کی مسلم لیگ کے بھی اہم عہدہ داروں میں تھے ان دنوں ڈاکٹر سید محمود بہار کی کانگریسی وزارت

کے زیر تعلیم تھے اور انھوں نے وردیا مندر اسکیم کے ماتحت ہندوستانی زبان کو اسکولوں میں ذریعہ تعلیم بنایا تھا اور اس کے لئے مشترک ریڈریں تیار کرائی تھیں اس اسکیم کے خلاف اردو والوں میں خاصی ناراضگی تھی اور ایک تعلیمی کنونشن بلانے کی تیاریاں کی جارہی تھیں اس کنونشن سے قبل ایک مشاورتی جلسہ ہونا طے پایا تھا جس میں سید سلیمان ندوی، پروفیسر محمد مجیب، پروفیسر غلام السیدین، ڈاکٹر عابد حسین، آل احمد سرور اور بعض دوسرے حضرات شامل تھے ڈاکٹر عبدالحق بھی اس موقع پر پٹنہ آرہے تھے گاندھی جی کو علم ہوا تو انھوں نے راجندر پرشاد کو لکھا کہ واردھا میں ہونے والے کانگرس کے اہم جلسے میں شرکت نہ کریں اور پٹنہ کے اس مشاورتی جلسے میں جاکر ہندوستانی کے معاملے پر کوئی قابل قبول حل نکالیں چنانچہ قاضی صاحب کے ڈرائنگ روم میں یہ جلسہ ہوا اور سب کا ایک سمجھوتے پر پہنچے۔ سمجھوتہ یہ تھا کہ (۱) ہندوستانی دونوں رسم خط میں لکھی جائے گی (۲) وہ تمام الفاظ جو فرہنگ آصفیہ میں ہیں اردو لفظ سمجھے جائیں گے (۳) وہ تمام الفاظ جو ہندی شبد ساگر کوش میں ہیں ہندی کے لفظ سمجھے جائیں گے اور (۴) اصطلاحات کا ترجمہ کرتے وقت اردو اور ہندی دونوں ترجمے استعمال کئے جائیں گے۔ افسوس یہ ہوا کہ یہ سمجھوتہ ناکام رہا لیکن اگر اس پر سنجیدگی سے چند سال بھی عمل درآمد ہوجاتا تو شاید آج ہندوستان کی لسانی صورت حال مختلف ہوتی۔

غرض قاضی صاحب کی شخصیت قاموسی شخصیت ہے ایک زمانہ ہوا قاضی صاحب نے جہانِ غالب کی ترتیب شروع کی تھی اور غالب کے کلام کے سبھی اہم حوالوں، شخصیتوں، مقامات اور تلمیحات پر تفصیلی نوٹ لکھے تھے یہ ان کے قاموسی کاموں میں ایک نہایت اہم کارنامہ تھا لیکن جہانِ غالب کی طرح وہ خود اپنی ذات سے ایک جہان ہیں جس میں ایک انوکھی

کشش ہے ۔ ایسی شخصیت کہاں ملے گی جو یونانی ، لاطینی ، پہلوی ، عربی ، فارسی ، فرانسیسی
انگریزی ، اردو ادبیات پر بہ یک وقت اتنی گہری نظر رکھے اور ان کے حقایق و رموز سے
واقف ہو علم کو زندگی کا اوڑھنا بچھونا بنالے جس کا ہر سانس علم کی خاطر ہو اور جس کی ہر بات
نپی تلی ہو جس کے دل میں صداقت اور تلاش حق کی لگن ہو جو ہر طرح کی قربانیاں دینے
اور ہر خطرے کو مول لینے سے بھی نہ ہچکچائے جو انسانی شخصیت اور فطرت کی تفہیم کے
لئے افسانے سے لے کر تحقیق تک ہر میدان میں سرگرداں ہو اور پھر اس کی ذات ہماری
سیاسی اور تہذیبی زندگی کی ایسی اہم دستاویز ہو جس کے مطالعے سے دلوں کو سرور
ملتا ہو ۔

گیان چند جین

بت شکن محقق

رسالہ آج کل نے اگست [illegible]ء میں اردو تحقیق نمبر شائع کیا تو سرورق کے اندر اردو کے سب سے بڑے چار زندہ محققین کی تصویریں دیں اور ان پر عنوان دیا۔ اردو تحقیق کے چار ستون۔ یہ چار ستون قاضی عبدالودود، مولانا عرشی، مسعود حسن رضوی اور مالک رام تھے۔ اس انتخاب سے کسی کو اختلاف نہ ہوگا۔

میں غالباً ۱۹۵۵ء میں مثنویوں پر اپنے کام کے سلسلے میں لکھنؤ گیا۔ یونیورسٹی میں احتشام صاحب سے ملا۔ لکھنؤ سے پٹنہ جانا تھا۔ میں اس وقت تک قاضی عبدالودود کے نام سے بھی آشنا نہ تھا۔ احتشام صاحب نے کہا کہ "پٹنہ میں قاضی عبدالودود سے ملئے۔ بڑے کھرے محقق ہیں۔ اگر آپ کسی تاریخ کے بیان کرنے میں ایک سال کی غلطی کر دیں گے تو وہ بار بار اس کا ذکر کریں گے۔" میں پٹنہ گیا اور قاضی صاحب کا لطفِ خاص حاصل کیا۔ ان سے مفصل ملاقاتیں کیں اور پھر اپنا استفادہ کیا۔ میں نے اردو کے دو بڑے محققین مسعود حسن رضوی اور قاضی عبدالودود میں یہ مشترک خصوصیت دیکھی کہ ان کے پاس بیٹھ جائیے تو یہ گھنٹوں ادبی باتیں کرتے رہیں گے لیکن ان دونوں کی بات چیت میں ایک فرق تھا کہ مسعود حسن رضوی بہت متانت سے ادبی بات چیت کرتے تھے۔ اس میں طنز و مزاح کا نمک مرچ نہ ہوتا تھا جیسے کسی مقدس ہستی کی خدمت میں بیٹھے ہوں۔ اس کے برعکس قاضی صاحب اپنی علمی گفتگو میں معاصرین پر تبصرہ بھی کرتے ہیں اور موقع بہ موقع پھبتیاں بھی لیتے ہیں۔ اس لحاظ سے قاضی صاحب کی صحبت زیادہ دلچسپ ہوتی ہے۔

قاضی صاحب کو دوسرے محققین کے مقابلے میں دو فائدے حاصل رہے ہیں

۱ انھوں نے مشرقی و مغربی دونوں طرح کی تعلیم سے خاطر خواہ اکتساب کیا۔ ابتدا میں قرآن حفظ کر کے عربی صرف و نحو اور قدیم منطق وغیرہ پڑھی۔ اس کے بعد انگریزی کی طرف چل نکلے جس کا منتہا انگلستان اور جرمنی میں ۶ سال کا قیام تھا۔ وہاں انھوں نے فرنچ بہت اچھی طرح اور جرمن اور لاطینی کسی قدر سیکھی۔ یورپ سے واپسی کے بعد اپنے طور پر فارسی ادبیات کا گہرا مطالعہ کیا۔

۲ دوسروں کے روز و شب کا بڑا حصہ معاش سے متعلق فرائض منصبی میں ضائع ہو جاتا ہے۔ تصنیف و تالیف کے لیے تھوڑا وقت ملتا ہے۔ قاضی صاحب تمام عمر معاش کی فکروں سے آزاد رہے۔ بیرسٹری پاس کی لیکن وکالت نہ کی۔ کوئی ملازمت بھی نہ کی۔ شغل کے طور پر ادبی تحقیق کو اختیار کیا۔ اس طرح وہ ہمہ وقتی نیز ہمہ جہتی محقق رہیں۔

جناب مسعود حسن رضوی نے اپنی کتاب 'اسلاف میر انیس' کا انتساب 'تعمیری تحقیق کے قدر شناسوں کے نام' کیا ہے۔ انھوں نے تعمیری تحقیق کی اصطلاح اپنے دو ایک مضامین میں بھی استعمال کی ہے۔ اگر کوئی تعمیری تحقیق ہوتی ہے تو تخریبی تحقیق بھی ہونی چاہیے۔ بعض وجوہ سے قاضی عبدالودود و مسعود حسن رضوی کے متقابل قرار پاتے ہیں۔ مسعود صاحب کے مرتبہ دیوانِ فائز اور تذکرہ گلشن سخن پر قاضی صاحب کا تبصرہ اور مسعود صاحب کی کتاب 'آبِ حیات کا تنقیدی مطالعہ' دونوں بزرگوں کے متقابل موقف کا ثبوت ہیں۔ یقینی ہے کہ مسعود صاحب نے تعمیری تحقیق کی اصطلاح استعمال کر کے قاضی عبدالودود سے اپنا امتیاز ظاہر کیا ہے کیونکہ قاضی صاحب کی تحقیق بالعموم معترضانہ ہوتی ہے۔ تنقید میں کلیم الدین احمد صاحب اور تحقیق میں قاضی صاحب ایک دوسرے کے نظیر ہیں۔ کلیم الدین احمد نے ضرب کلیمی سے ایک طرف شعرا پر ہلا بول دیا تو دوسری طرف نقادوں کا ستھراؤ کر دیا۔ قاضی صاحب کبھی میر، غالب، آزاد اور شاد

عظیم آبادی جیسے گزشتگان پر ایناگرز نگاد سرچلاتے ہیں تو کبھی ڈاکٹر عبدالحق ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی، ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی، ڈاکٹر اختر اورینوی اور ڈاکٹر ممتاز احمد جیسے معاصرین پر بعدہٗ گراں رسید کر دیتے ہیں۔ کلیم صاحب اور قاضی صاحب دونوں کی شخصیت اتنی بلند و بالا ہے کہ بڑے سے بڑے معاصر کی خامیاں آشکار کرنا انھیں زیب دیتا ہے کلیم الدین احمد سرور و احتشام کی اور قاضی عبدالودود عبدالحق اور مسعود حسن رضوی کی فروگزاشتوں پر انگشت نمائی کریں تو کوئی چھوٹا منہ بڑی بات کا فقرہ چست نہیں کر سکتا۔ خردہ گیری دلفاری کی موجب ہوتی ہے لیکن میری رائے ہے کہ ان زعما کی تنقید و تحقیق کی اس روش نے مجموعی طور پر فائدہ زیادہ پہنچایا ہے اور نقصان کم۔

تحقیق کے معاش کو بوالہوسی کی تاب نہیں۔ اس کے لیے بڑے کڑھے اور گنے ہوئے علم کی ضرورت ہوتی ہے۔ چونکہ درس گاہوں میں ملازمت اور ترقی کے لیے تحقیقی اکتسابات کا مطالبہ کیا جاتا ہے اس لیے ہر مبتدی گیسوئے تحقیق میں شانہ کرنے کے در پے ہے۔ اس سے تسامحات کیونکر نہ ہوں جب اس کے بڑے کوئی اچھی مثال قائم نہیں کرتے۔ قاضی صاحب نے بے دردی کے ساتھ ان کی بے راہ رویوں کا پردہ فاش کیا۔ وہ کسی سے مرعوب نہیں ہوتے۔ اردو دنیا میں جو نام بڑا طمطراق رکھتے ہیں قاضی صاحب جب ان کی عبا و قبا نوچ پھینکتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ طفلِ مکتب سے بہتر نہ تھے۔ وہ نہ کسی کی شہرت سے مرعوب ہوتے ہیں نہ شخصی تعلقات کا لحاظ کرتے ہیں۔ ان کے اپنے ہم وطن ڈاکٹر ممتاز احمد اور ڈاکٹر اختر اورینوی سے مراسم رہے ہوں گے لیکن ان کی کتابوں کا تجزیہ کرتے وقت انھوں نے مروت کو حائل نہ ہونے دیا۔ تنہا قاضی صاحب کی تنبیہہ کی ہیبت نے محققین کو جس عزم و احتیاط پر مجبور کیا اتنا دوسرے سب مل کر بھی نہ کر سکے۔ تحقیق کے فن اور روایت کے لیے قاضی صاحب کی یہ بہت بڑی خدمت ہے۔

میں نے اردو مثنوی پر اپنی کتاب میں کلیم الدین احمد کے بارے میں ایک آدھ جملہ قدرے سخت لکھ دیا ہے۔ میں نے ایک خط میں انھیں لکھا کہ طبع ثانی میں ایسے جملوں کو نکال دوں گا۔ انھوں نے بڑی سیر چشمی کے ساتھ جواب دیا کہ معترضانہ جملے خارج کرنے کی ضرورت نہیں۔ اسی طرح قاضی صاحب نے اپنے ایک مکتوب میں مجھے مفصل لکھا کہ اعتراض کرنے میں کوئی ہرج نہیں میں قاضی صاحب کے علم و فضل کو تسلیم کرنے، انکی نگارشات کی بلندی کو ماننے اور ان سے عقیدت رکھنے میں کسی سے پیچھے نہیں مجھ پر انکے ذاتی احسان بھی ہیں لیکن چونکہ وہ اپنی بزرگی، اپنی بے نہایت وسیع القلبی اور شفقت کے سبب اعتراضات کی اجازت دیتے ہیں اس لیے میں آئندہ سطور میں تصویر کے دونوں رخ دکھانے میں تامل نہ کروں گا خواہ میں یہیں کہیں گستاخی کا مرتکب ہی کیوں نہ ہو بیٹھوں۔

میرے پاس قاضی صاحب کی جملہ تحریریں نہیں ہیں ان سب سے واقف بھی نہیں۔ جہاں تک مجھے علم ہے انھوں نے ذیل کی کتابیں مرتب کیں۔

۱ تذکرۂ شعرا مصنفہ ابنِ طوفان ۲ قطعاتِ دلدار ۳ دیوانِ جوشش

۴ قاطعِ برہان و رسائلِ متعلقہ۔ ان کے علاوہ متعدد مضامین لکھے جن میں سے چند کے دو مجموعے عیارستان اور نشتر و سوزن شائع ہو چکے ہیں۔ اس طرح انھوں نے اپنی طرف سے کوئی مستقل کتاب نہیں لکھی۔ ان کے سب سے زیادہ مضامین معاصر پٹنہ میں چھپے ہیں لیکن بدقسمتی سے یہ رسالہ بہار کے باہر والوں کو کم ہی دیکھنے کو ملتا ہے۔ معاصر کے بعد انھوں نے "نوائے ادب" میں کثرت سے لکھا۔ مجھے توقع ہے کہ "معاصر" کے قاضی عبدالودود نمبر میں ان کے مضامین کی جامع فہرست سامنے آجائے گی۔ میری معلومات کے مطابق ان کے زیادہ اہم مضامین یہ ہیں۔

۱ غالب کا فرضی استاد۔ علی گڑھ میگزین غالب نمبر ۴۹-۱۹۴۸ء۔ بعد میں یہ مضمون احوالِ غالب ۱۹۵۳ء میں "ہرمزد ثم عبد الصمد" کے عنوان سے شائع ہوا

۲ مصحفی و سودا۔ "اردو ادب" اکتوبر ۱۹۵۰ء

۳ مصحفی و انشا۔ "اردو ادب" جنوری تا اپریل ۵۱ء

۴ دیوانِ فائز۔ معاصر ا۔ نظرِ ثانی کے ساتھ "عیارستان" ۱۹۵۵ء میں

۵ میر تقی میر۔ حیات اور شاعری پر تبصرہ "معاصر" ۹، ۱۰۔ بعد میں "عیارستان" میں۔

۶ "غالب بحیثیت محقق"۔ اول "علی گڑھ میگزین" میں۔ بعد میں اضافے کے ساتھ نقدِ غالب ۵۶ء میں

۷ "عبدالحق بحیثیت محقق"، "معاصر" ۱۳، ۱۴، ۱۵

۸ "آزاد بحیثیت محقق" "نوائے ادب" اپریل، جولائی، اکتوبر ۵۶ء

۹ "بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا" (از ڈاکٹر اورینوی) "نوائے ادب" اکتوبر ۵۸ء تا اکتوبر ۵۹ء

۱۰ "مثنویات راسخ" (از ڈاکٹر ممتاز احمد) "ہماری زبان" ۸ نومبر ۱۹۵۸ء تا یکم دسمبر ۵۸ء

۱۱ "دلی کا دبستانِ شاعری" (از ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی) "ہماری زبان" فروری ۵۹ء تا ۸ مارچ ۵۹ء

۱۲ "عمدۂ منتخبہ یعنی تذکرہ سرور" "اشتر و سوزن" ۱۹۶۵ء

۱۳ "شاد کی کہانی شاد کی زبانی" "اشتر و سوزن" ۶۵ء

۱۴ "اصول تحقیق" "آج کل اردو تحقیق نمبر" اگست ۶۷ء

وہ تذکرہ گلشن سخن مرتبہ سید مسعود حسن رضوی پر تبصرہ لکھ کر معاصر میں شائع کرنے والے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ شائع ہوا ہوگا۔ مندرجہ بالا مضامین میں سے کئی نام کے لئے مضمون ہیں ورنہ جہاں تک ضخامت کا تعلق ہے یہ پوری کتابیں ہیں: "غالب بحیثیت محقق" ۱۰۴ صفحات

کا اور "عبدالحق بحیثیت محقق" ۲۷ صفحات کو محیط ہے۔ ان دونوں مضامین کو علیحدہ سے کتابی شکل میں شائع ہونا چاہیے۔

حقائق کی تلاش میں صحت کا جو غیر معمولی معیار قاضی عبدالودود نے قائم کیا ہے اس کی وجہ سے وہ مثالی محقق کہے جا سکتے ہیں۔ وہ سوفی صدی سچی شہادت کے بغیر کسی بات کو نہیں مان سکتے۔ ظن غالب کی ان کے یہاں گنجائش نہیں۔ ان کے اصول سخت لیکن مکمل ہیں۔ ذیل میں ان کی چند تحریروں پر مختصر مشاہدات پیش کیے جاتے ہیں جن سے ان کی تحقیق نگاری کی خصوصیات سامنے آسکیں گی۔

قدما میں قاضی صاحب کو چار ادیبوں، میر، مصحفی، انشا اور غالب سے بہت دلچسپی ہے۔ مصحفی ان کا مخصوص اور محبوب موضوع ہے۔ مشہور ہے کہ وہ ساری عمر مصحفی پر تحقیق کرتے رہے۔ امید نہیں کہ یہ تحقیق کبھی مکمل ہو کر کتابی شکل میں سامنے آسکے گی انھوں نے مصحفی پر کئی مضامین ضرور شائع کیے ہیں۔ "اردو ادب" اکتوبر ۱۹۵۱ء میں قاضی صاحب نے "مصحفی و سودا" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا۔ مصحفی نے اپنے تذکروں اور دواوین میں سودا کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ سب اس مضمون میں یکجا کر دیا گیا ہے اگر کسی قصیدے میں مصحفی نے سودا کے بارے میں ایک دو شعر بھی لکھ دیے ہیں تو قاضی صاحب نے متعلقہ اشعار دینے کی بجائے تقریباً پورا قصیدہ نقل کر دیا ہے۔ یہ اطناب بے جا اور غیر ضروری محنت ہے۔ مصحفی نے اپنے قصیدوں میں سودا کے بارے میں حریفانہ خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اس سے چڑھ کر مصحفی کے کسی شاگرد نے ایک طویل ہجائیہ قصیدہ لکھا۔ مولانا عرشی کی رائے میں وہ بندرابن راقم کا ہے[1]۔ قاضی صاحب اپنے مضمون میں مدعی ہیں کہ تیرھویں صدی میں اس کا زندہ ہونا بعید از قیاس ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اس کے مصنف مرزا احسن ہو

---

[1] سودا کا ایک قصیدہ۔ از مولانا عرشی۔ "اردو ادب" جولائی ۱۹۵۳ء ص ۳۲

سکتے ہیں لیکن میرے رفیق کار ڈاکٹر شام لال کالڑا عابد پیشاوری اسے راقم ہی کا قرار دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ قاضی صاحب کے علی الرغم قاسم نے تذکرہ مجموعۂ نغز (تکمیل ۱۲۲۱ھ) میں راقم کو زندہ دکھایا ہے۔ عابد پیشاوری نے اس اہم مصرع کی طرف توجہ دلائی

ع گر سات جنم لیوے تو بالفرض ز تقدیر

سات جنم کی بات کسی مسلمان کے قلم سے نہیں نکل سکتی۔ اس کا مصنف کوئی ہندو ہی ہو سکتا ہے۔

مصحفی کی وجہ سے قاضی صاحب کو انشا سے بھی دلچسپی ہوئی۔ "اردو ادب" بابت جنوری اپریل ۱۹۵۱ء میں انھوں نے "مصحفی اور انشا" کے عنوان سے ۳۶ صفحے کا مفصل مضمون لکھا۔ مختلف تذکروں اور تاریخوں میں انشا و مصحفی کے معرکوں کے بارے میں جو کچھ ملتا ہے وہ سب جمع کر دیا گیا ہے اور اس پر اظہار خیال کیا ہے۔ مضمون جامع ہے اور غیر جانب داری سے لکھا گیا ہے۔ فریقین کے بعض لسانی اعتراضات کا قاضی صاحب نے جائزہ لیا اور اپنے موقف کی تائید میں اسناد پیش کیں۔ انشا پر ان کا دوسرا اہم مضمون "کچھ انشا کے بارے میں" ہے۔ اس کی پہلی قسط "نوائے ادب" جنوری ۱۹۵۱ء میں اور دوسری "نوائے ادب" اکتوبر ۱۹۵۳ء میں شائع ہوئی۔ دونوں میں انشا کے بارے میں مفید مواد ہے۔ پہلی قسط میں قاضی صاحب نے رقعات قتیل اور جنتری کی مدد سے انشا کی معزولی کی تاریخ ۱۲۲۲ھ برآمد کی ہے میرے رفیق کار عابد پیشاوری نے انشا پر پی ایچ ڈی کی ہے انھوں نے ثابت کیا ہے کہ معزولی کی صحیح تاریخ ۱۲۲۹ھ ہے اور رقعات قتیل اس کے مانع نہیں۔

قاضی صاحب کا مرغوب موضوع مصحفی تھا ان کا زیادہ تر وقت دوسروں کی لغزشوں کی نشان دہی میں گزرا۔ اس سلسلے کی پہلی کتاب "عیارستان" ہے۔ اس کتاب کی ابتدا غلط نامے سے ہوتی ہے اور اس سے بھی قبل سب سے اوپر کی سطر یہ ہے

• یہ کتاب جناب ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی کے نام معنون کی جاتی ہے •

انتساب کے لیے یہ مقام اور یہ طریقہ بہت ناموزوں ہے۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ جملہ کاپی میں بعد کا اضافہ ہے۔ غلط نامے کے آخر میں دو اصحاب کا شکریہ ہے جو دیباچے میں ہونا چاہیے تھا۔ صفحہ ۲ کے متن میں مہاراجکمار ڈاکٹر رگھوبیر سنگھ اور ڈاکٹر عندلیب شادانی سے بعض معلومات کی فراہمی کی اطلاع ہے اور فٹ نوٹ میں حاشیہ ہے "دونوں کا شکریہ" انتساب اور شکریے کا یہ لٹھ مارنے جیسا انداز قاضی صاحب جیسے کھرے محقق کے مزاج کا نشان دہ ہے۔ کتاب میں فہرست مضامین تو ہے ہی نہیں۔ متن کے آخر میں تصحیح و اضافہ ہے۔ پھر مجلد کتاب سے الگ ایک غیر مجلد جز و ہے جسے "ملحقاتِ عیارستان" کا نام دیا ہے۔ ان ملحقات میں اضافوں کے بعد تصحیح غلط نامہ ہے۔ اور پھر ملحقات غلط نامہ۔ غرض کتاب کی وہ کیفیت ہے جیسے بعض گداگر اپنے جسم پر طرح طرح کے گدڑ لپیٹے رہتے ہیں۔

"عیارستان" تین کتابوں کے تبصرے پر مشتمل ہے (۱) دیوانِ فائز مرتبہ مسعود حسن رضوی ۲ مرقعِ شعرا مرتبہ رام بابو سکسینہ اور (۳) میر تقی میر، حیات اور شاعری از ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی۔ انھوں نے معاصرین کے تحقیقی کاموں پر جو تبصرے کیے ہیں ان میں غالباً سب سے پہلا سید مسعود حسن رضوی کے مرتبہ دیوانِ فائز کا جائزہ ہے۔ یہ جو خیال کیا جاتا ہے کہ قاضی صاحب ہمیشہ خامیوں ہی پر نظر رکھتے ہیں اس جائزے کو دیکھ کر غلط ہو جاتا ہے۔ تبصرے کی ابتدا ہی میں انھوں نے اعتراف کیا ہے "یہ بات بے خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ اس قسم کی دوسری کتابیں جو انجمن ترقی اردو نے شائع کی ہیں ان میں بہت کم ایسی ہیں جن کے مرتبین نے اتنی تلاش و تحقیق سے کام لیا ہے ۔ ...... کتاب کی ترتیب میں جو جانفشانی انھوں نے کی ہے اس کی داد نہ دینا ظلم ہے" (عیارستان ص ۱)

مسعود صاحب جیسے محقق کی تحریر میں کوئی اضافہ یا ترمیم کرنا کوئی کھیل نہیں لیکن قاضی صاحب اسی سے عہدہ برآ ہوئے ہیں۔ اور ان اضافوں کے لیے وہ کیسے کیسے غیر معروف ادبی ماخذ

سے کام کی بات ڈھونڈ کر لاتے ہیں۔ انھوں نے تاریخِ محمدی سے فائز کے والد کا نام محمد خلیل دریافت کیا۔ یہ طے کیا کہ صدرالدین محمد خاں نام نہیں خطاب ہے۔ کامور خاں کے تذکرۃ السلاطین چغتا سے فائز اور اس کے دو بھائیوں کے نام دریافت کیے۔ مسعود صاحب فائز کی تاریخ ولادت و وفات نہیں دے سکے تھے۔ قاضی صاحب نے تاریخ وفات قطعی طور پر اور تاریخِ ولادت تقریباً طور پر طے کر دی۔ انھوں نے کلیاتِ فائز کے نسخۂ آکسفورڈ کی اطلاع دی اور یہ بتایا کہ "سفینۂ ہندی" اور دتاسی کی تاریخ میں بھی فائز کا ذکر ہے۔ دتاسی نے فائز کی مثنوی "بھنگیرن" کا فرنچ ترجمہ دیا ہے۔ کوئی دوسرا ہوتا تو اسے دیکھ کر گزر جاتا لیکن قاضی صاحب سرسری کام کے قائل نہیں۔ انھوں نے فرنچ ترجمے اور مطبوعہ دیوانِ فائز کی مثنوی کا مقابلہ کیا اور تخلص والے آخری مزید شعر کا پتا چلا یا۔ انھوں نے "مجموعۂ گستاخ" سے فائز کے نام شیخ علی حزیں کے ۳۲ خطوط دریافت کیے۔ یہ بڑے اہم اضافے ہیں۔ اردو کے موجودہ محققوں میں کون ہے جو "تاریخِ محمدی" اور "مجموعۂ گستاخ" جیسے نسخوں کو کھنگالتا پھرے۔

ملحقات عیارستان میں انھوں نے فائز کے حالات میں تفصیلی اضافہ کیا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس دور کی تاریخ پر ان کی کتنی گہری نظر ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ شمالی ہند کی سترہویں تا انیسویں صدی کی تاریخ پر قاضی صاحب کو جتنا عبور ہے اتنا کم علما کو ہوگا۔ مسعود صاحب کا دعویٰ تھا کہ فائز شمالی ہند کا پہلا سنجیدہ اردو شاعر اور پہلا صاحب دیوان شاعر ہے۔ قاضی صاحب نے دونوں دعووں کو مشکوک قرار دے دیا۔

مسعود صاحب کے اس کام کے قاضی صاحب معترف ہیں لیکن اس کے علاوہ انھوں نے جس کتاب پر تبصرہ کیا اس میں ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر اغلاط کا انبار لگا دیا۔ محمود شیرانی نے دیوانِ ذوق کی ترتیب کے سلسلے میں محمد حسین آزاد کی غیر محققانہ حرکات کا پتا دیا تھا۔ قاضی صاحب نے آزاد بحیثیت محقق کے سلسلے کے تین مضامین میں آبِ حیات کے متعدد تسامحات

کی نشاندہی کی اور آزاد کی سخن ناشناسی اور بازاری گپوں کو رد کر دیا۔ مسعود حسن رضوی نے "آبِ حیات کا تنقیدی مطالعہ" میں کئی اعتراضات کی صفائی پیش کی لیکن کئی ایسے تھے جن کا شافی جواب ممکن نہ تھا۔ آزاد نے آبِ حیات میں مجموعۂ نغز کی ایک عبارت کی بنا پر یہ غلط نتیجہ نکالا تھا کہ مظہر جانجاناں کا قاتل سنی تھا۔ قاضی صاحب نے اس کی تردید کی۔ مجھ سے ایک بار بھی گفتگو میں انھوں نے کہا کہ مسعود صاحب نے آبِ حیات کے بہت سے اغلاط کی تاویل کی لیکن جانجاناں کے قاتل کے مذہب کے بارے میں میری بات کا رد نہ کر سکے۔ قاضی صاحب کے ان مضامین کے بعد آبِ حیات کا پایۂ استناد کمزور ہو گیا ہے۔

عیارستان کا بڑا حصہ یعنی ۱۳۹ صفحات ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی کی کتاب "میر تقی میر: حیات اور شاعری" پر تبصرے کی نذر ہیں۔ تبصرے کے بارے میں کچھ کہنے سے قبل میں یہ شکایت درج کرنا چاہتا ہوں کہ عیارستان میں صفحات کے شمار میں جو ابتری پائی جاتی ہے وہ قاضی صاحب جیسے سخت گیر محقق کو زیب نہیں دیتی۔ یہ تبصرہ پہلے معاصر ۹ اور ۱۰ میں چھپا تھا۔ انھوں نے تبصرے کا ابتدائی حصہ از سر نو لکھا اور اس کے بعد معاصر ۹ اور ۱۰ کے اوراق مجلد کرا دیے لیکن ان کا نمبر شمار نہیں بدلا۔ اس طرح ص ۳۱ کے بعد معاصر ۹ کا ص ۱۴۵ آتا ہے جو ۱۸۸ تک چلا جاتا ہے۔ اگر اس کے صفحات کا نمبر ٹھیک کیا جائے تو ۱۸۸ کی بجائے ۷۵ آئے گا۔ اس کے بعد کے ورق پر ص ۷۶، ۷۷ کا شمار ٹھیک ہے اور اس کے بعد آگے پھر معاصر ۱۰ کے صفحات لگا دیے گئے ہیں جن کا شمار ۷۹ سے شروع ہوتا ہے۔ کتاب کے شروع میں ایک غلط نامہ ہے جس میں صرف ۱۴۵ تا ۱۸۸ کے صفحات کے نمبروں کی تصحیح کا اشارہ ہے۔ معلوم نہیں بقیہ کا یہاں کیوں ذکر نہیں۔ ملحقات عیارستان کے عنوان سے جو چند صفحات جلد کتاب سے علیحدہ ہیں ان میں تصحیح غلط نامہ ہے اور وہاں اعتراف کیا گیا ہے کہ ۷۷ کے بعد کے کل صفحات کے ہندسے غلط ہیں۔ اس

خلفشار کا نتیجہ یہ ہے کہ غلط نامہ، دیباچہ یا ملحقات میں انھوں نے کتاب کے جس صفحے کا حوالہ دیا ہے اس کا کچھ پتا ہی نہیں چلتا کہ وہ کہاں ہے مثلاً دیباچے کے آخر میں وہ ص ۱۶۲ پر معیوب قوافی کا اور ۱۱ پر کرر غزلوں کا ذکر کرتے ہیں۔ کتاب میں جو نمبر شمار پڑے ہیں ان کے لحاظ سے ص ۱۶۲ دو جگہ ہے لیکن وہاں کہیں معیوب قوافی کا ذکر نہیں صفحات کے نمبر ٹھیک کر لیے جائیں تو ص ۱۹۱ کو ۱۶۲ کہا جائے گا۔ اس پر بھی معیوب قوافی کا ذکر نہیں، یہی کیفیت نام نہاد ص ۱۷۱ کی ہے۔ اس طرح ان کے بیشتر حوالے متعلقہ صفحے تک رہبری میں ناکام ثابت ہوتے ہیں۔

قاضی صاحب نے خواجہ صاحب کی نثر کے رنگ و آہنگ کا اعتراف کیا ہے لیکن اسی کے ساتھ ساتھ وہ تضاد اور مبالغے کی نشان دہی کرتے ہیں جو کسی حد تک حسین فقروں کے استعمال کا نتیجہ ہے۔ قاضی صاحب نے مصنف کے مآخذ کا سختی سے محاسبہ کیا۔ ان کے بقول مصنف نے کتابیات میں جن مآخذ کا ذکر کیا ہے ان میں سے بعض انھوں نے دیکھے ہی نہیں۔ بعض سے جو کچھ نقل کیا گیا ہے وہ غلط یا ناکافی ہے۔ بعض باتیں کتابوں سے منسوب کی گئی ہیں وہ ان میں نہیں ملتیں۔ ڈاکٹر فاروقی نے تاریخی پس منظر بہت تفصیل سے لکھا ہے۔ قاضی صاحب ماہر تاریخ ہیں۔ انھوں نے اس کا قرار واقعی جائزہ لیا۔ میر کے حالات کا بھی انھوں نے سختی سے تجزیہ کیا۔

قاضی صاحب نقاد نہیں مانے جاتے لیکن انھوں نے اپنے مخصوص تحقیقی لائحہ کار کا مصنف کے تنقیدی بیانات پر اطلاق کیا اور ان کی خامی آشکارا کر دی مثلاً

۱ میر کی شخصیت کے بارے میں مصنف کے متناقض بیانات تلاش کیے۔

۲ مصنف نے لکھ دیا تھا کہ میر نے زبان کی صفائی کے شوق میں ناسخ کی طرح ہندوستانیت سے بالکل قطع تعلق نہیں کیا۔ قاضی صاحب نے ناسخ کے دونوں دواوین

کو چھان کر صفحات کے حوالوں کے ساتھ ہندوستانیت کی کئی سو مثالیں پیش کر دیں۔

۳ مصنف نے میر کی عوام پسندی اور عوامی زبان پر زور دیا تھا۔ تبصرہ نگار نے میر کے کئی عوام دشمن اشعار اور نکات الشعرا کے خلافِ عوام بیانات درج کیے اور اس کے بعد کلامِ میر سے غیر مستعمل عربی فارسی الفاظ کی اتنی زیادہ مثالیں درج کیں کہ عوامی زبان کا دعویٰ بھک سے اڑ گیا۔

۴ مصنف نے میر کے کلام کے ہندوستانی پن کو سراہا تھا۔ قاضی صاحب نے کلیات کے ابتدائی ایک ہزار اشعار کا جائزہ لیا تو ان میں معدودے چند ہندوستانی عناصر ملے۔

۵ مصنف نے میر کی محبوبہ کو سماج کی شریف زادی اور ان کے عشق کو بہت پاکیزہ قرار دیا تھا۔ قاضی صاحب نے دونوں کی تردید میں میر کے ایسے متعدد اشعار پیش کر دیئے جن میں عشق سفیہانہ ہے۔ یہ طریق کار مدلل اور مسکت ہے۔ اعداد و شمار کی مدد سے تحقیقی تنقید اردو میں قاضی صاحب کی اولیات میں سے ہے۔

اس مفصل تبصرے سے کتاب کی گوناگوں اغلاط کی نشان دہی ہوتی ہے لیکن تبصرے کے آخر میں یہ مصرع پڑھنے کو جی چاہتا ہے ؏ عیب مے جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو۔ انھوں نے معاصر نیز عیارستان میں اس کتاب پر تبصرہ لکھنے کا دعویٰ کیا ہے، ان کا عنوان "میر تقی میر، حیات اور شاعری، کی خامیاں" نہیں۔ تبصرے میں تصویر کے دونوں رخ نہ ہوں تو اسے غیر متوازن کہا جائے گا۔ اس کتاب میں کچھ خوبیاں بھی ہوں گی جن کے طفیل قاضی صاحب کے مفصل تبصرے کے باوجود اسے ساہتیہ اکادمی کا انعام دیا گیا۔

قاضی صاحب کے ہم عصر معتوبین میں ڈاکٹر فاروقی کے علاوہ ڈاکٹر عبدالحق نمایاں ہیں۔ ان دونوں کے پردے میں قاضی صاحب نے میر سے متعلق اپنی تحقیقات پیش کیں۔ "عبدالحق بحیثیت محقق" کا بڑا حصہ میریات سے متعلق ہے۔ یہ ضخیم مضمون معاصر ۱۳ تا ۱۵ میں چھپا

تھا جیسا کہ قاضی صاحب نے ابتدا ہی میں صراحت کی ہے :-

" اس مقالے کی علت غائی محقق کی حیثیت سے ان کے مرتبے کی تعین ہے ....
ڈاکٹر عبدالحق کی غلطیوں اور فروگزاشتوں کا استقصاء کامل مدنظر نہیں ۔ "

(معاصر ۱۳ - ص ۸۹)

انھوں نے ڈاکٹر عبدالحق کی مرتبہ ذیل کی کتابوں کا جائزہ لیا :-

ذکر میر - انتخاب کلام میر - نکات الشعرا - گلشن ہند - خطبات گارساں دتاسی - عقد ثریا - معاصر ۱۳ کی قسط ذکر میر کے تبصرے پر مشتمل ہے - معاصر ۱۴ میں دوسری قسط کے پہلے ذیل کے عنوانات دیے ہیں -

(۱) تتمۂ تبصرۂ ذکر میر (۲) انتخاب کلام میر (۳) نکات الشعرا (۴) گلشن ہند
(۵) خطبات گارساں دتاسی (۶) دیوان تاباں (۷) عقد ثریا

لیکن اس شمارے کی قسط صرف پہلے تین عنوانات پر مشتمل ہے - ۴ تا ۷ اس میں موجود نہیں - معاصر ۱۵ یعنی قسط سوم کے پہلے یہ عنوانات ہیں -

تصحیح و اضافہ - تتمۂ انتخاب کلام میر - نکات الشعرا - گلشن ہند - خطبات گارساں دتاسی - عقد ثریا -

نکات الشعرا کا تبصرہ ظاہرا معاصر ۱۴ میں مکمل نہیں ہوا - وہاں آخری شق پر (۱۰) دیا ہے لیکن معاصر ۱۵ میں تبصرے کا جو بقیہ حصہ ہے اس پر نہ معلوم کیوں نئی شق کو (۹) کہا ہے حالانکہ (۱۱) چاہیے تھا - دیوان تاباں کا تبصرہ کسی قسط میں نہیں -

ڈاکٹر عبدالحق نے ذکر میر کی اشاعت سے قبل رسالہ اردو اپریل ۱۹۲۶ء میں ایک تعارفی مقالہ لکھا تھا - قاضی صاحب نے اس کی بہت سی فاحش غلطیوں کی نشان دہی کی مثلاً یہ کہ مرتب نے غلط ترجمہ کیا - وہ کبود جامہ کے معنی نہیں سمجھے حالانکہ بقول قاضی صاحب

یہ ایران کا ایک مقام ہے۔ خواجہ بزرگ (خواجہ معین الدین چشتی) سے انھوں نے نواب بہادر جاوید خاں خواجہ سرا مراد لیا۔ حاکم شام کے معنی امیر معاویہ کی بجائے یزید سمجھے۔ قاضی صاحب نے مولوی صاحب کی تاریخ سے متعلق ۳۶ غلطیوں کی نشان دہی بھی کی۔ قاضی صاحب اس میدان کے ماہر ٹھہرے۔ مولوی صاحب پر ایک بڑا اعتراض یہ کیا کہ انھوں نے ذکر میر کے بیانات کو پرکھے بغیر سچ مان لیا۔ ترتیب متن کے نقطۂ نظر سے یہ اہم اعتراض کیے۔

(۱) ذکرِ میر کے دوسرے نسخے موجود تھے لیکن مولوی صاحب نے ان سے استفادہ ضروری نہ سمجھا اور محض ایک نسخے کو لے کر چھاپ دیا۔ نسخۂ لاہور کے اہم اختلافاتِ نسخ نہیں دیے۔

(۲) متن کے آخر کے لطائف حذف کر دیے جو نامناسب تھا۔

(۳) اشخاص و مقامات کا اشاریہ نہیں دیا۔ یہ قاضی صاحب نے اپنے تبصرے میں دے دیا ہے۔

(۴) میر کے فارسی مفردات و مرکبات کی فہرست نہیں دی۔

قاضی صاحب نے اس آخری مد کو تفصیل سے لیا ہے۔ انھوں نے اولاً یہ دکھایا کہ ذکر میر میں آرزو کی چراغِ ہدایت کے کم از کم ۵۰۰ الفاظ و محاورات استعمال کیے گئے ہیں۔ ان کی فہرست معاصر کے ۱۱ صفحات پر ہے یعنی معاصر ۱۳ کے ص ۱۲۳ تا ۱۳۳ پر۔ اس کے لیے قاضی صاحب نے دونوں کتابوں کا مفصل تقابلی مطالعہ کیا ہوگا۔ مضمون کے آخر میں انھوں نے ذکرِ میر کے مزید الفاظ و محاورات کی فہرست دی ہے۔ یہ بھی ۱۱ صفحات پر مشتمل ہے لفظیات کی اس طویل فرہنگ سے ان کی مشقت اور جامعیت کا اندازہ ہوتا ہے لیکن میں ان کے اس مطالبے سے متفق نہیں کہ مرتب متن کو لازماً اس متن کے خاص خاص الفاظ اور جملہ محاورات کی فہرست بھی دینی چاہیے۔ انھوں نے دیوانِ فائز کے تبصرے میں

۱؎ عیارستان ص ۱۷

بھی یہ مطالبہ کیا ہے۔

ذکرِ میر کے لیے وہ لکھتے ہیں :-

" آپ بیتی کی حیثیت سے یہ قطعاً ناکامیاب ہے اور یہ بدترین آپ بیتیوں میں ہے جو میری نظر سے گزری ہیں " (معاصر ۱۴ ص ۱۳۸)

انھوں نے ذکرِ میر کی تصنیف کے چار ذہنی محرکات قرار دیے۔

(۱) اپنے بزرگوں کی آوازہ گری جو دراصل اپنی آوازہ گری ہے۔ (۲) ایک درویش کی حیثیت سے خود اپنا احترام کرانے کی خواہش (۳) سوتیلے بھائی کو بدنام کرنے کی خواہش (۴) آرزو کو بدنام کرنے کی خواہش۔

ان کی تائید میں ان کی شہادتیں اتنی مدلل وشافی ہیں کہ اتفاق کیے بنا چارہ نہیں۔ پورے تبصرے میں قاضی صاحب نے تفصیل کے ساتھ ذکرِ میر کے مندرجات اور میر کے کردار پر تنقید کی ہے۔ سختی سے دیکھا جائے تو یہ 'عبدالحق بحیثیت محقق' کے احاطے میں نہیں آتی۔ انھوں نے ڈاکٹر فاروقی کے تبصرے میں بھی میر کی سوانح نگاری، کردار اور نفسیات پر بحث کی اور ان کا تجزیہ یقیناً قابل قدر ہے۔ سچ یہ ہے کہ انھوں نے ڈاکٹر فاروقی کی کتاب اور ڈاکٹر عبدالحق کی مرتبہ ذکرِ میر اور نکات الشعرا کے ضمن میں اپنی طرف سے اتنا کچھ لکھ دیا ہے گویا تبصرے میں ان کی ایک طبع زاد تصنیف سموئی ہوئی ہے۔ ایسے تبصرے کو تخلیقی تبصرہ کہہ سکتے ہیں۔

انتخاب کلام میر کے تبصرے میں انھوں نے اس طرف توجہ دلائی کہ مرتب نے یہ صراحت نہیں کی کہ انتخاب کلیات کے کس ایڈیشن سے کیا گیا ہے۔ اس میں بعض اشعار کا متن غلط ہے۔ بہت سے بامزہ اشعار چھوڑ دیے گیے ہیں اور ان سے کم تر درجے کے شعر انتخاب میں شامل کر لیے گئے ہیں۔ دونوں کی تائید میں قاضی صاحب نے بہت سے اشعار دیے۔

نکات الشعرا میں بھی یہ صراحت نہیں کہ یہ کس نسخے پر مبنی ہے۔ قاضی صاحب نے اس کے سال آغاز و اختتام پر عالمانہ بحث کی۔ مرتب نے متن اور اشعار کی تصحیح کی طرف توجہ نہیں کی بہت سے مصرعے غیر موزوں چھاپ دیے ہیں۔ غلط متن کی سب سے زیادہ مضحک مثال زہد یا فانی کی جگہ ارندیا فانی لکھ دینا ہے۔ قاضی صاحب نے نکات الشعرا کے بیانات کا تحقیقی تجزیہ کیا۔ انھیں بجا اعتراض ہے کہ مرتب نے حواشی نہیں لکھے لیکن میں ان کے اس مطالبے سے پھر اتفاق نہیں کر سکتا کہ اردو فارسی مفردات و مرکبات کی فہرست دینی چاہیے تھی۔ قاضی صاحب نے فارسی کی فہرست چار صفحات پر اور اردو کی ۱۲ صفحات پر دی ہے۔ یہ واضح ہو کہ قاضی صاحب کی فہرست مسلسل لکھے ہوئے الفاظ کا مجموعہ ہوتی ہے۔ اگر اسے سلیقے سے کالم بنا کر لکھا جائے تو ۱۲ صفحے پچاس صفحات بن جائیں گے۔ مرتب کی فرد گزاشت کے اظہار میں یہ دیدہ ریزی غیر ضروری ہے۔ انھوں نے نکات الشعرا کی طبع اول و دوم کا لفظاً بہ لفظ مقابلہ کرکے ان کے فرق کی بھی نشان دہی کی۔

گلشن ہند کو اول شبلی نے مرتب کیا اور اس پر مولوی عبدالحق سے مقدمہ لکھایا۔ یہ مقدمہ اردوئے معلی نومبر سنہ ۱۹۰۶ء میں شائع ہوا۔ سنہ ۱۹۳۲ء میں انجمن ترقی اردو نے گلشن ہند مع گلزار ابراہیم شائع کی تو وہی مقدمہ شامل کر دیا گیا۔ اس پر قاضی صاحب نے چٹکی لی۔

"انھیں اس کے سوا کہ اشتیاق کے بارے میں دو سطروں کا حاشیہ بڑھا دیں ۲۸ برس گزر جانے پر بھی کہیں کچھ گھٹانے بڑھانے یا بدلنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی"

(معاصر ۱۵۔ ص ۳۰)

قاضی صاحب اس مقدمے کے اغلاط کی نشان دہی کرتے ہیں۔ مرتب نے گلشن ہند میں دیے ہوئے تاریخی حالات کو سراہا لیکن قاضی صاحب نے دکھایا کہ وہ اغلاط سے پر ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے اس تذکرے میں شعرا کے حالات میں غلطیوں کی بھی نشان دہی کی۔ ان کے

مطابق گلشنِ ہند طبعِ اول کی تمام غلطیاں طبعِ دوم میں برقرار رہیں۔

خطبات گارساں دِتاسی پر مولوی صاحب کا جو مقدمہ ہے، بقول قاضی صاحب کے، ڈاکٹر زور کا دعویٰ تھا کہ یہ ان کے ایک مضمون سے ماخوذ ہے اور قاضی صاحب نے اس کی تائید میں مثالیں پیش کیں۔ مرتب نے دِتاسی کے چند اغلاط کا ذکر کیا تھا۔ قاضی صاحب نے مزید ۱۰۰ اغلاط کی فہرست دے دی۔ اس کے بعد انھوں نے اغلاطِ ترجمہ کی بھی ۱۰ مثالیں دیں

عقدِ ثریا کی اشاعت کی تحریک قاضی عبدالودود ہی نے کی تھی۔ ڈاکٹر عبدالحق نے ان سے نسخۂ پٹنہ کی نقل لی لیکن اس کے ساتھ یہ عجیب ہدایت کی کہ اس میں سے اشعار حذف کر دیے جائیں۔ اس کے باوجود قاضی صاحب نے اشعار بھی بھیج دیے۔ قاضی صاحب نے مشورہ دیا تھا کہ نسخۂ لندن کا عکس حاصل کیا جائے لیکن مرتب نے اسے غیر ضروری سمجھا۔ مرتب نے مصحفی کے تینوں تذکروں پر ایک ہی مقدمہ لکھا ہے۔ اس میں انھوں نے یہ بھی لکھ دیا کہ تذکرۂ ہندی اصل ہے باقی دو تذکروں کو اس کا تکملہ سمجھنا چاہیے۔ قاضی صاحب کہتے ہیں کہ عقدِ ثریا تذکرۂ ہندی سے ماقبل ہے، یہ تکملہ کیونکر ہوا۔ مرتب نے بیشتر اشعار حذف کر دیے ہیں لیکن مقدمے میں اس کا اظہار نہیں کیا۔ قاضی صاحب نے مصحفی کا خصوصی مطالعہ کیا ہے چنانچہ انھوں نے مصحفی کی تاریخِ ولادت و وفات پر عالمانہ بحث کی نیز تذکرے کے سال آغاز و انجام کا تعین کیا۔ انجمن کے مطبوعہ نسخے کے ترقیمے میں مصحفی کے نام کے ساتھ مرحوم لگا کر مرتب نے عجیب غلط فہمی پیدا کر دی۔ اس تذکرے میں اغلاطِ کتابت و طباعت بکثرت ہیں۔ آخر میں غلط نامہ دیا ہے لیکن وہ نہایت ناکافی ہے۔ قاضی صاحب نے متعدد مزید اغلاط کی نشان دہی کی۔

مولوی عبدالحق کے ان کاموں کے جائزے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ عبدالحق بہت غیر محتاط محقق تھے۔ وہ فارسی نثر کو سمجھنے میں سہو کر جاتے تھے۔ نیز ایسا معلوم ہوتا ہے

کہ انھوں نے ترتیب کے یہ کام دوسروں سے کرائے ہیں اور خود سرسری سا دیکھ ریکھ کے بعد اپنا نام دے دیا۔ ان کی گوناگوں مصروفیات کے ہوتے یہ ممکن بھی نہ تھا کہ وہ عبدالودودی انداز سے تحقیق و ترتیب کرتے۔

جس زمانے میں معاصر میں یہ مضمون شائع ہو رہے تھے ڈاکٹر شوکت سبزواری نے ان کے جواب میں قاضی عبدالودود بحیثیت محقق کا جائزہ لینا شروع کیا۔ اس سلسلے کا پہلا مضمون قومی زبان میں شائع ہوا تھا کہ مولوی عبدالحق نے مزید اشاعت روک دی۔ سبزواری کا وہ مضمون میں نے اس زمانے میں پڑھا تھا۔ اب نہ مل سکا۔ قاضی صاحب نے مولوی عبدالحق کی لغزشوں پر جو گرفت کی ہے اس کا جواب ممکن نہ تھا۔

دلی کالج میگزین نے ۱۹۶۲ء میں میر نمبر شائع کیا۔ اس میں قاضی صاحب کے تین مضمون تھے۔ سب سے اہم مضمون 'میر کے حالاتِ زندگی' تھا۔ اس کی ابتدا میں قاضی صاحب نے لکھا ہے

"میر نہ منصف ہیں نہ راست گفتار اور ان کا حافظہ بھی زیادہ مضبوط نہیں"

(ص ۲۷)

اس مضمون میں قاضی صاحب نے ذکرِ میر کے مطابق میر کے ابتدائی حالات بیان کیے اور فٹ نوٹ میں ان کی تردید کرتے چلے گئے۔ میری رائے میں یہ اہم تبصرے متن مضمون میں ہی ہونے چاہئیں تھے حاشیے میں نہیں۔ پھر جب وہ ذکرِ میر کے بیانات کو کذب و مبالغہ سمجھتے ہیں تو سوانح ان کے مطابق لکھی ہی کیوں۔ ہم توقع کرتے رہتے تھے کہ قاضی صاحب اپنے طور پر میر کے حالاتِ زندگی لکھنے چلے تھے تو میر کے بیانات کے علاوہ دوسروں کے بیانات کو بھی پیشِ نظر رکھتے اور چھان پھٹک کر مستند حالات پیش کرتے۔ اسی رسالے میں طالب علی خان فائق نے 'حیاتِ میر' کے عنوان سے جو مضمون لکھا ہے، قاضی صاحب کچھ

اس نہج پر لکھتے تو حق ادا ہو جاتا لیکن شاید ایک کالج میگزین کے لیے قاضی صاحب نے اتنی کاوش نہ کرنا چاہی۔ انھوں نے مضمون میں سوانح کے بیچ نکات الشعرا کے مندرجات کا بھی جائزہ لیا ہے وہ عنوان مضمون سے غیر متعلق ہے۔

اسی رسالے کے ایک اور مضمون "کلیاتِ میر کی اوّلین اشاعت" کے آخر میں قاضی صاحب نے بہت صحیح کہا ہے۔

"سنہ ۱۲۲۶ھ کے بعد کلیاتِ میر کا کوئی نسخہ شائع ہوا ہے تو تجارتی اغراض سے ہندوستان و پاکستان کے کسی ادبی ادارے کو اس کی طرف توجہ کرنے کی توفیق نہیں ہوئی یہ جس قدر شرمناک ہے۔ اسی قدر یہ امر قابل ستایش ہے کہ فورٹ ولیم کالج کے اربابِ حل و عقد کو آج سے کم و بیش ڈیڑھ سو برس قبل کلیات کی اشاعتِ اوّلین کا خیال آیا" (ص ۳۹۱)

"عیارستان" اور "عبدالحق بحیثیت محقق" کے علاوہ ان کی معترضانہ تحقیق کا ایک شاہکار "اشتر و سوزن" ہے۔ اس مجموعے کے سرورق پر سنہ طباعت ۱۹۶۵ء دیا ہے اور اندر کے صفحے پر ۱۹۶۶ء۔ قاضی صاحب جیسے محتاط محقق کی کتاب میں سالِ طبع کا یہ خلفشار غیر متوقع ہے۔ اس مجموعے میں دو کتابوں پر تبصرہ ہے: ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی کے مرتبہ عمدۂ منتخبہ یعنی تذکرۂ سرور پہ اور رشاد کی کہانی شاد کی زبانی" پر۔ انتساب اپنے مخصوص براہِ راست بے رنگ انداز میں ہے "بنام نورالدین احمد"

لیکن پیش گفتار کی پہلی ہی بات بڑی گرما گرم ہے۔ تذکرۂ سرور کے بارے میں لکھتے ہیں

"اسے دیکھ کر یہ باور کرنے کو جی چاہتا ہے کہ یہ اس غرض سے چھپوایا گیا ہے کہ قدیم متون کی ترتیب و تصحیح کا کام کرنے والے متنبہ ہو جائیں کہ کس طرح اسے نہ کرنا چاہیے۔ اگر ایسا ہے تو دانش گاہ کو اپنے مقصد میں نمایاں کامیابی ہوئی ہے اور یہ نسخہ ہمیشہ کے لیے نمونے کا کام دے گا۔ مگر اس کا امکان ہے کہ اس اشاعت کی علتِ غائی یہ ہے نہ زیادہ نہیں

اس لیے اس کی ضرورت محسوس ہوئی کہ اس کا بالتفصیل جائزہ لیا جائے" (ص ۳)

اس کام کی تنقید میں بھی قاضی صاحب نے متعدد اسقام کی نشان دہی کی ہے مثلاً فہرستِ شعرا ابجدی ترتیب سے نہیں، اشاریہ نہیں، لفظ نامہ نہیں، مرتب تاریخ تصنیف کو تاریخ کتابت سمجھا۔ قاضی صاحب نے بحث کر کے تذکرے کے آغاز و انجام کی صحیح تاریخ متعین کی۔ انھیں بنیادی شکایت یہ ہے کہ تذکرے کو محض ایک نسخے کی مائکروفلم کے عکس کی بنا پر چھاپا ہے اور یہ عکس بیشتر سیاہی زدہ ہو گیا تھا۔ "میں نے سنا ہے کہ ان مقامات کے پڑھنے کے لیے جو عکس میں خراب ہو گئے ہیں، اور ان کی تعداد ۳۰۰ سے زیادہ ہے، مائکروفلم کی طرف توجہ کی ضرورت بھی محسوس نہیں ہوئی، نسخۂ لندن کا مستعار منگوانا تو بڑی بات ہے" (ص ۴)

اس طرح بہت سے تخلص چھوٹ گئے ہیں۔ قاضی صاحب نے نسخے کی نقل کی مدد سے ایسے کچھ محذوف تخلص دیے ہیں۔

تذکرہ نگار کے ماخذ کے بارے میں قاضی صاحب نے عالمانہ بحث کی ہے۔ انھوں نے اس کی بے احتیاطیاں بھی آشکارا کی ہیں چنانچہ ص ۸۴ سے ۹۸ تک ایسی غلطیوں کی تفصیل ہے۔ سرور نے بعض اشعار کا غلط انتساب کیا ہے۔ کوئی شعر دو جگہ مختلف شعرا کے نام سے ہے۔ قاضی صاحب چاہتے تھے کہ مرتب کو تذکرہ نگار کی ان سب غلطیوں کی طرف اشارہ کر کے صحیح صورتِ حال درج کرنی چاہیے تھی مثلاً تذکرے میں داؤد کے شعرا کے حالات میں نہ معلوم کس طرح وال کے تخلص والے داور کا حال درج ہو گیا ہے۔ مرتب نے فہرست میں اسی طرح لکھ دیا اور اس پر انگشت نمائی نہ کی۔ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ مرتب نے بعض اشعار غیر موزوں لکھ دیے ہیں۔ وہ چاہتے تھے کہ جن اشعار کا کوئی جزو حذف ہو گیا ہے انھیں شعرا کے دیوانوں کی مدد سے مکمل اور صحیح کر لینا چاہیے تھا۔

غرض یہ ہے کہ اس تبصرے سے حسبِ معمول قاضی صاحب کی گہری معلومات نیز غیر معمولی

کاوش کا پتا چلتا ہے۔

"شاد کی کہانی شاد کی زبانی" ایسی کتاب ہے جسے کوئی ناواقف بھی پڑھے تو فوراً بھانپ لے گا کہ اس میں لاف و گزاف کے سوا کچھ نہیں۔ قاضی صاحب نے ان کا تجزیہ کیا۔ تبصرے کے باب اول میں انھوں نے اس قسم کے بیانات کو پورے کا پورا نقل کیا ہے اور یہ حصہ تقریباً ، ۱ صفحات پر مشتمل ہے۔ اقتباسات اتنی شرح و بسط سے نہیں دینے چاہئیں۔ یہ ان کی جرأت ہے کہ اپنے صوبے اور شہر کے ایک محترم شاعر کی قلعی کھولی لیکن صرف یہی ایک تبصرہ ایسا ہے جس میں قاضی صاحب کسی قدر سراسیمہ معلوم ہوتے ہیں۔ اپنے پیش لفظ میں اور پھر تبصرے کے آخر میں صفائی پیش کرتے ہیں کہ ان کے تبصرے پر کسی کو اعتراض نہ ہونا چاہئے۔ دراصل اس کتاب پر طول طویل تبصرہ کرنا اپنی محنت اور وقت کو ضائع کرنا ہے کیونکہ قاضی صاحب نے تبصرے کے ذریعے جو کچھ ثابت کرنا چاہا ہے اصل کتاب کو پڑھنے کے بعد ہر شخص خود ہی اس نتیجے پر پہنچے گا۔

قاضی صاحب نے "نوائے ادب" جنوری ۱۹۶۳ء میں شاد کی فارسی کتاب "تذکرۃ الاسلاف" کا تعارف کرایا۔

"اختر و سوزن" کا زیادہ اہم حصہ "تذکرۂ سرور" کا تبصرہ ہے۔ قاضی صاحب ادب کے محقق اور مورخ ہیں اس لیے تذکروں سے انھیں خصوصی دلچسپی ہے۔ انھوں نے کم از کم ایک تذکرہ مرتب کر کے کتابی شکل میں چھپوایا۔ انھوں نے ادارۂ تحقیقاتِ اردو کا سلسلۂ مطبوعات شروع کیا تو اس کی بسم اللہ ابن امین اللہ طوفان کے تذکرۂ شعراء سے کی۔ یہ مختصر تذکرہ ۱۹۶۵ء میں شائع ہوا۔ یہ فہرست، مقدمہ، متن، حواشی، ملحقاتِ معانی، لغات، مفردات و مرکبات و طرق استعمال اور غلط نامے پر مشتمل ہے۔ چاہیے یہ تھا کہ فہرست میں ان سب حصوں کا اندراج کر کے ان کے صفحات دیے جاتے۔ متن کے تحت مختلف شعرا کے حالات کے نمبر صفحہ کا اشارہ

کیا جاتا اور آخر میں حواشی اور ایک مفصّل اشاریہ ہوتا جو متن نیز حواشی دونوں کا احاطہ کرتا۔ انھوں نے فہرست کو اشاریے سے خلط ملط کر دیا ہے۔ وہ یہ بھی خبر دیتے ہیں کہ متن میں شعرا کے حالات میں سے فقرہ "از دست" اور قطعات و رباعیات سے قبل عنوان کے طور پر لفظ "رباعی" حذف کر دیا ہے۔ میری رائے میں صحت متن کا تقاضا یہ تھا کہ انھیں بھی حذف نہ کیا جاتا۔

بہر حال یہ نادر تذکرہ چھاپ کر قاضی صاحب نے بڑی خدمت کی۔ حواشی مفصّل اور مفید ہیں۔ حواشی کے ص ۲۹ سے ایک مثال ملاحظہ ہو۔ آبِ حیات میں آزاد نے آتش کے ایک مطلع کا ذکر کیا ہے جس کا مصرعِ ثانی ہے نیل کا گنڈا پہنا یا مردم بیمار میں ؛ ناسخ نے بھی اس زمین میں غزل کہی ہے۔ آزاد نے دونوں پر اعتراض کیا ہے کہ مضمون "میں" کی جگہ "کو" کا طالب تھا۔ آبِ حیات میں ہم سب یہ بیان پڑھتے ہیں اور باور کر کے گزر جاتے ہیں لیکن قاضی صاحب کا محققانہ مزاج اصل ماخذ سے تصدیق کیے بغیر قانع نہ ہوا۔ انھوں نے کلیاتِ آتش و ناسخ میں دیکھا تو ان غزلوں کی ردیف "میں" نہیں "کو" ہے گویا آزاد کا لطیفہ اور اعتراض دونوں بے بنیاد ہیں۔

کتاب کے آخر میں مفردات و مرکبات و طرقِ استعمال کی فہرست ہے جو لغت نگاروں کے لیے خاص طور سے مفید ثابت ہوگی۔

اس سے بھی زیادہ مفید کام تذکرۂ مسرت افزا کی اشاعت ہے۔ اس تذکرے کا صرف ایک نسخہ دنیا میں موجود ہے اور وہ آکسفرڈ یونیورسٹی میں ہے۔ قاضی صاحب نے اسے ۱۹۵۶ء میں معاصر کے چند شماروں میں چھپوایا۔ اس کی قسطوں میں معاصر کے نمبر صفحات نہیں بلکہ اپنے مسلسل نمبر شمار ہوتے تھے لیکن آخر میں جا کر گڑبڑ ہو گئی اور ص ۲۲۰ کے بعد ص ۱۶۹ سے شمار شروع کر دیا گیا ہے۔ بعد میں یہ کتابی شکل میں شائع نہیں کیا گیا۔

معاصر میں اس کے ساتھ کوئی مقدمہ، حواشی یا اشاریہ وغیرہ نہیں۔ بہت بعد میں رسالہ "اردو" کراچی اپریل ۱۹۶۱ء میں قاضی صاحب نے اس پر ایک مفصل مضمون لکھا جس کی مضمون عالمانہ ہے۔ اس مضمون کو مقدمہ مان کر متن کے ساتھ کتابی شکل میں چھاپ دیا جائے تو بہت مفید ہو۔

وہ مختلف رسالوں میں تذکروں پر تعارفی یا تنقیدی مضامین لکھتے رہتے ہیں۔ میں اس قسم کے ذیل کے مضامین سے واقف ہوں

(۱) تذکرۂ یوسف علی خاں — نوائے ادب اپریل ۱۹۵۱ء
(۲) خاتمۂ خلاصۃ الافکار — نوائے ادب جولائی اکتوبر ۱۹۵۱ء
(۳) گلستانِ سخن — دلی کالج اردو میگزین۔ قدیم دلی کالج نمبر ۱۹۵۳ء
(۴) گلشنِ بے خار — نوائے ادب اپریل ۵۳ء
(۵) فارسی تذکرے اور ریختہ گو شعرا — " اپریل ۵۶ء
(۶) اقتباساتِ سفینۂ خوش گو — " جولائی ۵۶ء
(۷) سفینۂ ہندی — " اکتوبر ۵۶ء
(۸) بیاضِ عنایت حسین خاں مہجور بنارسی — نوائے ادب جنوری ۱۹۶۰ء
(۹) تاریخ ادبیاتِ ہندی و ہندوستانی از دتاسی — معاصر ۱۱۔ دسمبر ۵۵ء
(۱۰) خلاصۃ تذکرۃ الاکابر۔ مع حواشی — معاصر ۱۸۔ جولائی ۶۳ء
(۱۱) تذکرۂ مسرت افزا — اردو اپریل ۶۸ء

یہ مضامین کہیں تعارف ہیں کہیں تبصرہ۔ وہ اکثر مفید حصوں کے اقتباسات درج کر دیتے ہیں جس سے بعد کے لکھنے والوں کے لیے حوالے کا مفید مواد فراہم ہو جاتا ہے۔ مندرجہ بالا مضامین وہ ہیں جن میں انھوں نے دوسروں کے مرتبہ تذکروں کا جائزہ نہیں

لیا، اپنی طرف سے لکھا ہے۔ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی، مولوی عبدالحق اور پروفیسر مسعود حسن رضوی کے مرتبہ تذکروں کا تبصرہ ان کے علاوہ ہے۔

قدیم اہلِ قلم میں میر کے علاوہ غالب، قاضی صاحب کے دوسرے منظورِ نظر ہیں۔ غالب سے انھیں عجیب لاگ لگاؤ (محبت و نفرت) قسم کا رشتہ ہے۔ عبدالقوی دسنوی کی کتاب "غالبیات" (ببلوگرافی) جنوری ۱۹۶۹ء کے مطابق قاضی صاحب نے غالب پر کم از کم ۳۵ مضامین لکھے۔ اس شمار میں ایک مضمون کی کئی قسطوں کو قسطوں کی تعداد کے مطابق شمار کیا گیا ہے۔ ان میں سے زیادہ اہم مضامین یہ ہیں

① غالب کا فرضی استاد۔ یہ اول علی گڑھ میگزین غالب نمبر ۴۹-۱۹۴۸ء میں شائع ہوا۔ بعد میں نظرِ ثانی کے بعد احوالِ غالب ۱۹۵۳ء میں، ہرمزد ثم عبدالصمد، کے نام سے شامل ہوا۔ اس میں قاضی صاحب نے دوسرے محققینِ غالب کے علی الرغم یہ دعویٰ کیا ہے کہ عبدالصمد کا وجود فرضی تھا۔ قاضی صاحب کے مضمون کے بعد اب عام طور سے ان سے اتفاق کیا جاتا ہے جب کہ ان کے انکشاف سے پہلے کسی نے یہ نہ سوچا تھا۔

② غالب بحیثیت محقق۔ یہ مضمون بھی پہلے علی گڑھ میگزین کے مندرجہ بالا غالب نمبر میں چھپا۔ بعد میں اضافے کے ساتھ نقدِ غالب ۱۹۵۵ء میں شامل ہوا۔ اس کی ضخامت ۲۲۸ صفحات ہے۔ قاضی صاحب نے صحیح لکھا ہے کہ اس موضوع کے لیے کم از کم تین سو صفحات درکار تھے۔ بنیادی طور سے یہ مضمون قاطعِ برہان کے معرکے کے سلسلے کا ہے۔ اس مضمون میں قاضی صاحب کی فارسی زبان و ادب بالخصوص قدیم فارسی سے جس گہری واقفیت کا پتا چلتا ہے، وہ واقعی ہوش ربا ہے۔ اس میں قاضی صاحب نے قاطعِ برہان اور اس کے تائیدی رسالوں کے اغلاط واشگاف کیے ہیں اور اپنے اعتراضات کی تائید میں اہلِ زبان کی اسناد پیش کی ہیں۔ زردشتی و دساتیری مذہبی ادب اور زبان سے غالب کی واقفیت

جتنی ناقص تھی قاضی صاحب کی اتنی ہی مکمل ہے۔ دساتیر کے سرسری مطالعے نے غالب کو جو نقصان پہنچایا وہ قاضی صاحب نے خوب واضح کیا ہے آگے چل کر اس مضمون میں قاضی صاحب نے فارسی فرہنگ نویسی کی مجمل لیکن صحیح تاریخ دی ہے۔ انھوں نے غالب کے اصولِ فرہنگ نویسی پر جو تنقید کی ہے وہ صرف نظریاتی نہیں بلکہ تحقیقی بھی ہے۔

متنِ مضمون میں قاضی صاحب نے قاطعِ برہان وغیرہ سے لے کر متعدد فارسی الفاظ ومحاورات پر جو بحث کی ہے اور ایک ایک دعوے کی دلیل کے طور پر فارسی ادبیات سے اسناد کا جو انبار لگا دیا ہے اسے دیکھ کر غش غش کرنا پڑتا ہے۔ اسناد کی یہ کثرت بعض اوقات غیر ضروری مشقت کے مترادف ہو گئی ہے۔

انھوں نے یہ بھی دکھایا کہ غالب نے اسناد پیش کرنے کے معاملے میں غلط بیانی سے کام لیا ہے۔ قاضی صاحب نے غالب کی عربی سے ناواقفیت کی مثالیں تو دیں لیکن یہ عنوان بھی قائم کیا کہ غالب فارسی زبان وادب سے ناقص معلومات رکھتا تھا۔ فارسی زبان کی حد تک جو کچھ بھی کہا جائے تخلیق ادب کے لئے فارسی ادب کا جس قدر عرفان ضروری تھا وہ غالب کو تھا۔ اور قاضی صاحب کی یہ کہنے کی کوشش کہ غالب اردو زبان سے بھی واقفیت نہیں رکھتا تھا بے سود ہے۔ اردو ادب کے اتنے بڑے تخلیق کار پر یہ اعتراض محض لکھتی حیثیت رکھتا ہے۔ غالب عربی بالکل نہ جانتا ہو، فارسی قدیم کم جانتا ہو لیکن اس کی اردو پر اعتراض کرنا آفتاب پر خاک پھینکنے کے مترادف ہے۔

سنہ ۱۹۵۲ء کے رسالہ "اردو ادب" کے دو شماروں میں شوکت سبزواری نے ایک بہت طویل مضمون 'ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں' کے عنوان سے لکھا جس میں قاضی صاحب کے مندرجہ بالا مضمون پر تنقید کی۔ چونکہ یہ مضمون میری نظر سے نہیں گزرا اس لئے میں اس پر رائے دینے سے قاصر ہوں لیکن جولائی ستمبر ۱۹۵۲ء کے "اردو ادب" میں

اڈیٹر نے معذرت شائع کی جس میں لکھا تھا کہ شوکت سبزواری سے کچھ سہو ہوا۔

(۳) غالب اور ذالِ فارسی۔ "آج کل" فروری ۵۲ء

(۴) دیوانِ غالب کے دو نسخے۔ معاصر ۱۲ - اس مضمون میں دیوانِ غالب کے نسخۂ حمیدیہ اور نسخۂ شیرانی سے بحث کی ہے۔ ان دونوں نسخوں پر تبصرہ بھی ہے اور ان کا تقابلی مطالعہ بھی یعنی اختلافِ نسخ بھی۔ اس سے مضمون نگار کی محنت کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ یہ مضمون ناتمام ہے اس کا تکملہ آئندہ لکھا جائے گا۔ غالباً یہ تکملہ نہیں آیا۔

(۵) جہانِ غالب۔ اس عنوان سے وہ وقتاً فوقتاً مختلف رسالوں میں مضمون لکھتے رہے ہیں۔ ظاہراً یہ غالب سے متعلق ایک قسم کی سائیکلو پیڈیا کے اجزا ہیں۔ اس میں کسی لفظ مثلاً آم، پان وغیرہ کو لے کر غالب کے تعلق سے اس کے بارے میں جو کچھ ملتا ہے لکھ دیا جاتا ہے۔ اگر یہ کام مکمل ہو جائے تو اپنی نوع کا منفرد کام ہو۔

اور قاضی صاحب نے غالب سے متعلق کم از کم ایک کتاب ترتیب دی ہے۔ جب ڈاکٹر ذاکر حسین بہار کے گورنر تھے قاضی صاحب نے ان کے سامنے تجویز رکھی کہ غالب صد سالہ برسی کے موقع پر غالب کی نظم و نثر فارسی وار دو کو گیارہ یا زیادہ جلدوں میں مرتب کیا جائے۔ تجویز مان لی گئی اور اس سلسلے کی پہلی کڑی "قاطعِ برہان و رسائلِ متعلقہ" ہے جو ۱۹۶۶ء میں شائع ہوئی۔ اس میں قاطعِ برہان، سوالاتِ عبدالکریم، لطائفِ غیبی، نامۂ غالب اور تیغِ تیز شامل ہیں۔ انھیں قاضی صاحب نے مرتب کیا ہے اور مالک رام اور رشید حسن خان نے تصحیح کی ہے۔ اس طرح ان نادر کتابوں کا صحیح متن سامنے آگیا۔ جلد میں تفصیلی مقدمہ یا حواشی نہیں۔ یہ ارادہ ظاہر کیا گیا ہے کہ دوسری جلد ان سب کتابوں کے حواشی پر مشتمل ہوگی۔ یہ جلد کبھی شائع نہ ہو سکی اور اس سلسلے کی کوئی دوسری کتاب بھی چھپ کر سامنے نہیں آئی۔

میر و غالب پر قاضی صاحب کی تحقیقات کا یہ اچھا نتیجہ نکلا کہ یہ ادیب صحیح رنگ میں

سامنے آگئے۔ انسانی کمزوریوں کے ساتھ یہ کچھ اور زیادہ جاذب نظر ہو گئے۔ ان دونوں کی غلط بیانیوں کا پردہ چاک کر کے قاضی صاحب نے صداقت کی بڑی خدمت کی۔

قاضی صاحب کی متفرق تحریروں پر اظہارِ خیال کر کے مجموعی حیثیت سے ان کی بعض خصوصی خوبیوں اور خامیوں کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔ اول خوبیوں کو لیجیے۔

(۱) انھوں نے تحقیق میں صحت و قطعیت پر زور دیا۔ اس کے صرف چند مظاہر درج کیے جاتے ہیں ا۔ وہ یہ برداشت نہیں کر سکتے کہ ہجری سال کی عیسوی سے مطابقت کرتے وقت صرف ایک سنہ درج کیا جائے۔ لکھتے ہیں۔

"مہینا اور بعض صورتوں میں تاریخ بھی معلوم نہ ہو تو دو سنہ دینے چاہئیں"

(عبدالحق بحیثیت محقق معاصر ۱۲ ص ۱۰۰)

(۲) ان کی قطعیت پرستی متقاضی ہے کہ نام پورے اور صحیح لکھے جائیں۔ بعض ناموں کی وہ یوں تصحیح کرتے ہیں۔

اصغر علی نہیں اصغر علی خاں (تبصرہ گلشن ہند۔ معاصر ۱۵ ص ۸۲)

ضیا کا نام میر ضیاالدین نہیں ضیاالدین حسین تھا۔

(مثنویاتِ راسخ پر تبصرہ۔ ہماری زبان ۱۵ نومبر ۵۸ء ص ۷)

'ایک تذکرے کا نام حسرت افزا لکھا ہے حالانکہ لفظ تذکرہ جزوِ اسم ہے'

(ہماری زبان ۲۲ نومبر ۵۸ء ص ۸)

'شیخ محمد چاند۔ کسی کے نام میں اضافہ مناسب نہیں۔ مرحوم نے خود مجھے لکھا تھا کہ چاند سے قبل محمد نہ لکھنا چاہئے'

(دلی کا دبستانِ شاعری پر تبصرہ۔ ہماری زبان یکم مارچ ۵۹ء ص ۱)

"میاں ثنا اللہ فراق نہیں، ثنا اللہ خاں فراق چاہیے" (ہماری زبان۔ ۸ مارچ ۵۹ء ص ۱۵)

راقم الحروف نے ان کے سامنے ایک بار کلیم الدین کہا تو انہوں نے ٹوکا کہ پورا نام کلیم الدین احمد ہے محض کلیم الدین نہیں کہنا چاہیے چنانچہ انھوں نے نقوش کے شخصیات نمبر جنوری ۵۵ء میں جناب کلیم پر جو مضمون لکھا ہے اس میں بالالتزام کلیم الدین احمد لکھا ہے لیکن ایک جگہ چوک ہو گئی۔

'کلیم الدین صاحب کم سخن ہی نہیں'... (ص ۴۹۵)

ہو سکتا ہے یہ کاتب کی فروگذاشت ہو

(۴) الفاظ کے استعمال میں وہ کسی مبالغہ یا افراط و تفریط کو برداشت نہیں کرسکتے چند مثالیں۔

(الف)۔ ڈاکٹر ممتاز احمد نے پٹنہ کے بارے میں لکھا ہے۔

' اس زمانے کی سوسائٹی کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ ہر شخص کا سینہ کینہ سے بھرا ہوا تھا' قاضی صاحب کا تبصرہ عظیم آباد میں کوئی زمانہ ایسا نہیں رہا جس پر یہ قول صادق آسکے کہ

' ہر شخص کا سینہ کینے سے بھرا ہوا تھا' (ہماری زبان ۸ نومبر ۵۸ء ص ۹)

(ب) ڈاکٹر ممتاز احمد نے لکھا تھا' یہ بات ثابت ہے کہ جہاں تک اردو زبان کی خدمت کا تعلق ہے عظیم آباد ہندوستان کے کسی دوسرے مرکز سے فروتر نہیں رہا۔

"قاضی صاحب کا وطن بھی عظیم آباد ہے اور وہ وہیں بیٹھ کر تبصرہ لکھ رہے ہیں یہ علائق انھیں صحت کی راہ سے نہیں ہٹا سکتے۔ انھوں نے مندرجہ بیان پر اعتراض کیا "اس پر داد بھی مل سکتی ہے لیکن حقیقت کا اس سے کیا تعلق ہے یہ جداگانہ معاملہ ہے"

(ہماری زبان ۱۵ نومبر ۵۸ء ص ۸)

(ج) ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی نے دلی کا دبستان شاعری میں جرأت کے بارے میں میر کے قول کا حوالہ دیتے ہوئے 'چوما چاٹی' کا لفظ استعمال کیا۔ قاضی صاحب نے فوراً ٹوکا۔

"قاسم نے جو مانا جانا لکھا ہے، اسے بدلنے کا کسی کو حق نہیں پہنچتا۔ اسے غلط سمجھ کر اس کا اظہار کرنا اور بات ہے" (ہماری زبان یکم مارچ ۵۹ء ص ۲)

(د) عبدالحق نے انتخابِ کلامِ میر کے دیباچے میں لکھا ہے

"دلی سے اجڑنے کے بعد لکھنؤ آباد نظر آتا تھا... جو اٹھا وہیں پہنچا اور پہنچ کر وہیں کا ہو رہا" (کذا)

بادی النظر میں کون ان جملوں سے اختلاف کر سکتا ہے لیکن قاضی صاحب نے جو ایک ایک لفظ کے مفہوم کو تولتے ہیں کہا کہ یہ صحیح نہیں کہ جس نے دہلی چھوڑی لکھنؤ ہی پہنچا یا وہاں پہنچا تو "لازماً" وہیں کا ہو گیا۔ انھوں نے بتایا کہ بیان دہلی چھوڑ کر دکن گئے اور کئی شعرا دلی سے لکھنؤ جانے کے بعد دوسرے مقامات پر چلے گئے (معاصر ۱۴۔ ص ۳۸)

(ہ) مصحفی نے ریاض الفصحا میں اپنی عمر قریب ہشتاد بتائی ہے۔ عبدالحق نے لکھ دیا کہ مصحفی نے اپنی عمر ۸۰ سال بتائی ہے۔ اس پر قاضی صاحب لکھتے ہیں

"ظاہراً ہشتاد اور قریب بہ ہشتاد میں ان کے نزدیک کچھ فرق نہیں"

(معاصر ۱۵۔ ص ۹۲)

(و) رسالہ تحریر شمارہ ۱۔ ص ۱۲۹ میں لکھا تھا "لکھنؤ سے چند میل کے فاصلے پر علما و فضلا کا ایک بہت بڑا مرکز کاکوری رہا ہے"۔ قاضی صاحب لکھتے ہیں

"بہت بڑا" محض برائے آرائش ہے "صرف مرکز" لکھنا تھا"

(اصولِ تحقیق۔ آج کل اگست ۶۱ء ص ۵)

(ز) تحریر شمارہ ۱۔ ص ۱۳۰ میں ساحر کاکوروی کے مشہور اور قابل شاگردوں کے جو نام دیے ہیں ان میں کئی بالکل گمنام ہیں۔ انھیں مشہور کہنے پر اعتراض ہے (ایضاً)

مندرجہ بالا جملے ڈاکٹر سید امیر حسن عابدی کے ہیں۔

(۲) وہ تلاش مواد میں ادبی ماخذ کے علاوہ غیر ادبی ماخذ کو بھی کھنگالتے ہیں اور کہاں کہاں سے اپنے کام کی بات معلوم کر کے لاتے ہیں مثلاً ولی کے مصرع

ع حسن کی دلی کا صوبہ ہے محمد یار خاں

کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ ۱۱۱۵ھ عالمگیری میں واقعی دہلی کا صوبہ دار محمد یار خاں تھا۔

(دلی کا دبستانِ شاعری، ہماری زبان ۸ فروری ۱۹۶۴ ص ۱)

فائز دہلوی کا نام تذکرۃ السلاطین چغتا سے اور فائز کے والد کا نام تیز فائز کی تاریخ وفات تاریخ محمدی سے معلوم کی۔ یہ سب قاضی صاحب ہی کر سکتے ہیں۔

(۳) وہ کمزور سند کو قبول نہیں کر سکتے۔ بلکہ کڑی سے کڑی شہادت ہی مانتے ہیں مثلاً مجھ سے گفتگو میں کہا کہ خسرو سے منسوب، زر گر پسرے چو ماہ پارا، والا قطعہ اس لیے تسلیم نہیں کیا جا سکتا کہ اسے میر سے پہلے کسی نے درج نہیں کیا۔ وہ سب رس میں منقول خسرو کے دوہے کو بھی اس لیے نہیں مانتے کہ وجہی اور خسرو میں کئی صدیوں کا فصل ہے انھیں زیادہ معتبر شہادت چاہیے

(۴) وہ غیر معمولی تلاش و تفحص سے کام لینے کے قائل ہیں مثلاً:۔

الف ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی نے کہا تھا کہ میر، نے زبان کی صفائی کے شوق میں ناسخ کی طرح ہندوستانیت سے بالکل قطع تعلق نہیں کیا؛ قاضی صاحب نے اس کی تردید کے لیے ناسخ کے دونوں دیوانوں کو چھان کر ان میں ہندوستانیت کی مثالیں شمار کیں۔

(عیارستان مطبوعہ ص ۱۰۶ - اصل صفحہ ۸۰)

ب تمنا عمادی نے بعض جیست غزلوں کو طپاں مرثیہ گو سے منسوب کیا تھا۔ قاضی صاحب ان غزلوں کا انتساب یہ کہہ کر رد کر سکتے تھے کہ اس کے مرثیوں کی ناقص زبان کے دیکھتے ان غزلوں کو اس کی تصنیف نہیں مانا جا سکتا۔ لیکن قاضی صاحب بے دلیل دعوے

پتا نخ نہ ہوئے اور اس کے مرثیوں سے پہلے تئیں ۴۹ اقتباسات دے کر ثابت کر دیا کہ ایسا پوچ گو ان غزلوں کا خالق نہیں ہو سکتا۔

(بہار میں اردو زبان وادب کا ارتقا۔ نوائے ادب جولائی ۵۹ء ص ۵)

ج ڈاکٹر فاروقی نے اپنی کتاب میں میر کے عشق کی رفعت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا کہ "انھوں نے سماج کی ایک شریف زادی سے محبت کی تھی"۔ قاضی صاحب نے اس کی تردید میں میر کے یہاں سے متعدد ایسے اشعار اقتباس کیے جن میں عشق سفیہانہ اور محبوب سفیہہ تھا۔

د جعفر علی خاں اثر نے مطالعۂ غالب میں لکھا تھا

"غالب کے خطوط پڑھیے میر کے اشعار قلم برداشتہ لکھتے جاتے ہیں . . اس کے کلام کا انتخاب کیا تھا اور یہ کام گہرے اور مسلسل مطالعے کے بغیر سرانجام نہیں ہو سکتا"۔ اور کوئی ہوتا تو اس بیان کو پڑھ کر باور کر لیتا لیکن قاضی صاحب نے چھان بین کے بعد لکھا کہ غالب کے خطوط میں میر کا ایک شعر ملتا ہے جو کلیات میں نہیں اور نہ جانے کس کا ہے۔ اس کے علاوہ ایک مصرع ملتا ہے وہ بھی کلیات میں نہیں۔ یہ بھی صحیح نہیں کہ غالب نے میر کے کلام کا انتخاب کیا تھا (مطالعۂ غالب پر تبصرہ۔ معاصر ۸ ص ۱۴۲)

ثبوت فراہم کرنے میں وہ جس غیر معتدل محنت کا مظاہرہ کرتے ہیں وہ بعض اوقات غیر ضروری کی حد تک پہنچ جاتا ہے مثلاً اوپر کی مثالوں میں ناسخ کی ہندوستانیت ثابت کرنے کے لیے دونوں دیوانوں کو پوری طرح چھان لینا یا طپاں کی ناقص زبان کے ثبوت کے لئے ۴۹ مثالیں دینا۔ غالب کا خیال تھا کہ کافِ تصغیر نہ اللہ کا استعمال مناسب نہیں۔ قاضی صاحب نے "غالب بحیثیت محقق" میں ایرانیوں کے یہاں سے کئی سو اسناد پیش کر دیں (نقد غالب ص ۵۱۰ سے ۵۲۴ تک)۔ غالب کا یہ بھی خیال تھا کہ جس لفظ کے آخر میں

جمع کا عربی یا احتمالات ہو وہ لفظاً لازماً عربی ہے۔ قاضی صاحب نے اس کی تردید میں کم از کم سو مثالیں پیش کر دیں (ایضاً ص ۴۳۰)

ان تمام صورتوں میں چند مثالیں اور اسناد کافی تھیں۔ غیر متوازن محنت اپنے وقت اور صلاحیتوں کا غلط استعمال ہے۔

تلاش و اسناد کی اس فراوانی کے باوجود بعض اوقات وہ تن آسانی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ وہ بعض ایسی کتابوں سے بھی حوالے نہیں دیتے جو خود ان کے پاس ہونی چاہئیں یا پٹنے میں مل سکتی تھیں۔ بعض اوقات وہ فرطِ احتیاط کے سبب مضمون کی ابتدا ہی میں اعتراف کر لیتے ہیں کہ انھیں اپنی سند یا حوالوں پر پورا اعتماد نہیں۔ قدرے کوشش سے یہ کوتاہیاں رفع ہو سکتی تھیں۔ بعض اوقات وہ اپنی دو تحریروں میں امکانی تضاد کا خدشہ ظاہر کرتے ہیں۔ اگر ایسا ہے تو انھیں اس قسم کی سابق تحریروں کو چھان کر دیکھنا چاہیے۔

ذیل میں ان کی تحریروں سے ایسے اقوال درج کیے جاتے ہیں جو مضمون کے پایۂ اعتبار میں تذبذب پیدا کرتے ہیں۔ میں اول ایسے قول درج کر کے بعد میں اپنا تبصرہ لکھتا چلوں گا۔

(۱) کمزور یا ناکافی حوالے:

۱۔ "سعادت علی امروہوی کے والد میر غلام علی عشرت تھے ص ۵۶۔ یہ تذکرۂ سرور کے حوالے سے مرقوم ہے لیکن دراصل فہرستِ اشپرنگر سے لیا گیا ہے۔ تذکرۂ مذکور اس وقت پیشِ نظر نہیں لیکن یقین کامل ہے کہ سرور نے یہ نہ لکھا ہوگا

(عیارستان۔ معاصر حصہ ۹ کا ص ۱۵۵۔ دراصل ص ۴۲)

جب یقین کامل سے لکھا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ تذکرہ قاضی صاحب کی نظر سے گزر چکا ہے۔ وہ کوشش کرتے تو اس حوالے کو پھر دیکھ لیتے۔ سرور نے واقعی میر سعادت علی کے والد کا نام میر غلام علی عشرت لکھا ہے لیکن یہ میر سعادت علی امروہوی نہیں بریلوی ہیں (تذکرۂ سرور ص ۲۴۶) میر سعادت علی امروہوی کا ذکر

ص ۲۵۳ پر ہے۔ ڈاکٹر فاروقی نے دونوں میں خلط کر دیا۔

(۲) " زحالِ مسکیں الخ " جہاں تک مجھے یاد آتا ہے شیرانی نے جعفر کے نام لکھی ہے، امیر خسرو کی یقیناً نہیں (معیارستان ص ۱۹۰ - دراصل ص ۱۹۱)

" صفت ملمّع والی غزل تو میرے خیال میں شیرانی نے ثابت کر دیا ہے کہ ان کی نہیں "

(آزاد بحیثیت محقق ۔ نوائے ادب اکتوبر ۵۶ء)

شیرانی نے مجموعۂ نغز میں یہ غزل خسرو کے نام ہی سے دی ہے اور اس کی تردید نہیں کی۔ " پنجاب میں اردو " میں بھی خسرو سے انحراف نہیں کیا۔ جعفر کے نام ان دونوں کتابوں میں نہیں۔ قاضی صاحب ذرا سی کوشش کرتے تو ان حوالوں کو دیکھ سکتے تھے۔

(۳) " اس مقالے میں ۔۔۔ جو اعتراض ہیں ان میں سے کچھ اوروں کے یہاں بھی ہیں۔ میں چاہتا تھا کہ ایسی صورت میں معترضِ اول کا ذکر ضرور کیا جائے لیکن افسوس ہے کہ اس کا التزام نہ ہو سکا " (غالب بحیثیت محقق ۔ نقدِ غالب ص ۳۴۵)

بہتر ہے کہ اہم اعتراضات کی صورت میں معترضِ اول کا ذکر ضرور کیا جاتا۔ شوکت سبزواری نے اپنے جوابیہ مضمون " ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں " اردو ادب ۵۲ء میں کہا تھا کہ قاضی صاحب محقق نہیں ناقل ہیں۔ کیا یہ اسی اعتراض کے پیشِ نظر کہا گیا ہے؟

(۴) میں نے اپنی کسی تحریر میں کسی فہرست کے حوالے سے لکھا تھا کہ مجمع الفرس ایران میں طبع ہو چکی ہے لیکن بعد کو ایرانیوں سے اس کے متعلق دریافت کیا تو کوئی شخص ایسا نہیں نکلا جو اس سے واقف ہو۔ فہرست نگار کا بیان غلط معلوم ہوتا ہے۔ (معاصر ۱۲ - ص ۱۷۱)

' کسی تحریر '، ' کسی فہرست '، کتنی غیر واضح صورت حال ہے۔ تلاش کر کے اپنی تحریر کا صحیح حوالہ دے سکتے تھے۔ وہ شاید یہ فرض کر لیتے ہیں کہ ان کے مضمون کے صحیح شمار سے ہر شخص واقف ہے اس لیے اس کے بارے میں سرسری حوالے پر قناعت کر لیتے ہیں خو

الف اطلاعِ فارسی سے دلچسپی رکھنے والے فرہنگستانِ ایران کے رسالے میں جو بسیط مقالہ اس پر چھپا تھا دیکھیں، (اشتر و سوزن ص ۵۵)

کس شمارے میں کس عنوان سے کس کا مضمون ہے ؟ غالباً قاضی صاحب کا۔

ب "کہانی" کا تبصرہ پہلے صبح (دہلی) میں شائع ہوا تھا (اشتر و سوزن ص ۱۲۹)
کس شمارے میں ؟

ج مخط کا مزودی حصہ میں نے نقوش میں شائع کر دیا تھا،

(معاصر ۱۳۔ ص ۱۰۱ فٹ نوٹ)

اگر وہ بتا دیتے کہ نقوش کے کس شمارے میں تھا تو ہم اسے تلاش کر کے دیکھ سکتے تھے۔

د "جس طویل قصیدے میں یہ شامل ہے وہ غالباً احسن، شاگردِ سودا کا ہے (مصحفی و انشا")
عیارستان مطبوعہ ص ۹۹ ، دراصل ص ۸۰)

مندرجہ بالا بیان کو پڑھ کر کوئی کیونکر سمجھے کہ "مصحفی و انشا" کوئی کتاب ہے یا مضمون ہے۔ اگر مضمون ہے تو کس کا ہے اور کس پرچے میں شائع ہوا۔

(ب) موجودہ اور سابق تحریر میں تضاد

⑤ اگر میرے کسی مضمون میں تعداد ۳۰ سے کم درج ہے تو یہ غلط ہے

(عیارستان مطبوعہ ص ۱۷۷ ، دراصل ص ۱۴۶ فٹ نوٹ)

یہ بات میر کی واسوختوں کے بارے میں ہے۔ انھیں تلاش کرنا چاہیئے تھا کہ اپنے کس مضمون میں میر کی واسوختوں کا ذکر کیا ہے اور وہاں کیا تعداد دی ہے۔ اپنے مضمون کے اندراجات کو تلاش کرنا اتنا مشکل نہیں۔

⑥ ممکن ہے کہ سابق میں میں نے کوئی بات مختلف طور پر لکھی ہو، تبدیلِ رائے کا ذکر لازماً نہیں کیا گیا (مثنویاتِ راسخ پر تبصرہ۔ ہماری زبان ۸ نومبر ۱۹۵۸ء ص ۷)

۷ اس مقالے میں کچھ امور ممکن ہے کہ میری کسی سابق تحریر کے مطابق نہ ہوں میں نے ہر جگہ صراحتہً اس کا ذکر ضروری تصور نہیں کیا (معاصر ۱۳- ص ۸۹)

کسی غیر اہم امر میں تبدیلی کرلی گئی ہے تو قابلِ ذکر نہیں لیکن اگر کسی اہم فیصلے میں ترمیم کی گئی ہے تو انھیں سابق تحریر کا حوالہ دینا چاہیے۔ مصنف کو اپنی موجودہ اور سابق تحریروں کے مطالب سے خبردار رہنا چاہیئے۔ اگر وہ محسوس کرتا ہے کہ سابق میں اس نے کوئی بات غلط لکھ دی تھی تو اس موضوع پر بعد میں لکھتے وقت اپنی غلطی کی بھی اسی طرح نشان دہی کرنی چاہیے جس طرح دوسروں کی غلطی کی۔

(ج) نقشِ اوّل کو رد کرنا

۸ "کہانی کا تبصرہ پہلے صبح (دہلی) میں شائع ہوا تھا۔ اسے اب کالعدم سمجھا جائے۔

(اشتر وسوزن۔ ملحقات ص ۱۲۹)

۹ 'غالب بہ حیثیت محقق' کے عنوان سے میرا ایک مقالہ علی گڑھ میگزین کے غالب نمبر میں اشاعت پذیر ہوا تھا۔ بہت عجلت میں لکھا تھا..... یہ کالعدم سمجھا جائے اور مجھے اس کے متعلق ہر قسم کی ذمہ داری سے بری قرار دیا جائے...... اگر اس میں کوئی بات پہلے مقالے سے مختلف طور پر ملے تو یہ خیال کرنا چاہیے کہ راقم کے نزدیک اسی طرح صحیح ہے۔

(غالب بحیثیت محقق۔ نقدِ غالب ص ۲۴۵)

۱۰ ص۱۵۳، ص۱۵۵ کی ان عبارتوں کو جن میں شعر میر کی خوبصورتی اور شعریت کی طرف اشارہ ہے کالعدم سمجھا جائے۔ (معاصر ۱۳، ص ۱۷۷)

آخری اضافہ مضمون کے اسی شمارے میں شائع ہوا ہے۔ وہ اپنی رایوں کو اتنی تیزی سے کالعدم قرار دیں گے تو کوئی ان کی تحریروں کا کیونکر جائزہ لے گا۔ اس کے علاوہ کوئی 'صبح' میں 'کہانی' پر تبصرہ یا علی گڑھ میگزین میں مضمون کا نقشِ اول دیکھے گا تو اسے کیونکر معلوم ہوگا

کہ یہ پہلے کا پورا کالعدم قرار دے دیا گیا ہے۔ اگر وہ اس بے محابا طریقے سے اپنی تحریروں پر قلم تنسیخ کھینچیں گے تو قاری کو ان کی ہر تحریر پڑھتے وقت یہ کھٹکا رہے گا کہ کہیں اسے کالعدم تو قرار نہیں دے دیا گیا۔ معبدالحق بحیثیت محقق والے معاصر ۱۳ پر کوئی سنہ اور مہینہ نہیں دیا۔ کوئی معاصر ۱۳ میں اور ان کے کسی دوسرے مضمون میں ایک ہی بات کو مختلف طور سے دیکھے تو کیونکر جانے کہ کون سی رائے آخری ہے۔

(د) اپنی تحریر میں غلطی کے امکان کا اظہار:

(۱۱) "جلد اول (تاسی کی تاریخ ادبیاتِ ہندی وہندوستانی) مجھے قبل از وقت واپس کرنی پڑی۔ اس مقالے میں کوئی بات مبہم، نامکمل یا غلط ہے تو اس کی طرف آئندہ توجہ کی جائے گی۔" (معاصر ۱۱ ص ۴۶)

(۱۲) "بعض یادداشتیں عجلت میں لکھی گئی تھیں اس لیے اس کا احتمال ہے کہ صفحے یا ورق کا ہندسہ غلط نقل ہو گیا ہو۔" (غالب بحیثیت محقق۔ نقدِ غالب ص ۳۴)

اس مضمون کی تصحیح واضافہ میں ص ۵۴۹ پر خبر دیتے ہیں کہ اس مقالے کا مسودہ کم و بیش ایک سال کی مدت میں باقساط علی گڑھ بھیجا گیا تھا۔ اتنی مدت سے لکھے ہوئے مقالے میں حوالے غلط ہوں تو کیا نہیں؟

(۱۳) "علی گڑھ آنے سے پیشتر میں سے متعلق جو یادداشت جلدی میں میں نے لکھی وہ جب علی گڑھ میں مقالہ لکھنے لگا تو ناکافی اور بعض جگہ غیر واضح پائی گئی۔ پٹنہ واپس پہنچنے کے بعد اگر کوئی غلطی رہ گئی ہو تو میں اس کی تصحیح کر دیں یا کوئی ضروری بات چھوٹ گئی ہو تو اسے بڑھا سکوں۔" (غالب کے کلیاتِ نظمِ فارسی کا ایک قدیم نسخہ۔ رسالہ اردوئے معلّی دلّی غالب نمبر فروری ۱۹۶۰ء ص ۴۶)

(۱۴) "یہ تبصرہ سال دو سال قبل سپردِ قلم ہوا... اس وقت نظرِ ثانی اور اضافے کی ضرورت

محسوس ہوئی تو کتاب نہ مل سکی۔ اگر ایسا کوئی بات جو مصنف نے نہیں لکھی ان کی طرف منسوب کر دی گئی ہے تو کتاب کے پھر دیکھنے کے بعد صحیح صورتِ حال ظاہر کر دی جائے گی،

(دلی کا دبستان شاعری پر تبصرہ - ہماری زبان ۸ فروری ۱۹۵۹ء ص ۱)

اگر انھیں اس کا اندیشہ تھا کہ تبصرے میں اس حد تک غیر ذمے داری ممکن ہے کہ مصنف نے جو کچھ نہیں لکھا وہ ان کی طرف منسوب کر دیا گیا ہوگا تو مضمون کو روک لینا چاہیے تھا اور ' دلی کا دبستانِ شاعری ' کو حاصل کر کے ملا لینا چاہیے تھا۔ یہ کتاب نایاب نہیں۔ مضمون جہاں سال دو سال شائع نہیں ہوا کچھ اور پڑا رہتا تو کوئی قباحت نہ تھی۔

⑮ نسخۂ لندن کی نقل اس وقت سامنے نہیں ہے۔ اس سے متعلق یادداشت (دمی) پیشِ نظر ہے۔ اس کے کچھ الفاظ اچھی طرح پڑھے نہیں جاتے، ممکن ہے نقل ہی میں اس طور پر ہوں، یا ی میں بے احتیاطی کی بدولت صحیح نقل نہ ہوئے ہوں۔۔۔ وقتِ تحریر شعرا کے دواوین کی طرف رجوع نہ کر سکا (اشتر و سوزن ص ۵۸)

(ہ) اپنی تحریر میں بے ترتیبی کا اعتراف

⑯ 'بہت سی ضروری باتیں چھوٹ گئی ہیں۔ ممکن ہے کچھ غیر ضروری بھی داخل ہو گئی ہوں۔ ترتیب بھی ٹھیک نہیں' (نقوش آپ بیتی نمبر جون ۱۹۶۴ء جلد ۲۔ ص ۱۰۲۱)

⑰ 'اصولِ تحقیق پر کوئی باقاعدہ مقالہ لکھنا مدِنظر نہیں۔ چند سرسری باتیں جس ترتیب سے ذہن میں آئیں گی، قلم بند کر دی جائیں گی۔

(اصولِ تحقیق - آج کل اردو تحقیق نمبر اگست ۱۹۶۷ء ص ۴)

آپ اردو تحقیق کے خاص نمبر میں ' اصولِ تحقیق ' کے اہم بات ان عنوان سے لکھ رہے ہیں پھر یہ سہل انگاری کیوں کہ سرسری باتیں بے ترتیبی سے لکھ دی جائیں گی۔ خیالات کو مجتمع

کرکے باقاعدہ مضمون کیوں نہ لکھیں گے۔

(و) دعوے کا ثبوت حذف

(۱۸) ہر دعوے کا ثبوت التزاماً پیش نہیں ہوا۔ یہ طولِ کلام سے بچنے کے لیے ہے۔ کسی کی صحت میں شک ہو تو اسناد حاضر کئے جا سکتے ہیں (اشتر و سوزن ص ۵)

وجہ صحیح ہے لیکن اگر دعویٰ اہم ہے یا عام رائے کے خلاف ہے تو ثبوت لازماً دینا چاہیے۔ ثبوت ساتھ میں ہو تو ہر قاری اپنے طور پر اسے جانچ کر طے کر سکے گا کہ ثبوت مدلل و شافی ہے کہ نہیں۔

اب میں ان کی تین معمولی سی کمزوریوں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔

(۱) ان کے بعض مضامین کے شروع میں (۲) دیا ہو تو یہ لازمی نہیں کہ اس سے پہلے کی قسط اس سے فوراً پہلے شمارے میں ہوگی۔ نہیں۔ بہت ممکن ہے کہ وہ سال دو سال قبل شائع ہوئی ہو مثلاً "کچھ انشا کے بارے میں" کی پہلی قسط نوائے ادب جنوری ۱۹۵۱ء میں اور دوسری اکتوبر ۱۹۵۳ء میں ہے۔ اسی طرح 'برہان قاطع اور ہندوستان' کی پہلی قسط نوائے ادب اکتوبر ۱۹۵۳ء میں اور دوسری اپریل ۱۹۵۵ء میں ہے۔ دونوں مضامین کی پہلی قسط کے آخر میں کوئی اشارہ نہیں کہ مضمون ابھی باقی ہے ابتدا میں بھی (۱) نہیں دیا۔ دونوں مضامین کی دوسری قسط سے پہلے یہ نہیں بتایا گیا کہ پہلی قسط کب اور کہاں شائع ہوئی تھی۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ پہلی قسط کو مکمل مضمون سمجھ کر اشاعت کے لئے بھیجا ہوگا۔ سال دو سال بعد اسی موضوع پر اور مواد جمع ہو گیا تو اسے پرانے مضمون کا عنوان دے کر قسط (۲) ظاہر کر دیا گیا۔

(۲) محققوں میں تنقیدی شعور کی کمی یا اپنی دریافت کی محبت کی وجہ سے یہ ہوتا ہے کہ وہ ایسے غیر اہم مطالب کو زیبِ اشاعت لے آتے ہیں جن کے منظرِ عام پر لانے کا کوئی

خاص فائدہ نہیں۔ قاضی صاحب بھی اپنے مطالعات، بزمِ معاصر، تعیینِ زمانہ یا تبصرۂ کتب
میں بعض ایسے غیر اہم شعرا یا نثر نگاروں یا کتابوں کے بارے میں لکھ جاتے ہیں جن کا اردو
ادب میں کوئی مقام نہیں۔

(۳) انھوں نے اپنے مضمون "اصولِ تحقیق" (آج کل اگست ۶۱ء) میں بہت سی
مفید باتیں لکھی ہیں۔ میں ایک کا اضافہ کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ تحقیق میں غلطی کس
سے نہیں ہوتی۔ دوسروں کی غلطی کی نشان دہی کرتے وقت مناسب ہے کہ طعن و تشنیع
سے کام نہ لیا جائے بلکہ نرمی سے اختلاف یا اعتراض پیش کر دیا جائے۔ علمی تحریر کو معرکہ
نہ بننے دیجیے۔ قاضی صاحب نے اپنی نگارشات میں بعض جگہ بڑے چبھتے ہوئے طنز کیے
ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ ان سے ان کے بے رنگ اسلوب میں رنگینی اور دلچسپی پیدا ہو جاتی
ہے لیکن میرے نزدیک ضبط سے کام لے کر غیر دل آزارانہ طریقے سے بات کہنی چاہیے۔
ان طنزیات کے سب سے بڑے ہدف ڈاکٹر عبدالحق اور ڈاکٹر خواجہ احمد
فاروقی ہیں۔ ذیل میں قاضی صاحب کی تحریروں سے طنز کی کچھ مثالیں درج کی جاتی ہیں:

(۱) "رعایت خاں" "مجھے میرے سر کی قسم دینے لگے" ص ۲۱۱ "گوشت شمار البر من مد"
رعایت خاں اور میر کا سر ایک نہیں (عبدالحق بحیثیت محقق ص ۹۳ معاصر ۱۳)

(۲) انتخابِ میر طبعِ اول و طبعِ چہارم دونوں سے ایک شعر کا مشترک غلط متن دریافت
کر کے لکھتے ہیں

"۱۲ برس گزر جانے پر بھی ڈاکٹر عبدالحق کو اس کا احساس نہ ہوا کہ مصرع موزوں
پڑھا جائے تو مصرع ۲ سے وزن میں مختلف ہو جاتا ہے" (معاصر ۱۴۔ ص ۵۹)

(۳) نکات الشعرا میں منقول ایک غلط شعر پر ڈاکٹر عبدالحق کو چیلنج کیا ہے
"وہ یہ بتائیں کہ یہ شعر کس بحر کا ہے اور دونوں مصرعے ہم وزن ہیں یا نہیں"
(معاصر ۱۵۔ ص ۱۵)

شعر مجھا غیر موزوں ہے۔ چیلنج کرنا معرکہ آرائی کا باب وا کرنا ہے

(۴) مولوی صاحب نے گلشن ہند پر مقدمہ اولاً سنہ ۱۹۰۶ء میں لکھا تھا۔ بعد میں وہی ۱۹۳۴ء کے ایڈیشن کے ساتھ شائع ہوا۔ قاضی صاحب لکھتے ہیں

"انھیں اس کے سوا کہ اشتیاق کے بارے میں دو سطروں کا حاشیہ بڑھا دیں ۲۸ برس گزر جانے پر بھی کہیں کچھ گھٹانے، بڑھانے یا بدلنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ اس 'عالمانہ' مقدمے کی کیفیت دیکھیے :" (معاصر ۱۵۔ ص ۳۰)

(۵) گلشن ہند میں ڈاکٹر عبدالحق نے

"میر کے ایک قطعہ (مشتمل بر ۲ شعر) کے شعر آخر کو جو کاے (یعنی کہہ دے) سے شروع ہوتا ہے رکھ کر اور شعر ا کو جو قطعے کا لازمی جزو ہے، (کذا) جس سلامت ذوق کا مظاہرہ کیا ہے وہ داد سے مستغنی ہے (معاصر ۱۵۔ ص ۵۹)

(۶) ظاہرا 'ہشتاد' اور 'قریب بہشتاد' میں ان (عبدالحق) کے نزدیک کچھ فرق نہیں (ایضاً ص ۹۲)

(۷) ۱۲ برس کو "تھوڑے دن" وہی (عبدالحق) کہہ سکتے ہیں۔ اس غلطی کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس سے بے خبر ہیں کہ مصحفی سنہ ۹ھ میں لکھنؤ گئے (ایضاً ص ۹۶)

(۸) ڈاکٹر عبدالحق لازماً یہ نہیں سمجھتے کہ تذکروں کا سال آغاز و انجام ایک ہی ہوا کرتا ہے مگر یہ بات اس وقت ان کے ذہن میں آتی ہے جب مصنف صراحتہً یہ بتا دے۔۔۔۔
۔۔۔ عقد کی تاریخ خود مصحفی نے لکھی اور یہ ۱۱۹۹ھ ہے۔ اس کے بعد زیادہ در دسر کی ضرورت ہی کیا تھی (ایضاً ص ۹۸)

(۹) تذکرۂ سرور (سلسلۂ اشاعت مخطوطات اردو دہلی یونیورسٹی کی پہلی کڑی ہے) اسے دیکھ کر یہ باور کرنے کو جی چاہتا ہے کہ یہ اس غرض سے چھپوایا گیا ہے کہ قدیم متون کی

ترتیب وتصحیح کا کام کرنے والے متنبہ ہو جائیں کہ کس طرح اسے نہ کرنا چاہئے
(اشتر وسوزن۔ پیش گفتار ص ۲)

⑩ البیرونی نے کتاب الہند میں ہندوستانی متون کے بہت سقیم ہونے کی شکایت کی ہے وہ زندہ ہوتا اور اسے اس نسخے (تذکرۂ سرور) کی بنا پر متون کی موجودہ حالت پر اظہارِ رائے کے لیے کہا جاتا تو ہمیں ترقیِ معکوس کی داد دیتا۔ (ایضاً ص ۴)

⑪ دانشگاہِ دہلی صحتِ املا کی طرف سے اتنی ہی بے پرواہ ہے جتنی اس نسخے سے ظاہر ہوتی ہے تو اسے اعلان کر دینا چاہیے کہ امتحان دینے والوں کے جوابات کی جانچ کے وقت املا کا مطلقاً لحاظ نہ ہوگا۔ یہ اعلان ہمہ گیر ہونا چاہیے۔ صرف اردو کے طلبہ کے ساتھ یہ رعایت خلافِ انصاف ہوگی۔ (ایضاً ص ۵)

⑫ کتاب (تذکرۂ سرور) انشائیے سے محروم ہے حالانکہ اس کا سالِ اشاعت ۱۹۶۱ء ہے ۱۸۶۱ء نہیں۔ (اشتر وسوزن ص ۹)

⑬ "احتیاط کے باوجود طباعت میں غلطیاں رہ گئی ہیں، ان کو اردو طباعت کی تعامات سمجھ کر گوارا کیا ہے" یہ عذر اگر نولکشور کی طرف سے ہوتا جو کتابیں بہت ارزاں بیچتے تھے اور سنگی مطبع میں چھپواتے تھے تو سنا بھی جاتا۔ کتاب جلی ٹائپ میں چھپے (بلا حواشی) اور قیمت بھی زیادہ ہو تو قابلِ قبول نہیں۔ (ایضاً ص ۱۰)

⑭ سودا و میر و ذوق و ناسخ وغیرہ کے دواوینِ مطبوعہ میں بعض کو چھوڑ کر کل منائع شدہ اشعار اور مصرعے مل سکتے تھے۔ یہ ممکن ہے کہ مرتب کی دہلی میں یہ دواوین نہ ہوں۔ اس صورت میں گلدستۂ نشاط کی طرح یہ بھی لندن سے عاریتاً مل سکتے تھے۔ (ایضاً ص ۳۲)

⑮ تذکرۂ سرور کے دیباچے میں مرتب نے لکھا تھا کہ انھوں نے الفاظ کا قدیم املا برقرار رکھا ہے جیسے تروار، اس پر قاضی صاحب حاشیہ دیتے ہیں:۔

"شاید یہ دکھانے کے لیے کہ بہترین قاعدہ یہ ہے کہ کسی قاعدے کی پابندی نہ کی جائے اس مطبوعہ میں ایک جگہ "تلوار" بھی آیا ہے ص ۲۹۵ " (ایضاً ص ۵۴)

(۱۶) اوقات گزاری کا نمونہ ذیل میں ملاحظہ ہو۔ یہ صحیح طور پر ہوتی تو دھندلا سی میں فرق آجاتا (ایضاً ص ۵۶)

(۱۷) دانشگاہ علی گڑھ کے شعبۂ اردو کی طرف سے تاریخِ ادبیاتِ اردو کی جو پہلی جلد شائع ہوئی تھی، اس کی ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی تھی کہ عبارتِ نثر ہو یا شعر اگر ایک سے زیادہ مقام پر نقل ہوا ہے تو مستثنیات سے قطعِ نظر اختلافِ متن ضروری ہے

(اصولِ تحقیق۔ آج کل۔ اگست ۱۹۶۷ء ص ۸)

اب میں ان کے اصولِ املا کو لیتا ہوں۔ یہ اختر و سوزن ص ۵۵ اور ۵۶ پر درج ہیں اور ساتھ ہی یہ اشارہ بھی ہے۔

"املائے فارسی سے دلچسپی رکھنے والے فرہنگستانِ ایران کے رسالے میں جو بسیط مقالہ اس پر چھپا تھا دیکھیں"

محض اس ناکافی حوالے کی بنا پر اس مقالے کو تلاش کرنا مشکل ہے۔ بہر حال اختر و سوزن میں جو ہدایات ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ "مرکباتِ مزجی کے مختلف اجزا اس طرح لکھنے چاہئیں کہ ایک لفظ دکھائی دے" اور مثال میں انھوں نے تذکرہ سرور مطبوعہ کے "بےچارہ"، "چناں چہ"، وغیرہ پر اعتراض کیا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ مرکباتِ مزجی کی کیا تعریف ہے لیکن قاضی صاحب کی تحریر میں "بل کہ" (نقدِ غالب ص ۳۴۵) "حال آں کہ" (ایضاً ص، ص ۴) بھی دکھائی دیتے ہیں۔ شاید قاضی صاحب کی مراد یہ ہے کہ "بل کہ"، "حال آں کہ" میں کاف بیانیہ ہے اس لیے الگ لکھا جائے جب کہ "چناں چہ" میں یہ کیفیت نہیں۔ حقیقت یہ ہے

کہ اردو میں ان تینوں کو واحد لفظ سمجھا جاتا ہے اور ان کے اجزائے ترکیبی کا شعور نہیں ہوتا۔ اس لیے اردو میں انھیں ملاکر "چنانچہ، بلکہ، حالانکہ" لکھا جاتا ہے اور لکھا جانا چاہیے۔

قاضی صاحب کا رجحان ہے کہ وہ مرکبات کے اجزا کو ملاکر ہی لکھنا پسند کرتے ہیں مثلاً۔ دوستعلی، ہاتیعلی (تذکرۂ ابنِ طوفاں کی فہرست میں) دانشگاہ، غلطنامہ، کتبخانہ، ہموزن، رامبابو (عیارستان ص ۱۸)، بیپروا وغیرہ۔ لیکن تذکرۂ ابن طوفاں ہی کی فہرست میں انھوں نے اعظم علی بیگ لکھا ہے جس سے ان کا اصول غیر واضح رہ جاتا ہے۔ بہر حال اردو کا جدید رجحان یہ ہے کہ جن مرکبات کے اجزا مستقل لفظ کی حیثیت رکھتے ہیں انھیں الگ لکھا جائے۔ اس سلسلے میں ترقیِ اردو بورڈ کی املا کمیٹی کی سفارشات ملاحظہ ہوں۔

(۱) مرکب لفظ جو دو یا زیادہ لفظوں سے بنے ہوں آپس میں ملاکر نہ لکھے جائیں بلکہ ہمیشہ الگ الگ لکھے جائیں .....

ان جان ۔ ہم رنگ ۔ بت خانہ

(۲) فارسی لاحقوں کو ملاکر لکھنے کی سفارش کی گئی تھی لیکن اس اصول سے وہ چند الفاظ مستثنیٰ کیے گئے "جو جملوں کو ملانے کے لیے کثرت سے استعمال ہوتے ہیں اور جن کی ملی ہوئی شکلیں اس حد تک چلن میں آچکی ہیں کہ ان کو بدلنا آسان نہیں"...... مثلاً

بلکہ، کیونکہ، چنانچہ، چونکہ (املانامہ۔ طبع اول ص ۴۲، ۴۴)

قاضی صاحب آگے لکھتے ہیں۔

"پسینا ہائے مختفی سے ہے، نقشہ، جبہّ اور پردہ الف سے۔"

(اشتر و سوزن ص ۵۶)

اس جملے سے واضح نہیں کہ تذکرۂ سر در میں کیا لکھا ہے اور قاضی صاحب کا کیا موقف

ہے۔ کیا وہ یہ کہہ رہے ہیں کہ تذکرۂ سرور میں "پیناہائے مختفی" سے ہے، نقشہ جبہ اور پردہ الف سے" جو غلط ہے" یا وہ یہ کہنا چاہتے ہیں "پینا ہائے مختفی سے اور نقشہ، جبہ، پردہ الف سے صحیح ہے لیکن تذکرۂ سرور میں اس کے برعکس چھاپا گیا ہے۔

ظاہر ان کا اصولِ املا یہ معلوم ہوتا ہے کہ عربی فارسی الفاظ کا اصل زبان میں جو تلفظ اور املا ہے اردو میں وہی برقرار رکھا جائے مثلاً وہ اصرار کرتے ہیں کہ نیر کی ی کو مفتوح نہیں مکسور لکھنا چاہیئے (نقدِ غالب ص ۵۲۶)۔ پھر ان کا یہ کہنا سمجھ میں نہیں آتا کہ "عربی میں اشیاء، تعضاء درست ہیں لیکن فارسی و اردو میں بدونِ ہمزہ لکھنے چاہئیں" (داشتر وسوزن ص ۵۵)۔ میں بھی ہمزہ کے بغیر لکھنا پسند کرتا ہوں لیکن میں چاہتا ہوں کہ قاضی صاحب دوسرے موقعوں پر بھی پیرویِ عربی پر اردو کے چلن کو ترجیح دیں۔

میں ان کے ذیل کے اصول سے متفق ہوں۔

"اردو میں آخر کا الف یا ہائے مختفی خاص صورتوں میں ی سے بدل جاتے ہیں" ہم سب ان صورتوں میں بولتے یائے مجہول ہیں لیکن لکھتے ہائے مختفی ہیں۔ قاضی صاحب اصرار کرتے ہیں کہ سینہ کینہ سے بھرا ہوا تھا، غلط اور سینے کینے سے بھرا ہوا تھا، صحیح ہے۔

اب ایک ایسی بات جو املا اور اوقاف کے بین بین آتی ہے۔ وہ اپنی تحریروں میں اضافت کا زیر نہیں لگاتے۔ اشعار میں اضافت حذف ہو تو موزوں پڑھنے میں دقت ہوتی ہے۔ ایک مثال

① دیوانِ میر (کاما) ۵۲ شعر اول" الہی جوشِ طوفان بخش چشم اشکبارم را الخ۔

حافظ شیراز نگاہ میر مجلس شد خراب چیست یارانِ طریقت بعد ازیں تدبیر ما۔

(مطالعات۔ معاصر ۱۰ ص ۹۶)

کہیں اضافت نہیں۔ اوّل پر تشدید نہیں اور تشدید کا خوف بھی ان کی عادت

ہے مثلاً معاصر، اکی نظم سفر آشوب میں ٹھیاں (ص ۱۹) عیاش (ص ۲۹)۔ پوری طویل نظم میں کہیں اضافت اور تشدید کا نشان نہیں۔ یہ صحتِ متن کے منافی ہے۔

اب لیجیے ان کے اسلوبِ تحریر کو۔ مجھے اس سے نہایت ناآسودگی ہے۔ یہ مسلم ہے کہ ان کے پاس مواد اور معلومات کا خزانہ ہے لیکن میں بہ صد معذرت عرض کرنا چاہتا ہوں کہ وہ انھیں ترتیب دے کر پیش کرنا نہیں جانتے۔ ان کی تحریر کے چند پہلو یہ ہیں:

(۱) سب سے افسوس ناک بات یہ ہے کہ وہ اپنی تحریروں میں ادبدا کر مخففات کا استعمال کرتے ہیں۔ یہ محنت، وقت اور کاغذ کی کفایت کی خاطر ہو سکتا ہے لیکن انھیں جاننا چاہیے کہ ادبیات نہ الجبرا ہے نہ کیمسٹری۔ سائنسوں میں علامات و مخففات کا استعمال ضروری ہوتا ہے لیکن ادب میں یہ عیب ہی عیب ہے۔ مخففات کی تفصیل وہ کبھی مضمون کی ابتدا میں دیتے ہیں کبھی آخر میں، کبھی فٹ نوٹ میں اور کبھی متن کے بیچ جہاں کتاب کا نام پہلی بار آئے۔ اس طرح جب تک پورا مضمون نہ پڑھ جایئے ہر مخفف کی کنجی ہاتھ نہیں آسکتی۔ اپنے قاموسی مضمون "غالب بحیثیت محقق" کی تمہید میں لکھتے ہیں:

"فہرستِ مآخذ و مخففات وغیرہ خاتمے میں ملے گی۔ مطالعے سے پہلے اس کا دیکھ لینا ضروری ہے" (نقدِ غالب ص ۳۴۷)

اگر اسے پہلے دیکھ لینا ضروری ہے تو آخر میں کیوں دیا شروع ہی میں کیوں نہ درج کیا۔ سچ یہ ہے کہ اگر مخففات استعمال ہی کرنے ہیں تو لازماً ان کی صراحت مضمون کی ابتدا میں ہونی چاہیے۔

ان کی دیکھا دیکھی اور لوگ بھی متن کے مختلف نسخوں کے لیے علامات وضع کرنے لگے ہیں مثلاً عرشی صاحب نسخۂ عرشی میں، لیکن ان لوگوں کے یہاں مخففات کا استعمال نہایت محدود ہوتا ہے۔ قاضی صاحب مخففات کے بغیر تو چل ہی نہیں سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریریں مبہم نہیں بلکہ معمہ معلوم ہوتی ہیں [illegible]

غالب میں "تتمۂ غلط نامہ" کے عنوان (ص ۱۰۵) کے بعد پہلی دو سطریں یہ ہیں۔

"۲۲۵ ۳ سے جو میرا ۴ اور اصل میں اغلاط ۵ استدعا ۹ لازماً ۹، ۱۰ اس مقالے کے لیے جتنے صفحات کی ضرورت تھی، نقدِ غالب میں نہ مل سکے، اس لیے بہت سے ۱۲، ۱۳، موضوع ..... نہیں ہو سکتا (خارج)"

اب اس چیستان کو حل کرتے رہیے۔ وہ بعض اوقات ایسے مخفف وضع کرتے ہیں جن کا کتاب کے نام سے کوئی صریح تعلق نہیں ہوتا مثلاً۔

"خ = کلیاتِ نظم فارسی ... مص = کلیات کا وہ نسخہ جس کی کتابت ۱۲۵۶ھ میں تمام ہوئی (غالب کے کلیاتِ نظم فارسی کا ایک نسخہ۔ رسالہ اردوے معلیٰ غالب نمبر ۱۹۶۰ء۔ ص ۴۰ فٹ نوٹ)

خدا معلوم خ اور مص کا ان مخصوص کتابوں سے کیا تعلق ہے۔

"نوائے ادب" میں اکتوبر ۱۹۵۸ء اور اس کے بعد انھوں نے ڈاکٹر اختر اورینوی کی کتاب 'بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا' پر تبصرہ شائع کیا۔ اس کے پہلے صفحے پر مصنف کے ۵۹ مآخذ کی فہرست دیتے ہیں۔

(۱) سفینۂ خوشگو (۲) چمنستان شعرا (۳) تذکرۂ میر حسن .... ۹ تذکرۂ عشقی .... الخ اور فٹ نوٹ میں لکھتے ہیں کہ مقالے میں ان چیزوں کا حوالہ اس طرح دیا گیا ہے "ک ۱۔ سفینۂ خوشگو، ک ۹۔ تذکرۂ عشقی"

گویا ہر شخص کاغذ کی ایک چٹ پر ان ۵۹ کتابوں کی ایک فہرست لکھ کر رکھے اور مضمون میں ک کے بعد کی گنتی دیکھ کر اس کنجی سے حل کرے کہ کس کتاب کا حوالہ دیا گیا ہے۔ اس

۱۔ متن میں لکھتے ہیں کہ مص کسی مجہول الاسم کاتب نے .... لکھا تھا اور اس کی کتابت ۱۲۵۶ھ کی ۱۵ ذیقعدہ کو تمام ہوئی تھی۔ فٹ نوٹ میں ۱۲۴۵ھ ہے۔ خدا معلوم کونسا نسخہ مراد ہے۔

طرح کے مضامین کسی کمپیوٹر ہی کی مدد سے پڑھے جا سکتے ہیں۔ وہ مخففات میں ریاضی کی علامات + - = وغیرہ کا دل کھول کر استعمال کرتے ہیں جس سے عبارت میں الجبرے کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔

(۲) ان کی مختصر نگاری فہرست، غلطنامہ، اختلاف نسخ، اشاریہ، کتابیات وغیرہ سب میں ہوتی ہے۔ غلط نامہ، اختلافات نسخ اور کتابیات کی غرض یہ ہوتی ہے کہ مضمون میں جو کچھ غیر واضح تھا وہ مزید واضح ہو جائے لیکن قاضی صاحب کی اختصار نویسی اور علامت پسندی ان سب کو چیستان بنا دیتی ہے۔ چند مثالیں۔

(ا) اختلاف نسخ

است (x) وغرض کلی از ایجاد عرض و جواہر (جواہر) وابداع وع و (x) پیکر شناخت مبدع (x) جزو وکل و دریافت صنائع (صانع)

(عہد شاہجہاں کا ایک ادبی مناقشہ اور غالب۔ معاصر ۵ ص ۱۶۵)

وہ منشورات تمنا اور صحائف شرائف سے ایک خط کے اختلافات متن پیش کر رہے ہیں۔ شروع میں علامات کی تصریح کر دی ہے پھر بھی ان اختلافات کو سمجھنا اتنا سہل نہیں۔

ب ماخذ یعنی کتابیات :

انشائے طاہر وحید طل ۱۲۶۰ھ انوری م ۲۵ ون ادحدی م ۱۳۴ بدیعۃ الودیعہ شمائل حزیں برزو برزونامہ کے کئی ہزار اشعار ش ۴ کے آخر میں ہیں (نقد غالب ص ۵۴۶)

یہاں علامات کی تاویل کے باوجود 'م ۲۵ ون' یا 'م ۱۳۴' جیسے اسرار میری سمجھ میں نہیں آتے۔

ج غلط نامہ

$\frac{۶۳}{۸}$ کے انہدام سے $\frac{۶۴}{۴}$ محبت (ناصر) $\frac{۶۶}{۹}$ دو قصیدوں $\frac{۶۶}{۱۶}$

پڑا ۷۶/۱۹ جعفر بھی شاعر ۹۶/۱۹ (سطور ۱۹ تا ۲۱ بطور حاشیہ سطر ۱۵)

(تذکرۂ شعرا از ابنِ طوفان کا غلط نامہ)

دوسروں کے یہاں غلط نامہ درج کرنے کا یہ قاعدہ ہوتا ہے کہ ایک کالم میں صفحے اور سطر کا نمبر دوسرے کالم میں غلط لفظ اور تیسرے میں اس کی تصحیح ہوتی ہے جس سے سب کچھ بتینہ ہوجاتا ہے۔

وہ الفاظ یا کتابوں کی فہرست یا اسناد بھی اختصار کے ساتھ مسلسل جملوں کی طرح لکھتے ہیں جس کی وجہ سے انھیں پڑھنا بار۔ دِہ اور سمجھنا دشوار ہوجاتا ہے۔

اختصار کی وجہ سے وہ سنین کے اندراج میں صدی کے اعداد چھوڑ جاتے ہیں۔ موجودہ صدی کے سلسلے میں یہ جائز ہے اور عام رواج ہے مثلاً ۱۹۷۶ء کی بجائے محض ۷۶ء لکھنا لیکن پیشتر کی صدیوں میں یہ حذف غلط فہمی پیدا کرسکتا ہے۔ حالانکہ سیاق و سباق سے صدی کا پتا چل جاتا ہے لیکن ایسا خطرناک حذف کیا ہی کیوں جائے

مثال:-

ا ادبِ مخففات کے سلسلے میں لکھا گیا۔ "مص = کلیات کا وہ نسخہ جس کی کتابت ۵۲ھ میں تمام ہوئی"۔ ۵۲ھ کے آگے ہجری یا عیسوی کا حرف بھی نہیں۔ اب کیونکر یہ واضح ہو کہ ۱۲۵۲ھ مراد ہے۔

ب معاصر ۱۵ ص ۹۲ پر قاضی صاحب کے قلم سے جو سنین درج ہوئے ہیں وہ یہ ہیں سنہ ۳۶ھ۔ سنہ ۳۶ھ۔ سنہ ۲۱ھ۔ ۲۱ھ۔ سنہ ۳۶ھ۔ سنہ ۳۶ھ۔ سنہ ۳۶ھ۔ سنہ ۲۱ھ۔ سنہ ۵۶ھ۔ سنہ ۵۶ھ

دس سنین میں سے سات پر ہجری و عیسوی کا اشارہ بھی نہیں۔ صدی کا عدد بھی نہیں۔ دیکھیے اور حساب لگایئے کہ ۱۲۲۱ھ ہے ۱۱۲۱ھ۔ ۵۶ھ ہے

یا ۱۹۵۵ء۔ جب وہ دوسروں سے اتنی صحت کے طالب ہیں کہ مسرت افزا یا اصغر علی نہ لکھیں کہ تذکرۂ مسرت افزا اور اصغر علی خاں لکھو تو سنہ جیسے اہم اندراج میں صدی کے اعداد کا حذف ان کے معیار کے مطابق کیونکر جائز ہو سکتا ہے۔

③ ان کے مزاج میں نثریت کی یہ شدت ہے کہ وہ بارہا شعر کو نثر کی طرح جملوں کے سلسلے میں لکھ دیتے ہیں مثلاً عیارستان کی دو تین سطریں ملاحظہ ہوں۔

۳۸، اس کی ولاہی شرط بڑی ہے پہ نجات ۴۲، تیرے پڑھے میں حق ہوا موجود۔ جانتے ہیں تجھی کو سب معبود ۴۳، میرے مولیٰ کی ذات پاک ہے وہ جس کو کہتے ہیں لاشریک لہ ۴۴، وہی احیائے عظام رمیم وہی رحمٰن وہی رؤف و رحیم ۴۸، مسجود تجھ کو جانتے ہیں معبود ہے تو تو ناجی ہیں وے ہی لوگ جنھوں کا ہے یہ یقین ۴۹،

قالب (عیارستان مطبوعہ ص ۱۵۴، در اصل ص ۱۲۵)

وہ پیراگراف بنانے کے بھی قائل نہیں۔ ان کی تحریروں میں بغیر پیراگراف کے صفحے عام ہیں۔ عیارستان میں معاصر ۹ کے ص ۱۵۰ سے ۱۵۸ تک (در اصل ۱۳۰ سے ۱۴۵ تک) ایک پیرا ہے۔

④ ان کے مضامین میں ایک منظم اکائی کا سا دروبست نہیں ہوتا۔ وہ ریزۂ خیال کی شکل پیش کرتے ہیں۔ مختلف حصے ایک دوسرے سے اس طرح چسپاں نہیں ہوتے کہ مقالے میں ابتدا، وسط اور خاتمے کا شعور پیدا ہو سکے۔ انھوں نے آج کل اردو تحقیق نمبر (اگست ۱۹۶۷ء) کے لیے اصولِ تحقیق کے عنوان سے مضمون لکھا تو شروع ہی میں اعتراف کر لیا۔

"اصولِ تحقیق پر کوئی باقاعدہ مقالہ لکھنا مدِنظر نہیں۔ چند سرسری باتیں جس ترتیب سے ذہن میں آتی گئی ہیں، قلم بند کر دی جائیں گی۔"

اور نقوش میں اپنی سوانح لکھی تو بھی مان لیا کہ ضروری باتیں چھوٹ گئی ہیں اور ترتیب بھی ٹھیک نہیں۔

(۵) اردو تحقیق کا مذاق اڑانے کے لیے اس پر کھتونی بنانے کی پھبتی کسی جاتی ہے۔ قاضی صاحب کی تحریریں کھتونی سازی کی انتہائی مثالیں ہیں۔ وہ صفحات کے صفحات فہرست سازی کی نذر کر دیتے ہیں۔ ان کے بہت سے مضامین محض فہرست نگاری پر مشتمل ہوتے ہیں مثلاً معاصر ۱۱ میں اپنے مضمون تاریخ ادبیاتِ ہندی و ہندوستانی از دتاسی میں مندرج کتابوں کی فہرست دینے لگے ہیں تو ص ۹۰ سے ۱۳۴ تک دی ہے۔ معاصر ۱۴ میں نکات الشعرا کے مفردات و مرکبات کی فہرست ص ۱۱ سے ۸۰ تک ہے اور یہ فہرستیں گنجان اور مسلسل لکھی ہوئی سطروں کی شکل میں ہیں۔ کسی مزاحیہ شاعر (غالباً واہی) نے محقق کا استہزا یوں کہہ کر کیا تھا ؏ اس نے سب نقطے گنے ہیں میر کے دیوان کے۔ یہ کہتے وقت شاعر کے ذہن میں قاضی صاحب ہی سے ہوں گے۔

(۶) مضمون کی ابتدا اور خاتمے کا ایک طریقہ ہوتا ہے۔ ابتدا اس طرح ہونی چاہیے کہ موضوع کا تعارف کرائے یا پڑھنے والے کی توجہ اپنی طرف مبذول کر لے۔ خاتمے میں بحث کو سمیٹ لینا چاہیے یا ایسا جملہ لکھا جائے جو پڑھنے والے کے ذہن میں گونجتا رہے لیکن قاضی صاحب کے بہت سے مضامین ایسے یک لخت طریقے سے شروع ہو جاتے ہیں جیسے ہم کسی مضمون (یا فہرست) کو بیچ سے پڑھنے لگے ہیں۔

الف : نوائے ادب اپریل [illegible] میں 'محرقِ قاطعِ برہان' کی ابتدا یوں ہے۔

صفحہ ۱، 'ومن یضلل اللہ فما لہ من ھاد'، الحمد للہ کہ کتابِ لاجواب ہدایت انتساب باسنادِ شعرائے اہلِ زبانِ ایران ۔ ۔ ۔ ۔ الخ

ب : معاصر، میں ' انشائے مومن ' کی ابتدا۔

" باب اوّل (۱)، بنام احسن اللہ خاں ص۴ اس خط میں طبّی اصطلاحات بہت کثرت سے بلاضرورت استعمال ہوئے ہیں۔

ج : معاصر حصہ ۱۸ ص ۴۶ ' مطالعات ' کی ابتدا

۱ دیوانِ میر (کا) ۵۲ شعر اوّل " الٰہی جوشِ طوفان بخش چشم اشکبارم۔ الخ۔ حافظ شہر از نگاہ میر مجلس شد خراب چیست، یاران طریقت بعد ازیں تدبیر ما

شعر نثر کی طرح ہے۔ اضافت کہیں لگانے کی ضرورت محسوس نہیں کی لیکن اس سے قطع نظر کیا مندرجہ بالا مضامین کی ابتدا میں یہ بتانے کی ضرورت نہ تھی کہ محرق قاطع یا انشائے مومن کا کیا موضوع ہے۔ کب کس نے لکھی۔ کونسا نسخہ پیشِ نظر ہے۔ مضمون کا خاتمہ بھی یکایک ہوتا ہے۔ مضامینِ رشید میں ایک ابو کھلائے ہوئے کردار حاجی بَلَغَ العُلیٰ کا ذکر ہے جو کبھی یکایک آدھمکتے ہیں اور باتوں کے بیچ یکایک اٹھ کر چل دیتے ہیں۔ یہ مضامین بھی حاجی بلغ العلیٰ مجسم ہیں۔

(۷) ان کے مضامین کے آخر میں اور کبھی کبھی شروع میں بھی متعدد لاحقے ہوتے ہیں مثلاً "عیارستان" کی ابتدا میں غلط نامہ ہے اور آخر میں تصحیح و اضافہ۔ ملحقات۔ تصحیح غلط نامہ۔ ملحقاتِ غلط نامہ ہیں۔

" غالب بحیثیت محقق " کے آخر میں خاتمہ۔ تصحیح و اضافہ۔ حواشی۔ تتمہ۔ تصحیح و اضافہ غلط نامہ۔ تتمہ غلط نامہ ہیں۔

" نشتر و سوزن " کے آخر میں ملحقات، مخففات و تصحیحات تین عنوان ہیں۔

ڈاکٹر اختر اورینوی کی کتاب کے تبصرے کی تیسری قسط (نوائے ادب اپریل ۵۹ء) کی ابتدا میں تصحیح اغلاط قسط ۲ - قسط اوّل اضافہ و ترمیم ۔ ترمیم و اضافہ قسط ۲ میں ۔ عبدالحق بحیثیت محقق کی پہلی سے بعد کی قسطوں کی ابتدا میں سابق قسط کی تصحیح و اضافہ اور تتمہ ہوتا تھا۔

تصحیح و اضافہ ، تتمہ اور غلط نامے وغیرہ کے بغیر قاضی صاحب کے کسی مضمون کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ تتمہ اور غلط نامہ وغیرہ کچھ اچھے نہیں معلوم ہوتے ۔ انھیں صحت طباعت کا اتنا خیال ہے تو پریس کی کاپیوں کے پروف خود دیکھنے پر اصرار کیوں نہیں کرتے ۔ تذکرۂ شعرا از ابن طوفاں اور عیارستان پٹنے ہی میں چھپیں اور اشتر و سوزن دلی میں جہاں وہ طولانی قیام کرتے تھے ۔ یہ تینوں کتابیں غلط نامے سے مزین ہیں ۔ قاطع برہان و رسائل متعلقہ کی تصحیح مالک رام اور رشید حسن خاں نے کی تو یہ جلد غلط نامے سے مبرا ہے ۔ انھیں اس باب میں مالک رام سے سبق لینا چاہیے جن کی مرتبہ کتابوں میں نہ غلطی ہوتی ہے نہ غلط نامہ ۔

(۸) تحقیق کی زبان کیسی ہونی چاہئے ؟ قاضی صاحب نے اصول تحقیق میں لکھا ہے کہ محقق کو خطابت سے پرہیز کرنا چاہیئے ۔ محض آرائش گفتار کی خاطر تشبیہ و استعارہ کا استعمال نہ کرے ۔ کم سے کم الفاظ میں اپنا مافی الضمیر ظاہر کر دے ۔ (آج کل اگست ۶۶ء ص ۴)

اسی شمارے میں ڈاکٹر محمد حسن نے 'ادبی تحقیق کے بعض مسائل' کے عنوان سے مضمون لکھا۔ وہ قاضی صاحب سے بھی دو قدم آگے بڑھ کر تحقیق کی زبان کے لیے کہتے ہیں ۔

رنگینی اس کا حسن نہیں عیب ہو سکتا ہے .... دلچسپی اس کا جوہر نہیں نہ دل کشی کی میزان پر اسے پرکھا جانا چاہیے (ص ۳)

قاضی صاحب نے ڈاکٹر اختر اورینوی کے تحقیقی مقالے پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا " پٹنہ تخت گاہ اردو کی حیثیت سے مسلم الثبوت بنا ، یہ کسی مقالہ تحقیقی نہیں ، افسانے کی عبارت معلوم ہوتی ہے ۔" (نوائے ادب اپریل ۵۹ء ص ۵۷)

قاضی صاحب کی مراد یہ معلوم ہوتی ہے کہ تحقیقی مضمون میں بھول کر بھی کوئی رنگین لفظ، کوئی دلکش پیرایۂ اظہار استعمال نہ کیا جائے۔ میں پوچھتا ہوں کہ کیا کسی موضوع اور کسی تحریر کے لیے عدمِ دلکشی اور فقدانِ دلچسپی خوبی ہے۔ کیا تحقیق کو اس زبان اور بیان میں پیش کرنا چاہیے کہ دل پڑھنے سے احتجاج کرے۔ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی کی کتاب "چراغِ رہ گذر" میں تحقیقی مضامین ہیں اور شگفتہ و دلچسپ انداز میں ہیں۔ کیا یہ ان کا عیب ہے؟ کیا یہ ضروری ہے کہ تحقیق کی زبان کو خواہ مخواہ اصطلاحی بنا دیا جائے اور عام مفاہیم کے لئے نامانوس جارگن (Jargon) وضع کیا جائے۔ قاضی صاحب کے بعض الفاظ اور فقرے ملاحظہ ہوں۔

(۱) جو صرف ہندوستانگیر شہرت پر مشتمل ہے (عیارستان ص ۳۱)

(۲) اس کی ابتدا مائۂ سیزدہم کے دوسرے عشرے میں ہوتی (ایضاً مطبوعہ ص ۱۴۸، اور اصل ۳۹)
(اسے تیرہویں صدی کے دوسرے دہے میں کہہ دیں تو کیا قباحت ہے)

(۳) اصل کتاب اگر کتھی تو مہ دل تھی (نقدِ غالب ص ۵۵۶)

(۴) مگر عملِ صالح کی عبارتِ ذیل سے جو ترجمہ، ابوطالب کلیم میں ہے مستفاد ہوتا ہے (معاصر ۵ ص ۱۵۲)

(۵) اس مقالے کے متعلق امورِ ذیل نشانِ خاطر رہیں (معاصر ۱۱ ص ۴۶)

(۶) اشاعت اکی جلد ا میں ۔ ۔ ۔ ۳۸، لکھنے والوں کا بالاستقلال ذکر ہے
(معاصر ۸ ص ۱۱۸)

(۷) مصحفی کے قول کی صحت متیقن نہیں (معاصر ۸ ص ۱۱۸)

(۸) یہ واضح ہے کہ استقصا کی کوشش نہیں کی گئی (نوائے ادب اپریل ۱۹۵۳ء ص ۱۴)

(۹) ہندوستانی فرہنگ نگاروں کے اقوال سے ۔ ۔ استشہاد کیا گیا ہے
(نقدِ غالب ص ۳۴۵)

(۱۰) شعر مصرع ہو تو اور بات ہے (ایضاً ص ۲۴۶)
(۱۱) زمانۂ ترتیب و انطباع اپریل و مئی ۱۹۵۷ء (تذکرۂ ابن طوفان کا اندرونی سرورق)
(۱۲) مفردات و مرکبات و طرق استعمال (ایضاً ص ۸۶)
(۱۳) اشعار میں اوقاف گذاری بہت کم ہوئی ہے (اشتر و سوزن ص ۵۶)
(۱۴) اپنے بزرگوں کی آوازہ گری جو در اصل خود اپنی آوازہ گری ہے (معاصر ۱۳ ص ۱۰۹)
(۱۵) میر بیباک بھی اگر ان میں مداہنت کا مادہ بھی ہے (عیارستان مطبوعہ ص ۱۰۳)
(۱۶) دانشگاہِ دہلی ..... (اشتر و سوزن ص ۵)
(۱۷) ان کا ارادہ قوت سے فعل میں نہ آسکا

(نقوش آپ بیتی نمبر (۲) جون ۱۹۶۴ء ص ۱۰۱۷)

انھوں نے تذکروں میں دیئے ہوئے شعرا کے حالات کے لیے ایک لفظ "ترجمہ" استعمال کیا حالانکہ اردو میں یہ لفظ ایک دوسرے معنی میں مشہور ہے۔ ان کی دیکھا دیکھی دوسرے لوگ بھی یہ اصطلاح استعمال کرنے لگے ہیں لیکن اس کا ترک مناسب ہے۔ ان میں سے چند الفاظ اور فقروں کے علاوہ قاضی صاحب نے بیشتر کو تحقیق کی اصطلاح کے طور پر استعمال کیا ہے۔ ان سب کے مفہوم کو آسان اور مانوس زبان میں باسانی ادا کیا جا سکتا تھا۔ ان کے استعمال سے ایک قسم کی ثقل اعوذی مولویت پیدا ہو جاتی ہے۔ ایسے الفاظ کی وجہ سے لوگوں کو تحقیق سے مزید بھڑک ہو جاتی ہے اور محقق کو گورستان کا باشندہ سمجھا جانے لگتا ہے۔

اس شعر میں بہت کچھ حقیقت ہے۔

اتنی تو ہو بیان میں واعظ شگفتگی ہم رندین کے قلقل مینا کہیں جسے

اگر تحقیقی تحریر کا مقصد یہ ہے کہ اسے پڑھا جائے اور پڑھنے والا اس میں دلچسپی لے تو

یں شگفتگی کو اس کا عیب نہیں حسن قرار دوں گا۔ جہاں حقائق گنائے جائیں وہاں رنگینی و عبارت آرائی سے پرہیز چاہیئے لیکن مضمون کے دوسرے حصوں میں جہاں عمومی بات کہی جائے وہاں اگر اسلوب بیان شگفتہ ہو جائے تو کیا ہرج ہے۔ کیا محقق کا تصور کسی حولق خشونت زدہ ملا ہی کا سا ہونا چاہیئے۔

دوسرے محققین بھی تو لکھتے ہیں۔ مسعود حسن رضوی کی تحقیقی تحریریں اسی دلچسپ و دلکش زبان میں ہوتی ہیں جس میں اردو کے عام تنقیدی مضامین ہوتے ہیں۔ مالک رام اور عرشی صاحب بھی اکتانے والے انداز میں نہیں لکھتے۔ پھر قاضی صاحب ہی نے کیوں روکھا پھیکا بے رس اور بے رنگ اندازِ بیان اختیار کیا ہے۔ ان کے بے نہایت احترام کے باوجود میں اپنے اس احساس کو ظاہر کرنے پر مجبور ہوں کہ ان کے پاس مواد کی کثرت ہوتی ہے لیکن وہ اسے مضمون کی شکل نہیں دے پاتے۔ ان کے مضامین دراصل شخصی (notes) ہوتے ہیں جنہیں کوئی انشاپرداز مضمون کی شکل میں لکھ دے تو جاذبِ توجہ ہو جائیں۔ فی الحال قاضی صاحب کے مضمون کا اسلوب چیخ چیخ کر پکارتا ہے "مجھے نہ پڑھو"

مجھے قاضی صاحب سے عقیدت ہی عقیدت ہے۔ تحقیق کی صحت اور معیار کی بلندی کے لحاظ سے وہ میرے مثالی محقق ہیں۔ اسی لیے میں نے اپنی مثنوی کی کتاب ان کے نام معنون کی ہے۔ گزشتہ چند صفحات میں ان کے اندازِ بیان کی تنقید کر کے میں ایک گناہ کا مرتکب ہوا ہوں لیکن میں اپنے دل کے درد و سوز کو ظاہر کیا چاہتا ہوں۔

قاضی صاحب نے پوری زندگی اردو ادب کی خدمت میں گزاری۔ انھوں نے اس کے علاوہ اور کوئی پیشہ اختیار نہیں کیا لیکن تحقیق میں ان کا کارنامہ کیا ہے؟ غالب، محمد حسین آزاد، عبدالحق، خواجہ احمد فاروقی، اختر اورینوی اور نور الحسن ہاشمی وغیرہ

کی تحقیق کی خامیوں کی نشاں دہی کرنا۔ ان کی کتابوں میں "معیارِ ستان" اور "نشتر و سوزن" کا یہی موضوع ہے۔ ابنِ طوفاں کا تذکرہ ایک چھوٹی سی کتاب ہے۔ قاطع برہان و رسائل متعلقہ کو انھوں نے صحت کے ساتھ چھپوایا اور بس۔ اس میں مقدمہ یا حواشی نہیں لکھے۔ اس تبحر علمی، اس مطالعے اور اس نظر والی شخصیتیں قرنوں میں پیدا ہوتی ہیں لیکن یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے ہمیں کیا دیا۔ مسعود حسن رضوی نے اردو اسٹیج اور دیوانِ فائز جیسے کام کیے۔ مولانا عرشی نے نسخۂ عرشی، مکاتیبِ غالب اور دستور الفصاحت دیں۔ مالک رام نے ذکرِ غالب اور گلِ رعنا کے علاوہ ابوالکلام آزاد کی کتابوں کی خوب سے خوب تر ترتیب دی لیکن قاضی صاحب نے اپنی طرف سے کوئی بڑا کام نہ کیا۔ کاش وہ محقق یا انشا پرداز کوئی یادگار کتاب لکھ جاتے۔ کاش وہ تمام تذکروں کو سمو کر ادیبوں کی سوانحی ڈکشنری (۱۸۵۷ء تک) تیار کر دیتے۔ کیسی خاصے کی چیز ہوتی! یہ مسلم کہ ان کی تنبیہوں کی بڑی قیمت ہے۔ اس سے راہِ تحقیق کی استقامت میں بہت مدد ملی لیکن تنقیدِ شعر العجم کا مرتبہ شعر العجم کے برابر نہیں ہوتا۔ انھوں نے کتنے زیادہ علم سے کتنا چھوٹا کام لیا۔

لیکن میں صدقِ دل سے اعتراف کرتا ہوں کہ قاضی صاحب نے جو کچھ لکھا ہے اس کی بدولت بھی ان کا نام زندہ رہے گا۔ انھوں نے میر و غالب کے ذہن اور شخصیت کے جن گوشوں کی طرف توجہ دلائی اس سے ان حضرات والا صفات کو بہتر اور صحیح تر طریقے سے سمجھا گیا۔ قاضی صاحب صدق کی جس سختی سے نگہداشت اور وکالت کرتے ہیں ویسا ان سے پہلے اور ان کے زمانے میں کوئی اور نہ کر سکا۔ انھوں نے بڑی جرأت اور محنت کے ساتھ جھوٹ کا پردہ چاک کر کے حق کی دریافت کی۔ وہ محض بت شکن ہی نہیں حق پرست بھی ہیں۔ خدا انھیں درازیِ عمر و صحت دے کہ وہ عرصے تک ہماری رہنمائی کرتے رہیں۔

رشید حسن خان

تحقیق کا معلم ثانی

قاضی عبدالودود صاحب کو اردو میں تحقیق کا معلّمِ ثانی کہنا چاہیے۔ میرا خیال ہے کہ نئی نسل تحقیق کے آداب اور انداز سے، قاضی صاحب کے توسّط سے آشنا ہوئی ہے۔ پچھلے پچیس تیس برسوں میں احتیاط پسندی کا جو رجحان بڑھا ہے، شک کرنے، یا یوں کہیے کہ مضبوط دلیلوں کے بغیر دعووں کو قبول نہ کرنے کا انداز جس طرح فروغ پذیر ہوا ہے اور منطقی استدلال نے جس طرح اہمیت حاصل کی ہے، یا دوسرے لفظوں میں، زود یقینی اور خوش اعتقادی نے جس طرح کم اعتباری کی سند پائی ہے؛ اُس میں قاضی صاحب کی تحریروں کا بہت بڑا حصّہ ہے۔ اُن کی بے لچک شخصیت، ان کے بے جھجک اندازِ گفتگو اور ان کے سخت گیر احتساب نے، اس زمانے میں، تحقیق کے طالب علموں کی ذہنی تربیت کی ہے اور اُن کی تحریروں نے یہ بتایا ہے کہ تحقیق کی زبان اور پیرایۂ اظہار میں انشا پردازی، مرصّع کاری اور الفاظ کے بے محابا استعمال کی مطلق گنجایش نہیں۔

اردو میں تحقیق کا باضابطہ آغاز تو شیرانی صاحب سے ہوتا ہے۔ ان کو بہ آسانی تحقیق کا معلّمِ اول کہا جاسکتا ہے۔ نئے مآخذ کی تلاش اور اولین مآخذ کی اہمیت کا احساس انھی کے زمانے سے شروع ہوتا ہے۔ انھوں نے جرح و تعدیل اور احتساب کی صحت مند روایت قائم کی۔ انھوں نے عملی طور پہ یہ بتایا کہ عقیدت اور احتساب میں تضاد ہے اور اعترافِ کمال اور احتساب میں تضاد نہیں۔ ہمارا معاشرہ انتہا پسندی کی حد تک روایت پرست رہا ہے۔ وہم پرستی کی جڑیں بھی بہت گہری رہی ہیں۔ مزید ستم یہ ہوا

کہ تصوف کے زیرِ سایہ غیر منقولہ فروعات نے یہاں بہت فروغ پایا، اور ان کے اثر سے مفروضات کو بہ آسانی تسلیم کر لینے کا رجحان، مزاجوں میں تہ نشین ہو کر رہ گیا ـــــــ شیرانی صاحب نے اس روایت پرستی پر کاری ضرب لگائی اور ردّ و قبول کے لیے منطقی استدلال کی ضرورت کا احساس دلایا۔

شیرانی صاحب کی تحریروں نے تحقیق کا شعور پیدا کیا، اُن کے تحقیقی کارنامے آج بھی مثال اور معیار کی حیثیت رکھتے ہیں، اس کے باوجود، یہ بھی حقیقت ہے کہ اُن کے اثرات نسبتاً محدود رہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اس صدی کا ربعِ اول حقیقتاً شبلی و آزاد کے اثرات سے معمور رہا ہے۔ مولانا شبلی بہت کچھ تھے مگر محقق نہیں تھے۔ تحقیق کے لیے جس غیر جذباتی اندازِ نظر کی ضرورت ہوتی ہے، وہ اُن کے مزاج سے دور کی نسبت رکھتا تھا۔ ان کی تنقیدی بصیرت سے کون انکار کر سکتا ہے۔ وہ سخن فہم اور انشا پرداز درجۂ اول کے تھے۔ ان کا اپنا اسلوب ہے جو جلال و جمال کا مرقع معلوم ہوتا ہے۔ ان کے خطیبانہ آہنگ اور جذباتی اندازِ نگارش کے زیرِ سایہ، تحقیق بھی ایک دلچسپ چیز بن کر رہ جاتی ہے۔ پڑھنے والے کا ذہن اس طرح متاثر ہوتا ہے کہ پھر طبیعت اِس پر مشکل ہی سے آمادہ ہو سکتی ہے کہ کھرے استدلال اور منطقی موشگافیوں کا اس پر پیہم وار کیا جائے۔ اور آزاد کے لئے خود شبلی یہ کہہ چکے ہیں کہ وہ گپ بھی ہانکتا ہے تو وحی معلوم ہوتی ہے۔ آزاد کی تنقیدی رایوں سے کم اختلاف کیا جائے گا۔ مختلف شعرا کے متعلق چند سطروں میں یا چند جملوں میں انھوں نے جو کچھ لکھا ہے، بعد کی بہت سی تفصیلات اسی پر مبنی ہیں، مگر اصلاً وہ تھے مرقع نگار اور انشا پرداز، اور ان کی مرقع نگاری میں افسانہ و حقیقت، دونوں کا فرق مٹ گیا ہے ـــــــ جیسا کہ معلوم ہے، مرقع کاری اور انشا پردازی کو ہمارے ادب میں شروع ہی سے بہت اہمیت حاصل رہی ہے۔ یہ ایسا نشہ ہے جسے کوئی ترشی نہیں اتار پائی۔ اِس لیے تحقیق کے حقیقی طریقِ کار اور طریقِ اظہار کو زیادہ قبولیت حاصل نہ ہو سکی۔ غیر مشروط

عقیدت سے سرشار یا رومانیت زدہ لوگوں نے تو یہ انداز اختیار کیا جیسے تنقیدِ شعرالعجم جیسی تحریریں، بے رحم ذہن کا نتیجہ تخلیق، بے لچک اسلوب کا مظہر اور مجموعی طور پر منفی اندازِ نظر کا مجموعہ ہوں!

قاضی صاحب ایک مدّت سے تحقیقی مضامین لکھ رہے ہیں، مگر یہ واقعہ ہے کہ لگ بھگ سن ۱۹۵۰ء تک اُن کے اثرات ہمہ گیر نہیں ہو سکے تھے۔ سن ۵۰ء کے بعد اُن کے بعض اہم مضامین اور تبصروں نے اچانک ہلچل پیدا کر دی۔ اِن تحریروں میں معلومات کی بہتات، منطقی استدلال کی دل نشینی اور احتساب کی سخت گیری کا وہ انداز تھا جس نے ایک نئے دور کا آغاز کیا۔ میرا خیال یہ ہے کہ اس صدی کی تیسری دہائی کے آخر تک رومانیت کی لہریں کچھ کم زور پڑنے لگی تھیں، سیاسی حالات تیزی سے بدل رہے تھے، نئے شعور کی کرنیں پھوٹ رہی تھیں، یہاں تک کہ چوتھی دہائی کے وسط سے ادبیات میں شکست و ریخت کا ایک طاقت ور عمل شروع ہوا۔ میری مراد ترقی پسند تحریک سے ہے۔ میں اِسے خالص ادبی تحریک نہیں سمجھتا، اِس کے جو منفی اثرات پڑے، اُن سے بھی انکار نہیں کرتا، مگر یہ تاریخی حقیقت ہے کہ اس تحریک نے اچانک ذہنوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا اور اُن تبدیلیوں کے لیے راہ ہموار کر دی جن کو قبول کرنے کے لیے تربیت یافتہ ذہن اور مہذب مزاج اُس وقت تک تیار نہیں ہو پائے تھے (اور شاید ایک مدت تک تیار نہ ہو پاتے)۔ یہ تحریک، جنگل کی آگ کی طرح پھیلی اور خس و خاشاک کے بہت سے انبار خاکستر ہو کر رہ گئے۔ یہ ایک نقطۂ آغاز تھا پرانے تصوّرات کی شکست کا اور نئے ذہن کی تشکیل کا۔ یہاں تک کہ ملک کی تقسیم کا واقعہ پیش آیا اور اچانک بہت کچھ تلپٹ ہو گیا، چیزیں ٹوٹ پھوٹ کر رہ گئیں اور اِس طرح بھی مختلف سطحوں پر نئے تصوّرات اور حقیقت پسندی کی نئی سچائیوں کا عمل دخل بڑھا اور تلخ حقائق کو براہِ راست قبول کرنے کا رجحان پیدا ہوا۔ شیرانی

صاحب نے جب تحقیق کی روایت کی بنیاد رکھی تھی، اُس وقت زندگی کے بیشتر شعبوں میں روایت پرستی کا عمل دخل تھا، ادبیات میں رومانیت کا بول بالا تھا اور تحقیق گویا خطابت اور مرصع کاری کا مجموعہ تھی۔ قاضی صاحب نے جب اِس جادے پر قدم رکھا تو تغیرات کے قدموں کی آہٹیں آنا شروع ہو گئی تھیں اور جلد ہی طوفان پھٹ پڑا۔ پندرہ بیس سال کے بعد تبدیلیوں نے اپنے آپ کو پوری طرح نمایاں کر لیا اور نئے اثرات کے لیے راستہ ہموار کر دیا۔ اِس طرح سنہ ۵۰ء کے بعد، قاضی صاحب کی نگارشات نے اپنے وسیع اثرات کے لیے فضا کو سازگار پایا۔ اِسی زمانے میں شیرانی صاحب کی روایت کو گویا از سرِ نو زندگی ملی اور پس منظر کے طور پر اُس کی اہمیت اور نمایاں ہوئی۔

روایت کو تسلسل حاصل نہ ہو تو وہ ایک وقفے کے بعد بے اثر ہو کر رہ جاتی ہے۔ تحقیق کی جو روایت شیرانی صاحب نے قائم کی تھی، اس کے تسلسل کے لیے یہ ضروری تھا کہ خبر اور نظر، دونوں کے اعتبار سے کوئی ایسا شخص ہو جو پچھلی روایت میں اضافے کر سکے اور جو معیار سامنے آ چکا ہے، اُس کو اور بلند کر سکے۔ اِس کے بغیر روایت کو وہ توانائی حاصل نہیں ہو پاتی جس کے بل پر وہ اپنے حلقۂ اثر کو وسیع کیا کرتی ہے اور اپنے عناصر کو تابناک رکھتی ہے۔ قاضی صاحب کی ہمہ گیر شخصیت کا یہ بڑا ثبوت ہے کہ اُن کے اثر سے اُس روایت کا تسلسل باقی رہا، اُن اہم اضافوں کے ساتھ جن کے بغیر توسیع نہیں ہو پاتی۔ یہ صرف عہد آفریں شخصیت کا کام ہے۔

قاضی صاحب کی تحریروں سے تحقیق کو جو طاقت ور عناصر ملے ہیں، ان میں ظاہری سطح پر شاید سب سے نمایاں چیز تحقیق کی زبان ہے اور وہ اسلوب جو معنویت سے معمور اور رنگینی سے محفوظ ہے۔ سادہ، ہموار اور ایک حد تک کھُردرے پن سے آراستہ۔ اُن کی تحریروں نے یہ سکھایا کہ بہ قدرِ ضرورت الفاظ استعمال کرنا چاہیے، اور بے ضرورت صفاتی الفاظ کی تحقیق میں مطلق گنجائش نہیں۔ صفاتی الفاظ کا غیر محتاط بلکہ غیر ذمے دارانہ استعمال، زبان کا

خاصہ ہو کر رہ گیا ہے۔ یہ دراصل قومی مزاج کی آئینہ داری کرتا ہے۔ مغلق الفاظ کا بے محابا استعمال آخر کار رنگین بیانی کی حدود میں داخل ہو جاتا ہے، جہاں استعاروں کی جگمگاہٹ اور شعری ٹکڑوں کی مرصع کاری، مغالطہ آفرینی کا کام انجام دیتی ہے۔ ہماری تنقید اسی کا شکار ہوئی ہے کہ وہ انشا پردازی کی ترقی یافتہ شکل معلوم ہوتی ہے۔ شاعری مزاجوں پر اس قدر حاوی ہو چکی ہے کہ اس کے اجزا کی آمیزش کے بغیر ہر تحریر روکھی پھیکی لگتی ہے۔ قاضی صاحب کی تحریر الفاظ کی کفایت شعاری اور ان کے حد درجہ محتاط استعمال کی نہایت عمدہ مثال ہوتی ہے۔ لفظوں کو قطعیت کے ساتھ متعین معانی ہی میں استعمال کرنا بھی ان کی تحریر کی خصوصیت ہے۔ (اس سے میری مراد یہ ہے کہ لکھنے والا، ایہام کو قطعاً روا نہ رکھے، کیوں کہ ذو معنی پن سے حقیقت پر حرف آنے لگتا ہے۔ اسی طرح مجازی معنی کی پرچھائیاں بھی نہ پڑنے پائیں، کیوں کہ اس طرح حقیقت کے خط و خال مسخ ہونے لگتے ہیں اور عدم تعین کو جگہ ملنے لگتی ہے۔ اس زمانے میں تحقیق سے تعلقِ خاطر رکھنے والے نسبتاً نئے لوگوں میں، الفاظ کے انتخاب اور ان کے استعمال میں جس حد تک بھی احتیاط آئی ہے اور انداز بیان کی سادگی کو جو ضروری اہمیت حاصل ہوئی ہے، یہ در حقیقت قاضی صاحب کی تحریروں کا اثر ہے۔

آج اگر اس بات کو کہا جاتا ہے کہ تحقیق میں شک کو بنیادی حیثیت حاصل ہے، بلکہ اکثر صورتوں میں تحقیق کا آغاز ہی اسی نقطے سے ہوتا ہے، تو یہ دراصل قاضی صاحب کے نقطۂ نظر کی صدائے بازگشت ہے، اور اس نقطۂ نظر کے اثرات بہت ہمہ گیر ہیں۔ اس کی بہت سی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں کہ شک کو بنیادی حیثیت نہ دیے جانے کی وجہ سے فاش غلطیوں کا ارتکاب ہوا ہے اور ان باتوں کو تسلیم کر لیا گیا (واقعات ہوں یا کلام کا انتساب) جن کو شک کی کسوٹی پر کسا جاتا تو کھوٹا پن خود بہ خود ظاہر ہو جاتا۔ اس نقطۂ نظر نے آسان پسندی کی نفی کی، خوش عقیدگی پر ضرب لگائی، اور یقین کے لیے خیال، قیاس یا محض روایت پر بھروسا کرنے

کے بجائے، "قابلِ قبول شہادت" کے وجود کو ضروری قرار دیا، بل کہ قابلِ قبول شہادت کو لازمی اور قطعی حیثیت بخشی اور اس طرح تحقیق کی مشکل پسندی کو، آسان پسندی سے قریب ہو جانے سے محفوظ رکھا۔

ایک دوسری اہم بات، جس پر زور دیا گیا، یہ ہے کہ یہ دیکھنا چاہیے کہ جو کچھ لکھا گیا ہے، وہ تحقیق کے نقطۂ نظر سے قابلِ قبول ہے یا نہیں اور یہ فضول بات ہے کہ اعتراض بدنیتی سے کیا گیا ہے یا کسی اور وجہ سے۔ نیت کو درمیان میں لانے کی بات اُن لوگوں کی وضع کردہ ہے جو سہل پسندی اور غلط نگاری کو جوابی الزام کے پردے میں چھپانا چاہتے ہیں یا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اپنے کسی ممدوح کی پردہ پوشی کی جائے (ایک زمانے میں تنقیدِ شعر العجم کے متعلق بھی اسی طرح کی کچھ باتیں کہی گئی تھیں)۔ قاضی صاحب نے اپنی تحریروں کے واسطے سے تسلسل کے ساتھ یہ واضح کیا کہ احتساب کا تعلق صحیح و غلط سے ہے، اعتراض اگر صحیح ہے، تو ٹھیک ہے۔ وہ اعتراض کس نیت سے کیا گیا تھا، یہ غیر متعلق بات ہے اور اس کی کچھ حیثیت نہیں۔

اسی طرح یار لوگوں نے مثبت اور منفی یا تعمیری و تخریبی کی اصطلاحیں بھی استعمال کرنا شروع کی تھیں۔ اعتراضات کو یہ کہہ کر مسترد کرنے کی کوشش کی جاتی تھی کہ یہ تو تخریبی انداز ہے یا یہ کہ یہ تو منفی اندازِ نظر ہے۔ مقصد اس سے بھی وہی ہوتا تھا کہ سہل انگاری، کم علمی اور غلط نگاری کی پردہ پوشی کی جائے اور اس اندازِ احتساب کو کم رتبہ قرار دیا جائے۔ اس کو یوں بھی کہا جاتا تھا کہ دیکھیے، فلاں صاحب کس قدر شریف آدمی ہیں، بس اپنا کام کرتے رہتے ہیں، نہ کسی پر اعتراض کرتے ہیں اور نہ کسی کے عیب نکالتے ہیں، یہ ہے تعمیری انداز۔ یہ بے حد خطرناک تعلیم تھی۔ اگر اس اندازِ فکر کو پھلنے پھولنے کا موقع مل جاتا تو تحقیق تباہ ہو جاتی اور کم علمانہ خفیف الحرکاتی کو عزت حاصل ہو جاتی۔ ہمارے بعض شرفائے ادب نے بالواسطہ اس انداز کی اس طرح ہمت افزائی کی کہ مفصل تبصرہ نگاری سے امکان بھر احتراز کیا۔ یہ خاموش تائید تھی اور بہت خطرناک۔ بعض حضرات جو مزاجاً پیچھے

دُنیادار ہیں اور جن ہوس جن کا پیشہ ہے، اور دنیاوی کاروبار کی طرح، تحقیق کو بھی من جملہ ذرائع حصولِ شہرت و دولت سمجھتے ہیں؛ وہ خاص طور پر اس جھوٹ کو سچ بنا کر پیش کیا کرتے ہیں اور زبانی گفتگو میں اس کی تبلیغ کرتے رہتے ہیں۔ قاضی صاحب نے اِس زمانے میں احتساب کی اِس روایت کی حرمت کو باقی رکھا اور زبانی گفتگو میں اور عملی طور پر اپنے مفصّل اور نہایت درجہ عالمانہ تبصروں کے ذریعے سے، اِس انداز کو فروغ دیا اور تعمیری و غیر تعمیری کی اُن غیر علمی اصطلاحوں کی حقیقت کو بے نقاب کیا۔ قاضی صاحب جیسی دیو قامت شخصیت نہ ہوتی، تو اِس زمانے میں احتساب کی روایت شاید مرحوم ہو کر رہ جاتی اور اِس طرح تحقیق کو بے طرح نقصان پہنچتا۔ قاضی صاحب نے اپنے طرزِ عمل سے اِس بات کو اصول کا درجہ بخش دیا کہ تحقیق اور ذاتی تعلقات میں کچھ نسبت نہیں۔ اگر کوئی شخص احتساب کی بنا پر بُرا مانتا ہے تو وہ تحقیق سے واقف نہیں اور جو شخص خیالِ خاطرِ احباب کا لحاظ رکھتا ہے، اُس کے مزاج کو تحقیق سے مناسبت نہیں۔ ایسا شخص شاعر ہو سکتا ہے انشا پرداز ہو سکتا ہے، پالیٹیشن ہو سکتا ہے، اسمگلر بھی ہو سکتا ہے؛ محقق نہیں ہو سکتا۔ خوش اخلاقی کے اِس انفعالی تصوّر میں اور تحقیق کی صداقت آبی میں کچھ رابطہ نہیں۔

دو اور اہم باتیں ہیں جن پر قاضی صاحب نے مسلسل زور دیا ہے اور اب وہ مسلّمات میں سے ہیں: ایک تو یہ کہ تحقیق کے لیے مزاجی مناسبت ضروری ہے۔ یہ من جملہ شرائطِ تحقیق ہے۔ صرف علم کافی نہیں۔ یہ بہ خوبی ممکن ہے کہ آدمی پڑھا لکھا ہو یا بہت پڑھا لکھا ہو، لیکن منطقی استدلال کا خوگر نہ ہو، اور اِس طرح وہ ۱ : دلیل، شہادت اور جرح و تعدیل کا حق ادا نہ کر سکے (جن کے بغیر کوئی بات قابلِ قبول نہیں ہو پاتی)۔ ۲ : اِس کا لازمی نتیجہ یہ ہو کہ حقائق کے تعین اور نتائج کے اخذ میں صحیح طریقۂ کار سے کام نہ لے سکے۔ ۳ : وہ اُس سخت گیری کا حق نہ ادا کر سکے جو تحقیق کے لئے ضروری ہے۔

دوسرے یہ کہ تحقیق کو قبولِ عام سے دور کی نسبت ہے۔ یہ توقع کرنا کہ تحقیقی تحریروں

کو سب لوگ یا اکثر لوگ پسند کریں گے، تحقیق سے ناواقفیت کا اعلان کرنا ہے اور پست معیاری کو دعوت دینا ہے۔ تحقیق، عام پسند چیز نہیں ہو سکتی، اسی طرح جس طرح وہ آسانی کے ساتھ نہیں ہو سکتی۔ ایک بار ایک صاحب نے قاضی صاحب سے نیازمندانہ شکایت کی کہ آپ کی تحروں کو بعض اوقات سمجھنے میں الجھن ہوتی ہے۔ قاضی صاحب نے جو کچھ کہا اس کا مطلب یہ تھا کہ میں سب کے لئے نہیں لکھتا، آپ مت پڑھا کیجئے۔ مقصد یہ تھا کہ تحقیق کو آسان پسندی سے ربط نہیں ہو سکتا اور تحقیقی تحریروں سے کما حقہ فیض یاب ہونے کے لیے بھی مزاجی مناسبت ضروری ہے۔

پس منظر کے نام پر فضول نگاری نے بہت کچھ رواج پایا ہے۔ قاضی صاحب کے تبصروں نے یہ بات واضح کی ایسی اکثر تحریریں محض ثانوی ماخذ سے نقل پر مشتمل ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ فضول نگاری کے ساتھ غلط نگاری بھی فروغ پاتی ہے۔ مثلاً ایک شخص نے کسی دور کی تاریخ کا پوری طرح مطالعہ نہیں کیا، تاریخ اس کا موضوع بھی نہیں، لیکن وہ دو چار عام تاریخی کتابوں کی مدد سے مثلاً نادر شاہ یا احمد شاہ ابدالی کے ہنگاموں کو نقل کر کے، پس منظر کی لمبی چوڑی کہانی لکھ ڈالتا ہے، تو یہ غیر معتبر طریقہ کار ہوگا۔ تاریخ میں جو تسلسل ہوتا ہے، وہ اس کا متقاضی ہے کہ اس کا موضوع کی حیثیت سے مطالعہ کیا جائے۔ ساتھ ہی ان اصل ماخذ کو بھی دیکھا جائے جو دسترس سے باہر نہ ہوں۔

قاضی صاحب نے بہت سے نئے ماخذ کا اس وقت پتا دیا جب ان کا علم اکثر لوگوں کو نہیں تھا۔ ان کی تحریریں، ان کے وسعت مطالعہ کی شاہد عادل ہیں۔ کم ایسے ماخذ ہوں گے جو ان کی نظر سے نہ گزرے ہوں۔ قاضی صاحب کی تحریروں نے یہ سبق سکھایا کہ تحقیق کے لیے وسیع مطالعے کی شرط ہے اور دوسرے یہ کہ زبان و ادب سے تعلق رکھنے والے کو بھی مسائل سے واقف ہونا چاہیے اور فارسی ادبیات سے کما حقہ باخبر ہونا چاہیے۔ خود ان کی وسعت مطالعہ

کا یہ حال ہے کہ فارسی کی اہم تصانیف کا انھوں نے بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے، اس طرح کہ ان کتابوں میں مستعمل اہم الفاظ کی فہرستیں بھی وہ تیار کرتے رہے ہیں۔ مثلاً وہ اعتماد کے ساتھ یہ لکھ سکتے ہیں کہ فلاں لفظ شاہ نامہ میں فلاں فلاں مقامات پر آیا ہے۔ ایک صاحب نے تو ایک بار یہ کہا تھا کہ شاہ نامہ پڑھا ہی ہے دو آدمیوں نے، ایک شیرانی صاحب، اور دوسرے قاضی صاحب۔ نقد غالب میں جو ان کا طویل مقالہ "غالب بہ حیثیت محقق" شامل ہے، اس کو پڑھ کر ان کی فارسی معلومات کا بہ خوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اب حال یہ ہے کہ قاضی صاحب اس اعتبار سے "آئڈیل" ہو کر رہ گئے ہیں، کہ مطالعہ ہو تو اتنا ہو۔ وسعتِ معلومات کے لحاظ سے یہ واقعہ ہے کہ آج ان کا کوئی حریف نہیں۔ اس طرح بڑی بات یہ ہوئی کہ تحقیق اور تدوین کے لیے کس قدر وسیع معلومات کی ضرورت ہے، اس کا صحیح صحیح نقشہ نگاہوں کے سامنے آگیا۔ ورنہ حال تو یہ ہے کہ ایک صاحب مثلاً نہیں جانتے کہ عروض کس بلا کا نام ہے۔ ان کو یہ بھی نہیں معلوم کہ تذکیر و تانیث کے مسائل کیا ہیں، لفظوں کی سرگزشت سے ان کو نہ دلچسپی ہے نہ آشنا علم ہے۔ لغت سے نا آشنا، صرف و نحو اور قواعدِ شاعری سے نابلد، املا کے مسائل سے ناواقف، مگر تدوین کا اپنے کو اہل سمجھتے ہیں۔ قاضی صاحب کے تبصروں نے ایسے اشخاص کی نااہلی کو ظاہر کیا اور تدوین کے معیار کا نقش درست کیا اور وسعتِ مطالعہ کی اہمیت کو نمایاں کیا۔ تذکرہ نگاری، تاریخِ ادب اور عہدِ وسطیٰ، عہدِ مغل کی تاریخ پر ان کو ماہرانہ دسترس حاصل ہے مگر اس کا ذکر ایک مستقل مضمون کا طلبگار ہے۔

ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ قاضی صاحب نے کوئی مستقل کتاب نہیں لکھی۔ مگر لوگ بھول جاتے ہیں کہ ان کے مضامین کو اگر مرتب کر دیا جائے تو بہت سی کتابیں تیار ہو سکتی ہیں۔ تعیینِ زمانہ، آوارہ گرد اشعار، اور جہانِ غالب کے عنوانات کے تحت انھوں نے مسلسل مضامین لکھے ہیں اور اس سلسلے کے مضامین کو یکجا کر دیا جائے تو تین نہایت اہم کتابیں تیار ہو سکتی ہیں۔ تیسر

انؔ، مصحفی، جرأت، غالب اور سودا (وغیرہ) سے متعلق انھوں نے اس قدر لکھا ہے کہ اُن سے کتابیں تیار ہوسکتی ہیں، یہی حال ان کے تبصروں کا ہے جو کئی جلدوں میں سما پائیں گے۔ یہ مضامین معلومات کا گنجینہ ہیں آج شاید ہی کوئی ایسا طالب علم ہو جو کسی ایسے تحقیقی موضوع پر کام کرتا ہو جس پر قاضی صاحب نے کچھ لکھا ہے، اور وہ اُن کے مضامین سے بھرپور استفادہ کرنے پر مجبور نہ ہو۔ میں ایک چھوٹی سی مثال پیش کروں: کلیاتِ سودا کے نسخۂ مصطفائی پریس پر قاضی صاحب نے ایک مفصل مضمون لکھا تھا، اس مضمون میں اس قدر معلومات کو یکجا کر دیا گیا ہے اور اتنی اہم باتیں لکھی گئی ہیں کہ سودا پر اکثر کام کرنیوالوں نے اس سے بہت زیادہ استفادہ کیا ہے اور اب تک تو یہ حال ہے کہ جو کچھ قاضی صاحب نے لکھا ہے، اسی کو دہرایا گیا ہے۔ یہ مضمون، بجائے خود ایک کتاب کی حیثیت رکھتا ہے۔ لوگ یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ شیرانی صاحب نے بھی شروع میں بہت کچھ مضامین ہی کی صورت میں لکھا تھا۔ یہ اردو کی خوش قسمتی تھی کہ اُن کی زندگی ہی میں وہ سرمایہ کتابی صورت میں سامنے آگیا اور یہ ہماری بدنصیبی ہے کہ کسی ادارے نے قاضی صاحب کے مضامین کو مرتب کرنے اور شائع کرنے کی طرف توجہ نہیں کی ——— میں یہاں پر اس طرف بھی اشارہ کرنا چاہوں گا کہ شیرانی صاحب کی توجہ کا بڑا حصہ فارسی سے متعلق رہا ہے۔ اردو کا حصہ کم ہے۔ اس کے برخلاف، قاضی صاحب کے بیشتر مضامین اردو ادب سے متعلق ہیں، اگرچہ اُن کا فارسی ادبیات کا مطالعہ واقعہ یہ ہے کہ بے کران ہے، اور اس میں بھی اس وقت اُن کا کوئی حریف نہیں، کوئی مقابل نہیں۔ ہاں، اس کو بھی نظر میں رکھیے کہ اختصار، اُن کی تحریر کا خصوصی وصف ہے۔ وہ جو کچھ دو صفحوں میں لکھتے ہیں، دوسرا لکھنے بیٹھے تو اُسے دس صفحوں میں لکھے گا، اور اس پر بھی ان کے لکھے ہوئے سیکڑوں بلکہ ہزاروں صفحات موجود ہیں۔

قاضی صاحب کے معاصرین میں کئی اہلِ علم ہیں جنھوں نے تحقیق اور تدوین میں نام روشن کیا ہے۔ مگر ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ جب اِن حضرات کی کوئی کتاب شائع ہوتی ہے تو لوگوں کو

(اور شاید خود اُن کو بھی) اس کا انتظار رہتا ہے کہ دیکھیں، قاضی صاحب کیا لکھتے ہیں۔ اور یہ واقعہ ہے کہ معاصرین کی کتابوں پر قاضی صاحب نے جو تبصرے لکھے ہیں، وہ پڑھنے کی چیزیں ہیں۔ قاضی صاحب کی نظر اور وسعتِ مطالعہ کا یہاں پر اندازہ ہوتا ہے۔ ایک شخص نے کئی سال ایک موضوع پر صرف کیے اور اپنی بہترین کاوشوں کو کتابی صورت میں پیش کیا اور قاضی صاحب نے نہایت آسانی کے ساتھ محلِ نظر مقامات کی نشان دہی کردی اور جو معلومات خصوصی مطالعے کے بعد پیش کی گئی ہیں ان پر اہم اضافے بھی کر دیے۔ اُن کے معاصرین نے تحقیق اور تدوین کے اچھے اچھے کارنامے انجام دیے ہیں، لیکن قاضی صاحب کی حیثیت معیار ساز کی ہے۔ تحقیق کے معیار کا جب بھی ذکر آئے گا تو قاضی صاحب کی تحریروں کو سامنے رکھا جائے گا۔

مختار الدین احمد

قاضی عبدالودود[۱]

یہ ۱۹۳۶ء کی بات ہے جب قاضی عبدالودود صاحب کا نام میں نے پہلی مرتبہ سنا۔ اس زمانے میں انھوں نے پٹنہ سے ایک بلند پایہ تحقیقی رسالہ 'معیار' نکالنا شروع کیا تھا اور ادبی حلقوں میں اس کا بڑا چرچا تھا۔

'معیار' کی ترتیب اور انجمن ترقی اردو (شاخ بہار) کے کاموں کی معاونت کے لیے انھیں ایک مخلص اور ذی علم دوست شرف عالم آرزو جلیلی مل گئے تھے، یہ تھے تو سائنس کے استاد لیکن شعر بھی کہتے تھے، ڈرامے اور افسانے بھی لکھتے تھے اور انھیں مغربی زبانوں سے ترجمے میں بھی دل چسپی تھی۔ اس کے علاوہ چینی شاعری پر مضامین لکھتے تھے، ستار بجاتے تھے، شعبۂ طبیعات جاکر Sound پر ریسرچ کرتے تھے، اور ساتھ ہی ساتھ ادبی اور تحقیقی کام بھی کیا کرتے تھے۔ میں اس زمانے میں مصحفی کی مثنویوں پر کام کر رہا تھا۔ کتب خانہ خدا بخش میں ان سے کسی طرح ملاقات ہو گئی، قاضی صاحب کا ذکر آیا اور ان کی باتیں سن کر ملنے کا اشتیاق اور بڑھ گیا لیکن ان سے ملاقات کی نوبت پروفیسر حسن عسکری صاحب استاد شعبۂ تاریخ جامعۂ پٹنہ کی وساطت سے کچھ مہینوں کے بعد ہی آ سکی۔

۱؎ یہ مقالہ نقوش سالنامہ ۱۹۸۵ء میں شائع ہو چکا ہے۔ مصنف نے اس میں خفیف ترمیم کی ہے اور کچھ اضافہ بھی۔ ک۔ ا۔

میں ان کی کوٹھی پر ایک صبح ملاقات کے لئے پہنچا تو معلوم ہوا علیل ہیں۔ میں واپس ہونے والا ہی تھا کہ انھوں نے پردا کر کے اوپر ہی کی منزل پر اپنے کمرے میں بلا لیا اور اس بات کی معذرت کر کے مجھے شرمندہ کیا کہ علالت کے باعث وہ نیچے ملنے کے کمرے میں نہ آسکے اور مجھے اوپر آنے کی زحمت اٹھانی پڑی۔ قاضی صاحب کا آبائی مکان تو پٹنہ سیٹی میں تھا جسے چھوڑ کر وہ بانکی پور (قدیم نام: باقی پور) چلے آئے تھے، ان کی اپنی دو منزلہ کوٹھی کدم کنواں میں تھی لیکن زیادہ تر ان کا قیام شاہ رشید اللہ صاحب ایڈوکیٹ کی کوٹھی میں ہوا کرتا تھا جو ان کے خسر تھے۔ یہ کوٹھی جھنڈا پوکھر میں پارک کے سامنے واقع ہے۔ جاڑوں کا زمانہ تھا، وہ ایک مسہری پر نیلے رنگ کی سلیپنگ گون لپیٹے لیٹے ہوئے تھے۔ کمرے میں الماریاں کتابوں کے بوجھ سے جھکی پڑتی تھیں۔ میز پر، دریچے پر، فرش پر، قالین پر، کرسیوں پر تمام کتابیں ہی کتابیں دکھائی دیتی تھیں۔ اخبارات اور رسائل بے ترتیبی سے بکھرے پڑے تھے جس مسہری پر وہ لیٹے تھے اس پر اس دن کا اسٹیٹسمین، کچھ اردو رسالے، اور کتابیں پھیلی ہوئی تھیں۔ کمرے میں کئی بڑے بڑے سوٹ کیس رکھے تھے۔ کوئی کھلا ہوا اور کسی کے پٹ آدھے کھلے آدھے بند تھے۔ کتابیں اور کاغذات وہاں سے بھی جھانک رہے تھے۔ قریب کی ایک تپائی پر گارساں دتاسی کی تاریخ ادبیات ہندی و ہندوستانی کی دوسری جلد، Swan کی ایک پرانی دوات جس میں کسی زمانے میں اصلی روشنائی ہوگی اور ایک بہت پرانا فونٹین پین رکھا ہوا تھا۔ فاؤنٹین پین تو یہ پہلے رہا ہوگا اب تو اسے معمولی ہولڈر کی جگہ استعمال کیا جا رہا تھا۔ نب پر مختلف قسم کی سیاہیوں کی اتنی دبیز تہہ جم گئی تھی کہ اس سے سیدھے طور پر لکھنا ناممکن تھا اس لئے انھیں نب کو پلٹ کر لکھنا پڑتا تھا۔

چند ہی منٹ کی گفتگو کے بعد مجھے اچھی طرح اندازہ ہو گیا کہ ان کے ذہن و دماغ کو کمرے کی کتابوں اور کاغذات کے انتشار سے دور کا تعلق بھی نہیں۔ گفتگو آگے چلی تو اندازہ

ہوا کہ انھوں نے اپنے حافظے کی مختلف تہوں اور خانوں میں اپنی دلچسپی کی ساری معلومات نہایت اچھی ترتیب سے جھاڑ پونچھ کر اور اس طرح سج کر رکھی ہیں کہ جب، اور جہاں سے چاہتے ہیں اپنے کام کی چیز نکال کر حاضرین کے سامنے اس طرح پیش کر دیتے ہیں کہ وہ حیرت زدہ ہو جاتا ہے۔

اس ملاقات میں سب سے زیادہ جس چیز نے مجھے متاثر کیا وہ ان کی صاف گوئی تھی۔ مصنفین اور ان کے کارناموں پر گفتگو ہوئی اور انھوں نے بغیر کسی جھجک اور تکلف کے وہ رائیں دیں جنھیں وہ صحیح سمجھتے تھے، بغیر اس بات کی پروا کئے کہ میں یا وہ مصنفین ان کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں۔

مولوی عبدالحق صاحب کے متعلق گفتگو ہوئی۔ وہ انھیں صاحب طرز ادیب اور مسلم الثبوت انشا پرداز مانتے تھے۔ انجمن کے تحقیقی کاموں کے معیار سے وہ مطمئن نظر نہ آئے، لیکن انجمن نے قدیم تذکرے اور شعراء کے دواوین کی اشاعت کا جو سلسلہ شروع کیا تھا اسے قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے، وہ چاہتے تھے کہ شیخ چاند مرحوم جیسے کچھ اور رفقا مولوی صاحب کو مل جاتے تو کتابوں کا معیار اور بھی اونچا ہو سکتا تھا۔

وہ حالی کو شبلی پر ترجیح دیتے ہیں۔ لیکن وہ "یادگار غالب" کو ایک ناکام کتاب بتاتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اس زمانہ میں غالب پر اس سے کہیں اچھی اور مستند کتاب لکھی جا سکتی تھی، اس لئے بھی کہ اس وقت جو ذرائع اطلاعات حالی کے پاس تھے، اب وہ مفقود ہیں۔

مولانا سید سلیمان ندوی کی اردو تحریر انھیں پسند ہے۔ کہتے تھے کہ انشاء پردازی میں شبلی کی انھوں نے اتباع کی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ ان سے بھی آگے بڑھ گئے ہیں۔ ان کی تصانیف میں "خیام" کو ان کی بہترین تصنیف مانتے ہیں۔ لیکن ان کا خیال ہے

کہ مقلد اور مذہبی آدمی کبھی اعلیٰ درجے کے محقق اور تنقید نگار نہیں ہو سکتے ۔ اعلیٰ درجے کے تحقیقی مضامین لکھنے والے ان کے خیال میں خال خال ہیں ، ہندوستان سے باہر وہ پروفیسر براؤن اور مرزا محمد بن عبدالوہاب قزوینی اور ہندوستان میں وہ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی اور حافظ محمود شیرانی کے معترف نظر آئے ۔

اس ملاقات کو کوئی بیس سال ہونے کو آئے ، اس کی ساری باتیں اس طرح یاد ہیں جیسے ابھی کل کی ہوں ، لیکن ان کے ذکر کا یہ موقع نہیں ۔

قاضی صاحب کی ولادت عظیم آباد (پٹنہ) میں آج سے کوئی اٹھاون سال پہلے ایک سخت مذہبی خاندان میں ہوئی ۔ ان کے والد قاضی عبدالوحید مرحوم شہر کے رئیسوں میں تھے اور مشہور مذہبی عالم ۔ انھوں نے ایک مدرسہ مدرسۂ حنفیہ کے نام سے قائم کیا تھا اور وہ ایک مذہبی رسالہ 'تحفۂ حنفیہ' بھی نکالا کرتے تھے ۔ وہ ندوۃ العلماء (لکھنؤ) کے سخت مخالفین میں تھے اور اس میں شبہہ نہیں کہ صوبہ بہار میں ندوہ کا زور توڑنے میں ان کا بڑا ہاتھ رہا ہے ۔

قاضی صاحب کی ابتدائی تعلیم اسی ماحول میں ہوئی ۔ اور وہ عربی و فارسی کی تحصیل کرتے رہے ۔ ان کے ایک استاد مولانا عبدالعزیز سنبھلی تھے جو اس مدرسے میں مدرس اول تھے ۔ قرآن شریف بھی ان سے حفظ کرایا گیا ہو تو عجب نہیں ۔ مجھے اس بات کی تحقیق کا ان سے موقع نہ مل سکا ۔ انگریزی تعلیم کی ابتدا ان کے والد کی وفات کے بعد ہی ہوئی ہوگی ۔ ورنہ شاید وہ کسی طرح راضی نہ ہوتے ۔ کچھ دنوں تک ان کی تعلیم بلگرامی ٹیوٹوریل اسکول علی گڑھ میں بھی ہوئی ۔ مارچ ۱۹۱۳ء میں وہ کیمبرج گئے اور فٹز ولیم ہاؤس کے ممبر ہوئے ۔ وہاں سے انھوں نے معاشیات سیاسیات

لہ اس وقت قاضی صاحب کی عمر تقریباً ۸۱ سال کی ہے ۔ ک ۔ ا

اور تاریخ میں بی اے کیا۔ ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی صدر شعبۂ عربی و اسلامیات جامعہ کلکتہ اور ڈاکٹر محمد نظام الدین دائرۃ المعارف حیدرآباد دونوں کیمرج میں پروفیسر براؤن کے شاگرد اور قاضی صاحب کے معاصر رہے ہیں۔ ان کے اس زمانے کے دوستوں میں ڈاکٹر عمر حیات ملک، خورشید احمد بارایٹ لا، اصغر آصف علی فیضی، واجد علی خاں، فخر الدین علی احمد صاحب بشیر حسین زیدی بانکے پرشاد لموترا اور نورالدین احمد بارایٹ لا قابل ذکر ہیں۔ لندن میں بارایٹ لا کی سند بھی انھوں نے حاصل کی۔ اور لاطینی، جرمن اور فرانسیسی کی تحصیل بھی کی۔ فرانسیسی ادب سے ان کی دلچسپی اب بھی باقی ہے۔ یورپ کے بعض ممالک کی سیاحت بھی کی۔ اسی زمانہ میں وہ سخت علیل ہوئے اور علاج کے لیے سوئٹزرلینڈ کے ایک سینی ٹوریم میں داخل ہوئے جہاں کملا نہرو پہلے سے بغرض علاج موجود تھیں۔ پنڈت نہرو سے ان کی پہلی ملاقات وہیں ہوئی۔ وہاں سے وہ شفایاب ہو گئے۔ لیکن علالت کے اثرات ان کی زندگی پر دیر تک قائم رہے۔ اب ان کی مجموعی صحت اور کام کرنے کی طاقت اور ولولہ اتنا ہے کہ وہ پینتالیس ۴۵ سے زائد کے معلوم نہیں ہوتے۔ یورپ میں ان کے قیام کی مجموعی مدت سات سال ہے۔ ان کی واپسی کے بعد ان کے منجھلے بھائی قاضی محمد سعید صاحب جو جامعہ ملیہ کے پڑھے ہوئے ہیں اور ڈاکٹر عبدالعلیم صاحب کے معاصرین میں ہیں۔ یورپ پہنچے، یہ برلن یونیورسٹی کے طالب علم رہے، اور فلسفہ کی تحصیل کرتے رہے۔ جرمن بہت اچھی بولتے ہیں اور دوستوں میں فشٹے یا اقتارڈی سمجھے جاتے ہیں[1]۔ سات سال یورپ ٹھہر کر واپس آئے تو چھوٹے بھائی قاضی محمد فرید صاحب یورپ گئے انھوں نے بھی سات سال قیام کیا اور وہ کیمبرج سے معاشیات، سیاسیات اور تاریخ میں ٹرائی پوس لے کر واپس آئے۔ اب وہ کراچی

۱؎ قاضی محمد سعید کے انتقال کی تاریخ ۱۰ر نومبر ۱۹۶۶ء ہے۔ ک۔ا۔

یونیورسٹی میں انھیں مضامین کے استاد ہیں[1]۔

قاضی صاحب نے اردو ادب کا مطالعہ ۱۹۱۶ء سے پہلے شروع کر دیا تھا۔ ان کا سب سے پہلا مضمون 'الناظر' میں شائع ہوا تھا۔ یہ گارساں دتاسی کے متعلق ان کی ایک مختصر سی تحریر 'معارف' میں شائع ہوئی۔ شاد عظیم آبادی کا مجموعۂ کلام، کلام شاد، قاضی صاحب ہی نے مرتب کرا کر شائع کیا۔ یورپ کے دوران قیام میں بھی اپنے مضامین کے علاوہ اردو ادب کا مطالعہ کرتے رہے۔ اس زمانہ کے اہم مخطوطات کے جو نوٹس انھوں نے تیار کیے ہیں وہ اس پر گواہ ہیں۔

یہ سب کچھ ہوا لیکن ادبی دنیا ان سے ۱۹۳۶ء سے پہلے واقف نہ ہو سکی۔ ان کا ادبی شہرہ اس وقت ہوا، جب انھوں نے پٹنہ سے ایک بلند پایہ علمی، ادبی اور تحقیقی رسالہ 'معیار' شائع کرنا شروع کیا۔ اس کے تحقیقی مضامین اور بلند پایہ تبصروں نے ایک طرف لوگوں کو چونکایا تو دوسری طرف تحقیقی مضامین اور اعلیٰ تنقید لکھنے کا نیا اسلوب اور نیا معیار بخشا۔ مولوی عبدالحق صاحب اور بعض دوسرے مستند اہل قلم نے اس رسالہ کا خیر مقدم کیا اور اس کی بڑی تعریف کی۔

مولوی صاحب سے موصوف کے تعلقات بہت قدیم ہیں۔ سنہ ۱۹۱۶ء یا ۱۹۱۷ء کے لگ بھگ مؤخر الذکر نے مولوی صاحب اور انجمن کے کاموں کے سلسلے میں ایک مضمون بھی لکھا تھا، 'معیار' کے پہلے شمارے میں انھوں نے اردو کے مشہور مصنف اور مسلم الثبوت انشا پرداز کی حیثیت سے مولوی صاحب کی تصویر بھی شائع کی تھی۔ اور حالات زندگی اور ان کے کاموں کے متعلق ایک مضمون بھی شائع کرنے کا وعدہ کیا تھا، یہ خیال غالباً رسالے

---

[1] قاضی محمد فرید کا انتقال ۲۹ مارچ ۱۹۶۶ء کو ہوا ہے۔ ک۔ ا۔

کے جلد بند ہو جانے کی وجہ سے عمل میں نہ آسکا۔

مولوی صاحب کی فرمائش پر قاضی صاحب نے انجمن کے لئے متعدد کتابیں مرتب کرنی شروع کی تھیں، ان میں مثنویات مصحفی، اور بعض دوسری کتابوں پر کام مکمل نہ ہوسکا لیکن دیوان جوشش اور تذکرہ میر حسن دہلوی ان کی تصحیح و ترتیب کے بعد شائع ہوئیں۔ دیوان جوشش کی تصحیح و ترتیب کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں، اعلیٰ ناقدانہ متن مرتب کرنے کے سلسلے میں اسے سنگِ میل کا درجہ حاصل ہے۔ تذکرۂ میر حسن انھوں نے بڑی دیدہ ریزی سے ایڈٹ کیا ہے۔ افسوس کہ علالت اور مصروفیت کے باعث وہ اس پر جلد اپنا مقدمہ مکمل نہ کرسکے اور انجمن نے عجلت سے کام لے کر مرتب سابق کا مقدمہ کتاب میں شامل کر دیا۔ اس طرح اردو ادب کے طالب علم قاضی صاحب کے جامع اور مفید مقدمے سے ہمیشہ کے لئے محروم رہ گئے۔

آج کل وہ مختلف مضامین کے علاوہ دیوان قدرت اللہ قدرت ایڈٹ کر رہے ہیں۔ "مہمانِ میر" کے نام سے ایک کتاب لکھنا چاہتے ہیں اور مصحفی کے دواوین کا انتخاب اور اپنے مضامین کا مجموعہ شائع کرانا چاہتے ہیں۔ ان کی زندگی کے معمولات بہت سادے ہیں۔ صبح کی چائے کے بعد وہ اپنے مسودات اور کاغذات میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ انھیں میز کرسی پر کام کرتے کبھی نہیں دیکھا۔ بس وہ مسہری پر بیٹھے لکھتے پڑھتے رہتے ہیں۔ دوپہر ہوتے تک پوری مسہری اور آس پاس کی تپائیوں اور کرسیوں پر مخطوطات اور حوالے کی کتابیں منتشر ہو جاتی ہیں۔ دن کا کھانا وہیں ایک تپائی پر مسہری کے پاس لگ جاتا ہے۔ نوکر رومال ہلاتا رہتا ہے، خود کھانا تناول کرتے رہتے ہیں۔ کھانا کھانے، نہانے دھونے اور کپڑا پہننے پر وہ کم سے کم وقت خرچ کرتے ہیں۔ بس ابھی کھانا آیا، ابھی انھوں نے سوپ پیالی سے پیا، پلاؤ یا پھلکے مرغ کے ساتھ کھائے، پڈنگ یا فیرنی کے

دو چار پیچھے لئے اور پھر آم یا کوئی موسمی پھل ہاتھ میں لیا، اسے ایک نظر انھوں نے دیکھا اور تولا، دو چار پُر معلومات باتیں اس سے متعلق کیں، (اس قسم کے مسائل پر بھی ان کی نظر گہری اور دور رس ہے) پھل کاٹنے اور قاشیں کھانے شروع کئے، وہ نوکر یا کسی اور کے ہاتھ کے کٹے ہوئے پھل کھانا پسند نہیں کرتے۔ قاشوں کا انبار بھی پلیٹ میں نہیں لگاتے، بس تراشتے جاتے ہیں اور کھاتے جاتے ہیں۔ کوئی دس پندرہ منٹ میں وہ کھانے سے فارغ ہو کر کام کی طرف متوجہ ہو جائیں گے۔ گرمیوں کا زمانہ ہوا تو کچھ دیر کے لئے بستر پر لیٹ جائیں گے، وہ دن کو شاذ و نادر ہی سوتے ہیں۔ تھوڑی دیر لیٹ پوٹ کر وہ پھر کام شروع کر دیتے ہیں، ادھر ٹھیک چار بجا، ادھر نوکر چائے کے لئے پوچھنے کو آیا، کوئی صاحب موجود ہوتے تو ان کے لئے گرم گرم ناشتے کی چیزیں بن کر آگئیں پھل اور مٹھائیاں آگئیں اور چائے آگئی، خود ان کے لئے دودھ کا ایک گلاس آیا۔ شام کو وہ عام طور پر ناشتہ نہیں کرتے، دودھ یا صرف ایک پیالی چائے پی لیتے ہیں۔ کبھی یہ ضروری ہوا جیسے خود کسی کو چائے پر بلایا ہو یا کہیں ایٹ ہوم میں گئے ہو تو پھر رات کا کھانا نہیں کھاتے کوئی ملنے والا موجود نہ ہوا اور کوئی ضروری مضمون ختم کرنا ہوا تو خانہ باغ میں یا چھت پر چہل قدمی کر لی، پھر آکر اپنے کام میں لگ گئے، رات کا کھانا آٹھ ساڑھے آٹھ بجے کھا لیتے ہیں اور بالعموم دس بجے تک وہ سو جاتے ہیں۔

ہندوستانی کھانوں میں بریانی اور مرغ ان کی محبوب غذا ہے ویسے وہ یورپی کھانے خاص طور پر فرانسیسی کھانے بہت پسند کرتے ہیں، پھلوں میں آم اور آموں میں لنگڑا نہیں بلکہ سپیا (بہار کا ایک بہت لذیذ آم) انھیں مرغوب ہے، پان کبھی نہیں کھاتے

برگشن سگریٹ پہلے پیتے تھے لیکن اب مدتوں سے ترک کر رکھی ہے۔ اب انھیں کسی کھیل سے دلچسپی نہیں، کیمبرج میں بہت اچھی شطرنج کھیلنے والوں میں شمار کیے جاتے تھے اور انھیں انعام میں کالج کلر بھی ملا تھا۔ جب وہ بیرسٹری کرتے تھے تو کلب جانے کا التزام کرتے تھے اور برج بڑے شوق سے کھیلتے تھے اب یہی وقت وہ کتب خانہ خدابخش بانکی پور کو دیتے ہیں اور قلمی کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔ صبح کی سیر اور روزانہ غسل کرنے کا انھیں کوئی شوق نہیں۔ پھولوں کے علاوہ ان کے کسی خاص شوق کا مجھے علم نہیں۔ نادر کتابیں وہ خریدتے ہیں، پڑھتے ہیں، فائدہ اٹھاتے ہیں لیکن انھیں جمع کرنے اور اپنے مکان کو نمائش گاہ بنانے کا خیال کبھی نہیں ہوا،

میں نے انھیں سخت دماغی پریشانی یا کرب کی حالت میں کبھی نہیں پایا۔ نہ کبھی کسی پر آن تک خفا ہوتے دیکھا۔ ہاں مسلم لیگ کی بدعملیوں اور ارکین کی غیر ذمہ دارانہ حرکتوں کا جب ذکر آیا تو وہ اکثر بیزار اور ناراض نظر آئے۔ زمانۂ حال کے مصنفین جو بلا ضرورت اور بغیر تحقیق و توجہ کے کتاب لکھنے کو تیار ہو جاتے ہیں ایسے لوگوں سے وہ بڑے ناراض ہوتے ہیں اور کہتے ہیں یہ لوگ غول بیابانی ہیں غلط اطلاع پھیلا کر وہ پبلک کو دھوکا دیتے ہیں ان کی سزا اشارۂ عام یہ ہونی چاہئے۔

اپنے اصولوں میں بڑے پختہ ہونے کے باوجود وہ بڑے خوش اخلاق ہیں اور ہر قسم کے پڑھے لکھے آدمیوں سے بلا تکلف ملتے جلتے رہتے ہیں۔ آئے دن بھانت بھانت کے لوگ ان کے پاس آتے رہتے ہیں، ادبی کاموں سے بھی اور خالص غیر ادبی کاموں سے بھی۔ ایک صاحب اُن کے پرانے ملنے والوں میں ہیں، اکثر ان کے پاس آتے ہیں دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کرتے ہیں پھر حرف مطلب زبان پر لاتے ہیں۔ پچھلے قرضوں کی عدم ادائیگی پر اظہار افسوس کرتے ہوئے نئے قرض کی رقم طلب کرتے

ہیں، قاضی صاحب بڑے شوق و ذوق سے ساری باتیں سنتے ہیں پھر یا تو ٹوک دیتے ہیں یا کوئی مفید مشورہ۔

ایک بار ایک بزرگ ان کے پاس آئے اور اپنی تصنیف جو انھوں نے امیر مینائی پر کی تھی، رائے کے لئے پیش کی، قاضی صاحب نے مطالعہ کے بعد عدم اشاعت کا مشورہ دیا اور انھیں بتایا کہ اس کتاب میں کوئی نئی بات نہیں، ماخذ صرف تین کتابیں ہیں اور جس کی نظر سے یہ کتابیں گزری ہیں اسے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ مصنف جو بہر حیثیت پر اپنی کتاب شائع ہی کرنی چاہتے تھے بولے: حضرت میں یہ تصنیف ان لوگوں کے لئے شائع کرنی چاہتا ہوں جن کی نظر سے یہ تین کتابیں نہیں گزریں۔ قاضی صاحب مسکرا کر خاموش ہو گئے۔ کتاب کو شائع ہوئے آج پندرہ بیس سال ہو گئے، عام طور پر لوگ نہ مصنف کو جانتے ہیں نہ ان کی کتاب کو۔

ایک دوسرے کرم فرما ایک مرتبہ اپنے رسالے کا پہلا شمارہ لے کر ان کی خدمت میں پہنچے اور خواہش ظاہر کی کہ اس کی قلمی معاونت فرمائیں۔ قاضی صاحب نے حتمی طور پر انہیں رسالہ بند کر دینے کا مشورہ دیا۔ یہ بہت کم سمجھ اور کم سواد سے آدمی تھے۔ معلوم نہیں کن لوگوں نے رسالہ جاری کرنے کا انھیں مشورہ دیا تھا۔ انھوں نے سرورق پر بہت نمایاں طور پر "بیادگار شیخ الاسلام والمسلمین حضرت علامہ شاہ ...... حسن قادری فردوسی ...... رحمتہ اللہ علیہ" چھپوا رکھا تھا۔ دوران گفتگو میں انھوں نے یہ بتایا کہ ان کے والد فلاں خانقاہ کے سجادہ نشین ہیں اور اب تک بقید حیات ہیں۔ قاضی صاحب نے کہا کہ اگر آپ رسالہ بند نہیں کرنا چاہتے ہیں تو کم از کم سرورق سے رحمتہ اللہ علیہ نکال دیجئے۔ بہت ہی دانائی کا ثبوت دیتے ہوئے بولے:۔ صاحب اب تو ٹائٹل پیج کا بلاک بن گیا ہے۔ اسے ضائع کرنا پڑے گا، فی الحال اسی طرح چلنے دیجئے۔ چنانچہ وہ اب تک اسی طرح چل رہا

ہے اور ان کے والد اب تک اسی طرح بقید حیات ہیں۔ خدا باپ بیٹے دونوں کو اپنی رحمت کاملہ سے نوازے۔

ان کے یہاں ایک خاص قسم کی سختی اور اکھڑ پن ہے، وہ ویسے بہت ملنسار، متواضع، خلیق اور دوست نواز ہیں لیکن وہ جب کسی معاملے میں اصولی طور پر متفق نہ ہوں تو انھیں راضی کرنا آسان نہیں۔ ایسے موقعوں پر نہ وہ بڑے سے بڑے شخص کی پروا کرتے ہیں اور نہ مشہور اداروں انجمنوں کی۔ ان کا دماغ ایک ادیب سے زیادہ ایک ریاضی داں اور قانون داں کا دماغ ہے۔ وہ بات کا وہی مفہوم لیتے ہیں جو الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے' مافی بطن الشاعر' سے انھیں کوئی دلچسپی نہیں۔

ایک بار ایک صاحب نے اپنے یہاں تقریب میں مدعو کیا اور پانچ بجے شام کا وقت مقرر ہوا۔ قاضی صاحب ٹھیک وقت پر جب وہاں پہنچے تو مکان، میزبان اور مہمان سے خالی تھا۔ قاضی صاحب انتظار میں بیٹھے رہے، فراش چھڑکاؤ کرتے رہے اور شہنائی بجانے والے شہنائی بجاتے رہے۔ چھ بجے جب قاضی صاحب لائبریری جانے کے لئے اٹھے تو صاحب خانہ وارد ہوئے، یہ جان کر بہت شرمندہ ہوئے کہ وہ پانچ بجے سے انتظار میں ہیں اور بولے: میری مراد پانچ سے پانچ نہ تھی۔ قاضی صاحب نے کہا: لیکن میری مراد ہمیشہ پانچ سے پانچ ہی ہوتی ہے" اور یہ کہا اور رخصت ہو گئے۔

مولوی عبد الحق صاحب نے ان سے تذکرہ میر حسن مرتب کرایا۔ مولوی صاحب چاہتے تھے کہ مقدمہ کتاب بھی وہ جلد حوالۂ قلم کر دیں۔ قاضی صاحب کہتے تھے کہ اصل کتاب کے چھپ جانے کے بعد ہی مقدمہ لکھا جا سکتا ہے، اس لئے کہ اکثر مقامات پر کتاب کے صفحات کے حوالے ہیں۔ کتاب چھپ گئی اور انجمن نے مقدمے کا تقاضا کیا۔ قاضی صاحب جس طرح لکھنا چاہتے تھے اس کے لئے ضروری تھا کہ ہندوستان کے مختلف کتب خانوں سے متعلقہ معلومات حاصل ہو جائیں۔ اس میں دیر ہوئی تو انجمن نے انھیں لکھا کہ آپ فلاں تاریخ

تک مقدمہ بھیج دیجئے ورنہ کتاب بغیر آپ کے مقدمے کے شائع ہو جائیگی۔ قاضی صاحب نے لکھ بھیجا، مقدمہ نہیں بھیج سکتا، کتاب شوق سے شائع کر دیجئے۔ کتاب ان کے مقدمے کے بغیر شائع ہو گئی۔ قاضی صاحب کی بعض خاص عادات کا ذکر یہاں نامناسب نہ ہوگا۔

وہ خطوط کثرت سے لکھتے ہیں۔ پوسٹ کارڈ زیادہ، لفافہ کم۔ کبھی کبھی ایک کارڈ میں دو مختلف خط دو مختلف اشخاص کے نام لکھے ہوئے ملیں گے۔ اگر ایسا خط کبھی آپ کو مل جائے تو سمجھئے کہ جو بلو بلیک روشنائی سے لکھا ہے وہ پرایا خط ہے اور جو سرخ روشنائی سے بین السطور میں تحریر ہوا ہے، وہ آپ کے نام ہے۔ اس کا بھی امکان ہے کہ یہ دونوں خط آپ کے نام نہ ہوں بلکہ جلی طور پر جو بلو یا سرخ پنسل سے چند لفظ لکھے گئے ہیں صرف انہی کے مخاطب آپ ہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ انھوں نے کوئی خط کسی کو لکھا اب یا تو وہ خط کتابوں میں یا کاغذات میں چھپ کر رہ گیا اور پوسٹ نہ ہو سکا۔ یا ابھی پوسٹ ہونے نہ پایا تھا کہ مکتوب الیہ کا خط آ گیا یا پھر قاضی صاحب کا خیال بدل گیا اور قصداً وہ خط پوسٹ نہ کیا گیا۔ اب کسی اور کو اس کے خط کی رسید دینی ہے یا کوئی اور اہم لیکن مختصر بات لکھنی ہے وقت پر سادے کارڈ موجود نہیں ہیں تو وہ اس مستعمل کارڈ کو قلم زد کر کے دوسرا خط آپ کے نام لکھ دیں گے۔ یہ عام طور پر سرخ روشنائی سے لکھتے ہیں۔ تاکہ دونوں خطوط کے مضمون میں التباس نہ پیدا ہو۔ اب اگر یہ خط بھی کسی وجہ سے پوسٹ نہ ہوا اور کسی شخص کو صرف دو جملے لکھنے ہیں (رجسٹری مل گئی، شکریہ؛ یا آپ کا خط آج بھی نہ آیا، یا کل بمبئی کے لئے روانہ ہو رہا ہوں، بر دف حسب ذیل پتا پر بھیجئے وغیرہ وغیرہ) تو پھر یہ کارڈ استعمال کیا جائے گا۔ قلم کبھی ٹھیک ہوگا، کبھی بہت بے تکا، نئی نب بدلی گئی ہے تو ٹھیک ہے۔ اس زمانہ میں عام طور پر تحریر بہت صاف اور نسبتاً خوش خط ہوگی جوں جوں نب گھستی جائیگی، تحریر اور انداز خط بگڑتا جائیگا لیکن حروف جلی بہت واضح ہونگے

اور شوشوں اور دائروں میں بڑا خیال رکھا جائے گا۔

خطوط زیادہ تر علمی و ادبی مسائل سے متعلق ہوتے ہیں، غیر متعلق باتوں کا وہاں گذر نہیں میرے پاس ان کے خطوط و رقعات کی بہت بڑی تعداد اب بھی محفوظ ہے۔ پانچ دس ہی مقام پر انھوں نے اس اصول سے انحراف کیا۔ بہار کے فسادات کے زمانہ میں انھوں نے بہت سے خط لکھے تھے صرف ایک خط میں انھوں نے تحریر کیا تھا کہ پٹنہ میں اب سکھ کثرت سے آگئے ہیں۔ ایک بار انھوں نے ایک قومی کارکن کے بارے میں لکھا کہ ممکن ہے کسی زمانے میں ان کا کردار اعلیٰ رہا ہو لیکن ابتوان میں اور عام سیاسی لوگوں میں کچھ فرق نہیں رہا۔ میرے آکسفورڈ کے دوران قیام میں ایک بار انھوں نے کیمبرج سے اپنے کالج کی کلرٹائی منگانے کے لئے لکھا تھا۔ ایک دو بار علی گڑھ سے بوگن ویلیا کے پودوں کے بھیجنے کی فرمائش کی تھی۔

خطوط کا جواب بڑی پابندی سے دیتے ہیں اور عام طور پر ان کے خطوط طویل بھی ہوتے ہیں اور کبھی صرف ایک سطر کے لیکن عام طور پر جو اختصار اور ایجاز ان کے مضامین میں ہے اس کی جھلک ان کے خطوط میں بھی ملتی ہے۔ مضامین کی طرح کبھی کبھی وہ خطوط میں بھی رموز اور مخففات کا استعمال کرتے ہیں۔ "شخص معلوم نے معاملہ معلومہ کے متعلق کیا کہا؟" "جن سے میں نے گفتگو کی وہ جلد ہی اس سلسلے میں خط لکھیں گے!" کبھی آخر میں دستخط کے بجائے وہ صرف " د " لکھ دیتے ہیں۔

وقت پر جواب آپ انھیں نہ دیں تو برا مان جاتے ہیں اور بعض مرتبہ ناراض ہو جاتے ہیں۔ لیکن وہ انسانی کمزوریوں اور ڈاک کے محکمہ کی بدنظمیوں سے اچھی طرح واقف ہیں اس لئے ناراض ہونے سے پہلے وہ اپنے مکتوب الیہوں کو بڑا موقع دیتے ہیں مثال کے طور پر کسی مسئلے کے متعلق انھوں نے آپ کو خط لکھا آپ نے جواب نہ دیا تو ہفتہ دو

ہفتہ کے بعد وہ دوسرا خط لکھیں گے اور بخوبی ممکن ہے کہ پچھلے خط کے مضمون کا اعادہ کریں گے، شاید آپ کو ان کا پہلا خط ملا نہ ہو۔ آپ نے اب بھی توجہ نہ فرمائی تو کچھ دنوں کے بعد یاد دہانی کرائیں گے آپ نے اب بھی تساہل سے کام لیا تو آخری بار خط رجسٹرڈ بھیجیں گے اب اگر اس پر بھی آپ خاموش رہے تو پھر ان کی ناراضی سے دنیا میں آپ کو کوئی نہیں بچا سکتا۔

خطوط اور مضامین لکھنے کے لئے نہ تو خاص کاغذ کی پابندی ہے اور نہ سیاہی اور نب کی پروا۔ میرے پاس ان کے کچھ خانہ ساز پوسٹ کارڈ بھی ہیں جو حکومت کی مشینوں میں بننے کے بجائے ان کے ہاتھوں سے بنے ہیں، یعنی وہ کچہری یا ردی کاغذ کو لے کر جس کا ایک طرف سادہ ہے انھوں نے گوند سے چسپاں کر دیا ہے۔ پھر اسے کاٹ کر کارڈ کے سائز کا بنا دیا ہے۔ ایک بار اتفاق ایسا ہوا کہ خط جب آدھی منزل تک آچکا تھا کاغذ نے چپکنے سے اور گوند نے چپکانے سے انکار کر دیا نتیجہ یہ ہوا کہ کارڈ کے پتے والا حصہ مجھے مل گیا لیکن وہ ورق جس پر خط کی ابتدائی عبارتیں درج تھیں، راہ میں گم ہو گیا۔

مضامین وہ بڑی تقطیع کے صاف ستھرے کاغذ پر کبھی نہیں لکھتے۔ وہ عام طور پر ردی یا چھوٹی تقطیع کے کاغذوں پر مسودہ تیار کرتے ہیں۔ کانٹ چھانٹ کے بعد وہ دوسری صاف نقل تیار کرتے ہیں۔ یہ نقل واضح ہوتی ہے اور عام طور پر کتابی کے سائز کی ہوتی ہے۔ حاشیہ بین السطور کے لئے گنجائش کم ہوتی ہے۔ ایک بار میرے سامنے انھیں ایک مضمون شروع کرنے کا موقع ملا۔ ملازم سے فل اسکیپ سائز کے کاغذ منگوائے اس پر لکھنے کے بجائے انھوں نے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کروا لیے اور جب اس کی تقطیع طبیوں کے نسخوں کی تقطیع کے برابر ہو گئی تو اطمینان سے انھوں نے مضمون لکھنا شروع کر دیا۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کوئی خیال ان کے دماغ میں آیا سامنے رکھا ہوا جو بھی کاغذ ملا اسی پر انھوں نے اپنے خیالات عجلت میں قلم بند کرنے شروع کئے۔ اگر مناسب لفظ نہیں ملتے ہیں تو اس کی جگہ چھوڑتے ہوئے وہ آگے بڑھ جاتے ہیں، بعض مقامات پر وہ الفاظ بھی مکمل کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ میرے پاس ان کے ایسے مسودات بھی ہیں جو کچہری کے کاغذات کی پشت پر لکھے گئے ہیں تعیل پر چند سطور ان کی لکھی ہوئی میرے پاس ہیں جو انگریزی اخبار کے حاشیے پر تحریر ہوئی ہیں۔ کسی مضمون کا خیال پیدا ہوتے ہی، بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ وہ مضمون لکھنا شروع کر دیں رسالوں کے خاص نمبر ہوں یا وقتی طور پر عجلت میں کوئی مضمون لکھنا ضروری ہوا تو اور بات ہے ورنہ عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ مختلف موضوعات ان کے دماغ میں چکر کاٹتے رہتے ہیں کتابوں کا مطالعہ جاری رہتا ہے مواد جمع ہوتا رہتا ہے، برسوں کے بعد وہ خیالات اور معلومات ایک مضمون یا مضمونچے کی شکل اختیار کرتے ہیں۔

۱۹۳۳ء میں انھوں نے 'معیار' کے ایک نمبر میں ایک استفسار شائع کیا کہ 'نگاہ داد' والے اشعار غالب نے قدسی کی طرف منسوب کئے ہیں، کلیات قدسی کے قلمی نسخے دیکھے یہ اشعار موجود نہیں۔ ایک فارسی مجموعے میں یہ اشعار عشرتی کے نام نظر آئے اگر کسی صاحب کو اس کا تحقیقی علم ہو کہ یہ غزل کس کی ہے تو مجھے مطلع فرمائیں۔

کئی سال کے بعد ایک مختصر سا نوٹ، یاد آتا ہے اس موضوع پر انھوں نے معاصر ۱۹۴۱ء میں شائع کیا۔ آخر ۱۵ سال کے بعد تفصیل سے اس موضوع پر معاصر (مئی ۱۹۵۱ء) میں بحث کی اور حق تحقیق ادا کیا اس مضمون میں انھوں نے ثابت کیا کہ یہ غزل نصرتی کی ہے جو نصرتی بھی اپنا تخلص کیا کرتا تھا۔

یہی حال "غالب بحیثیت محقق" کا ہے ۱۹۳۶ء سے پہلے ان کا مطالعہ غالبیات

محدود تھا۔ غالب سے بحیثیت فنکار اور بحیثیت انسان کے وہ پہلے سے متاثر تھے لیکن ان کی تصانیف کا باضابطہ مطالعہ انھوں نے اس کے بعد ہی شروع کیا ہے۔ جس زمانے میں وہ قاطع برہان اور اس سلسلے کی ساری تصانیف کا مطالعہ کر رہے تھے ان پر یہ حقیقت روشن ہوئی کہ غالب بحیثیت شاعر اور انشا پرداز بہت بلند ہیں لیکن فارسی زبان و ادب ایران کا مطالعہ اتنا بھی نہیں جتنا ان کے بعض معاصرین کا ہے۔ یہ نظریہ مسلمات کے خلاف تھا اور بہت دلچسپ، جوں جوں ان کا مطالعہ بڑھتا گیا اس موضوع سے دلچسپی میں اضافہ ہوتا گیا۔ ۱۹۶۹ء کے کسی مہینے میں میرا ان سے ملنا ہوا، کئی ملاقاتوں میں یہی تذکرہ رہا۔ وہ "قاطع برہان" کی عبارتیں پڑھتے جاتے تھے اور اس کی تردید میں دلائل اور حوالے کتابوں سے ڈھونڈھ کر پیش کرتے جاتے تھے۔ فارسی ادب کی شاید ہی کوئی مستند کتاب جو انھیں مل سکی ہو اور انھوں نے چھوڑی ہو۔ میں نے خواہش ظاہر کی کہ آپ علیگڑھ میگزین کے غالب نمبر کے لئے ایک مضمون لکھ دیں جس میں یہ سارے مباحث مفصل طور پر آجائیں۔ انھوں نے فوراً رضامندی ظاہر کی۔ ایک طویل مضمون لکھ کر دیا جواب 'نقدِ غالب' میں مزید ترمیم و اضافہ کے بعد طویل تر ہو گیا ہے، یہ گویا اس موضوع پر ان کے پندرہ بیس سالہ مطالعے کا نچوڑ ہے۔

انھیں مضمون میں لمبی تمہید سخت ناپسند ہے اگر ضروری معلوم ہوا تو صرف چند سطروں پر اکتفا کرتے ہیں، ورنہ انھیں جو کچھ کہنا ہوتا ہے براہ راست کہہ ڈالتے ہیں اور پھر بغیر کسی اختتامی پیراگراف کے مضمون ختم کر ڈالتے ہیں۔

ترجمہ کرنے کے کام کو وہ بہت مشکل کام گردانتے ہیں اور اسے خود مصنف کے معیار سے جانچتے ہیں۔ کہتے ہیں کامیاب ترجمہ وہ ہے جب اصل مصنف کو سنایا جائے اور وہ مطمئن ہو جائے کہ مضمون یا افسانے کی صحیح روح ترجمے میں آگئی ہے۔ اردو رسالوں میں

جو مغربی افسانہ نویسوں کے افسانوں کے تراجم چھپتے ہیں ان سے قطعاً مطمئن نہیں ہیں۔ اس بات سے انھیں اور بھی تکلیف ہوتی ہے کہ بعض رسالوں میں مصنف بجائے مترجم کے برابر بھی نہیں سمجھے جاتے اور ان کی دماغ سوزی کی اس طرح داد دی جاتی ہے کہ بعض افسانوں کے تراجم کے ساتھ ان کا نام بھی نہیں ہوتا۔

صحیح ترجمے کی ذمہ داریوں کا انھیں پورا احساس ہے اس لیے خود ترجمہ کرتے ہوئے گھبراتے ہیں۔ افسانے اور مضامین تو درکنار اپنے کسی مضمون میں کسی انگریزی مصنف کا قول نقل کرنا ہوتا تو اکثر دیکھا ہے کہ ترجمہ کے بغیر اصل انگریزی کی عبارت انھوں نے نقل کر دی۔ 'معیار' کے دورِ ادارت میں انھوں نے متعدد مغربی افسانہ نویسوں کے ترجمے منصور احمد مرحوم اور بعض دوسرے معتبر آدمیوں سے کرائے تھے لیکن کوئی افسانہ ایسا نہ تھا جس کا اصل سے مقابلہ کرنے پر انھیں یہ احساس نہ ہوا ہو کہ ترجمے میں ایک آنچ کی کسر باقی رہ گئی ہے۔ میں نے ایک دن ان سے ترجمہ کے ذکر پر عنایت اللہ دہلوی مرحوم کا نام لیا اور پوچھا ان کے ترجموں کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟ آنکھیں بند کر کے چند لمحے خاموش رہے پھر بولے: انھیں ترجمے پر خاصی قدرت حاصل ہے اور ان کا ترجمہ رواں دواں ہوتا ہے لیکن ایسی بات نہیں کہ ان کے ترجمے میں خامیاں نہ ہوں۔ "فلامبر" کا ایک نسخہ ان کی میز پر پڑا تھا، جسے شاید احمد صاحب نے حال ہی میں دہلی سے شائع کیا تھا اس کی ورق گردانی کرتے ہوئے انھوں نے ایک صفحہ کھولا، اصل فرانسیسی ناول سے مقابلہ کر کے انھوں نے کہا اس ایک صفحے میں ترجمے کی دو غلطیاں ہیں۔ انھوں نے از راہِ احتیاط یہ بھی کہا فی الحال یہ کہنے سے قاصر ہوں کہ یہ غلطی عنایت اللہ صاحب کی ہے یا انگریزی ترجمہ نگار کی اس لئے کہ انھوں نے اصل فرانسیسی سے نہیں بلکہ انگریزی ترجمے سے کتاب کو اردو میں منتقل کیا ہوگا۔

انھوں نے طویل مضامین بھی لکھے ہیں جو سو سوا ڈیڑھ ڈیڑھ سو صفحوں پر محیط ہیں، بلکہ ایک مضمون تو ان کا تقریباً ڈھائی سو صفحوں میں ختم ہوا ہے اس پر بھی ان کے الفاظ میں "بہت سے سخنہائے گفتنی، ناگفتہ رہ گئے، اور بہت سے مقامات میں جہاں تفصیل کی ضرورت تھی اجمال سے کام لینا پڑا" ضرورت کی بات دوسری ہے ورنہ عام طور پر ان کی تحریریں بہت مختصر ہوتی ہیں اور ان کے یہاں بڑا ایجاز ہے انھوں نے بعض مقالے ورق یا دو ورق میں ختم کر دیئے ہیں اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ مواد ہمیشہ ان کے قبضہ میں ہوتا ہے وہ کبھی مواد کے قبضے میں نہیں ہوتے پھر انشا پردازی پر انھیں پوری قدرت حاصل ہے جس کی وجہ سے وہ طول نویسی سے بچ جاتے ہیں۔ وہ اپنے مضامین پر پوری توجہ اور وقت صرف کرتے ہیں اور محمد علی مرحوم کی طرح انھیں اپنی طول نویسی کی معذرت پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی کہ میرے پاس وقت نہیں ہے کہ مضمون یا خط مختصر لکھ سکوں۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ ضرورت سے زیادہ لفاظی ممکن ہے ابوالفضل کے عہد میں پسند کی جاتی ہو، آج کل تو والٹر پیٹر کے اس قول پر عمل ہے کہ اپنی تحریر کو زائد سے مبرا کرو۔

ان کی تحریریں مبالغے کے لئے گنجائش نہیں۔ الفاظ کا انتخاب سوچ سمجھ کر اور ان کا استعمال ان کے صحیح مفہوم کو جان کر ہی کرتے ہیں۔ وہ ہمیشہ کہا کرتے ہیں کہ اچھے ادیب اور محتاط لکھنے والے اپنے الفاظ کے انتخاب اور ان کے صحیح استعمال سے پہچانے جاتے ہیں۔ میرے کسی ایک مضمون میں لفظ "بیحد" استعمال ہوا تھا (یہ معلومات بیحد قیمتی ہیں یہ کتاب بیحد کمیاب ہے وغیرہ) انھوں نے اعتراض کیا اس پر بھی جب میں نے یہ مذموم عادت ترک نہ کی تو انھوں نے مجھے لکھا کہ آپ اس لفظ کو اپنی ڈکشنری سے بالکل

خارج کردیں۔ میں نے ایک بار ان کا ایک مضمون شائع کرتے ہوئے لکھا تھا کہ قاضی صاحب نے ایک تحقیق کو اس پایہ پر پہنچا دیا ہے جس سے آگے متصور نہیں ہو سکتا۔ ان کا فوراً خط آیا کہ آپ کی رائے مبالغہ پر محمول ہے میرا دعویٰ ہے کہ اس سے کہیں بہتر مضامین لکھے جا سکتے ہیں۔

کلیم الدین احمد صاحب کی طرح ان کے خلاف جو مضامین لکھے جاتے ہیں، ان کا جواب شاذ و نادر ہی دیتے ہیں۔ وہ تو پہلے یہ دیکھ لیتے ہیں کہ مخاطب کس ظرف کا آدمی ہے۔ ویسے وہ اختلاف رائے کو پسند کرتے ہیں، بلکہ علمی معاملات میں ایسی بحث و تمحیص کو وہ ضروری جانتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ وہ جب کوئی تنقید لکھتے ہیں یا کتابوں پر تبصرے کرتے ہیں، تو جہاں تک ممکن ہوتا ہے وہ انصاف اور دیانت سے کام لیتے ہیں لیکن وہ نہ معصوم ہیں نہ منزہ عن الخطا اس لئے بخوبی ممکن ہے کہ بغیر اس کے کہ ان کے ارادے کو اس میں دخل ہو انصاف اور حقیقت کے خلاف کچھ باتیں قلم سے نکل جائیں یا واقعات کی غلطیاں ہو جائیں یا یہ کہ مصنف کے نقطۂ نظر کو صحیح طور پر سمجھنے سے وہ قاصر رہیں، اس لئے وہ چاہتے ہیں کہ مصنفین یا دوسرے ذمہ دار حضرات ان کے تبصروں سے اختلاف کریں اور ان کی غلطیوں سے انھیں مطلع کریں۔ جب تک وہ اپنا رسالہ "معیار" نکالتے رہے اس کا انھوں نے التزام رکھا اور اس ارادے کو عملی جامہ پہناتے رہے۔ کسی نے ان سے اختلاف کیا اور اعتراضات کئے تو اس کا خط یا مضمون چھاپنا ضروری ہوا تو چھاپا اور ضرورت ہوئی تو جواب دیا ورنہ اس کی بات مان لی اور شکریہ ادا کیا۔ تصنیفات پر رائے دینے میں یا تبصرہ لکھنے میں وہ بڑے محتاط ہیں وہ چلتی چلاتی یا مصلحت وقت پر مبنی رائے کبھی نہیں دیتے اور اسے خالص غیر علمی حرکت بتاتے ہیں۔

ان کی تنقیدوں کی تیزی کو برداشت کرنا ہر خاص و عام کا کام نہیں اس کے لئے

اگر ایک طرف ضبط اور قوت برداشت کی ضرورت ہے تو دوسری طرف اس سے صحیح طور پر محظوظ ہونے کے لئے علم کی تلاش وجستجو کی صحیح روح ناگزیر ہے۔ جو لوگ ان کے امتحان میں پورے اترے ہیں ان میں تہیش پرشاد، امتیاز علی صاحب عرشی اور مالک رام صاحب خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس سلسلے میں مجھے ایک کرم فرما یاد آتے ہیں۔ ان کے مضامین کا مجموعہ شائع ہوا تو قاضی صاحب نے اس پر ریویو لکھنے کا خیال ظاہر کیا وہ بڑے گھبرائے اور انھوں نے اس ارادے سے انھیں باز رکھنے کی کوشش کی اور لکھا کہ "بھلا میرا حقیر مجموعہ آپ کی تنقید کا متحمل کس طرح ہو سکتا ہے"۔ جب ان کی دوسری تصنیف ایک اہم موضوع پر شائع ہوئی تو انھوں نے ایک نسخہ قاضی صاحب کی خدمت میں رائے کے لئے پیش کیا۔ انھوں نے پہلے تو بعض مشتبہ باتیں ان سے خط لکھ کر پوچھیں پھر انھیں مطلع کیا کہ وہ اس کتاب پر ایک تفصیلی تبصرہ لکھ رہے ہیں جو تقریباً ۱۰۰ صفحات پر مشتمل ہوگا۔ اس تنقید پر قاضی صاحب نے اس قدر محنت کی جس قدر انھوں نے اپنی کتاب لکھنے میں کی ہوگی اور تنقید اس قدر پر معلومات تھی کہ اگر مصنف نظر ثانی کے وقت اسے پیش نظر رکھیں تو اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ ان کی کتاب اپنے موضوع پر بہترین کتاب ثابت ہو لیکن اس اطلاع کے پاتے ہی مصنف نے ان سے خط کتابت تک بند کر دی۔

تنقید وہ بہت صاف، کھری اور بے لاگ لکھتے ہیں اس سلسلے میں نہ وہ تعلقات کا پاس رکھتے ہیں نہ دوستی کا۔ بلکہ میرا خیال ہے کہ دوستوں پر وہ اور بھی شیر ہو جاتے ہیں۔ عرشی صاحب جن سے ان کے دیرینہ تعلقات ہیں کی جس قدر کتابوں پر انھوں نے تبصرے لکھے ہیں شاید ہی کسی مصنف کی تصنیفات پر لکھے ہوں۔ تبصروں کی طوالت اور اختصار زیادہ تر کتاب اور موضوع کی اہمیت کی بنا پر ہوتا ہے۔

مخطوطہ اکبر مرتّبہ راقم پر ان کا تبصرہ صرف پانچ سطروں کا ہے لیکن مخطوط غالب مرتّبہ عرشی پر ان کا تبصرہ کوئی پانچ قسطوں میں شائع ہوا۔

تبصروں میں غلطی ان سے بالکل نہیں ہوتی اور رواج زمانہ کے خلاف تعریفی کلمات بہت کم لکھتے ہیں، جن کتابوں پر آج تک انھوں نے تبصرے لکھے ہیں ان میں سب سے زیادہ وہ دیوان فائز سے متاثر معلوم ہوتے ہیں، جس کی ترتیب و تصحیح جناب مسعود حسن رضوی ادیب نے کی ہے مختلف صحبتوں میں میرے سامنے اس کتاب کا ذکر آیا اور ہمیشہ انھوں نے بہت اچھے الفاظ میں اس کتاب کی تصحیح و ترتیب کا ذکر کیا۔ بایں ہمہ جب انھوں نے 'معاصر' میں اس پر تبصرہ لکھا تو تعریف میں صرف ڈھائی سطریں لکھیں، "فاضل مرتّب نے فائز اور ان کے کلام کو سمجھنے کی سعی بلیغ کی ہے اور قدما کے کلام کو پیش کرنے کا جو اسلوب انھوں نے اختیار کیا ہے وہ اس قسم کی اور کتابوں میں جو انجمن نے شائع کی ہیں۔ بہت کم ملتا ہے، ترتیب کا یہ بلند معیار قابل تقلید ہے"۔

فارسی اور اردو ادب کا مطالعہ جس قدر انھوں نے کیا ہے اور جس قدر مسائل ان کے ذہن نشین ہیں اس کا اندازہ عام طور پر لوگوں کو نہیں ہے جن لوگوں نے انھیں قریب سے دیکھا ہے ان ہی کو کچھ اندازہ ہو سکتا ہے۔ ہر چند کیمبرج میں ان کے مضامین معاشیات، سیاسیات اور تاریخ تھے لیکن چونکہ ادبیات فارسی و اردو کا ذوق انھیں بہت پہلے سے تھا اس لئے دوران قیام انگلستان میں انھیں ان موضوعات پر اپنا مطالعہ وسیع کرنے کا بہت اچھا موقع ملا بہت سی قلمی کتابوں کے خلاصے یا نوٹس ان کے پاس اسی زمانے کے لکھے ہوئے ہیں۔

یورپ سے واپسی کے بعد غالباً انھوں نے ملازمت کی طرف توجہ نہیں کی، ہاں بیرسٹری

کچھ دنوں انھوں نے ضرور کی لیکن یہ پیشہ ان کی افتادِ طبیعت کے مطابق نہ تھا۔ خوش نصیبی سے ان کا تعلق ایک متموّل خاندان سے ہے اس لئے انھوں نے بہت سے علائق و مکروہات سے بہ آسانی پیچھا چھڑا لیا (ان کی شخصیت جو بہت نڈر، بے باک اور حق گو قسم کی ہے اس کا بھی راز یہی ہے) اس وقت سے اب تک ان کا واحد شغل کتب بینی اور تالیف و تصنیف ہے۔

کتب بینی اور کثرتِ مطالعہ ہیچ ہے اگر کسی میں قوتِ استدلال و تمیز نہ ہو یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک اس میں مواد کی پرکھ اور نقد کا شعور نہ ہو۔ قاضی صاحب میں یہ ساری خوبیاں جمع ہیں۔ عام طور پر محققین اپنے تحقیقاتی کاموں کی ابتدا "شک" سے کرتے ہیں۔ قاضی صاحب کی ابتدا "نفی" سے ہوتی ہے۔ لوگ عام طور پر جو بات کہی جاتی ہے فوراً مان لیتے ہیں جب تک کہ اس کا غلط ہونا ثابت نہ ہو جائے، وہ ہر بات کو ماننے سے انکار کر دیتے ہیں جب تک کہ آپ اس کی صحت نہ ثابت کر دیں۔

ان ساری باتوں کے علاوہ جو وصف انھیں دوسرے محققین سے ممتاز کرتا ہے، وہ ان کی قوتِ حافظہ ہے۔ ایک بار ایک مجلس میں جس میں متعدد ادیب اور شاعر موجود تھے ذکر چھڑا کہ اردو کے ہزاروں شعر ایسے ہیں جو زبان زد ہیں لیکن عام طور پر معلوم نہیں کہ کس کے شعر ہیں لوگوں نے یکے بعد دیگرے کوئی دس شعر پڑھے قاضی صاحب نے فوراً بتا دیا کہ یہ شعر کس کے ہیں۔ اب ان کی باری آئی انھوں نے جو شعر پڑھے ہم لوگ کسی کا جواب نہ دے سکے۔ ان شعروں میں ایک یہ بھی تھا جو زبان زد خاص و عام ہے:

ترچھی نظروں سے نہ دیکھو عاشقِ دلگیر کو
کیسے تیر انداز ہو سیدھا تو کر لو تیر کو

بعد میں انھوں نے بتایا کہ یہ شعر وزیر لکھنوی استاد ناسخ کا ہے۔ گو بعض تذکروں میں خود ناسخ کے نام سے درج ہے۔

اپنے وسیع مطالعے اور حافظے ہی کی مدد سے انھوں نے آوارہ گرد اشعار کا ایک سلسلۂ مضامین شروع کیا ہے جس میں ایسے اشعار درج ہیں جو دوسرے شعراء کی طرف بھی منسوب ہیں۔ اس کی متعدد قسطیں ہندوستان اور پاکستان کے رسائل میں شائع ہو چکی ہیں اور جنھوں نے اس کا مطالعہ کیا ہے، وہ ان کی تجسس و تلاش کی داد دیے بغیر نہ رہیں گے۔ فارسی کا یہ شعر کس نے نہیں سنا ہے:

در بزمِ وصال تو بہ ہنگامِ تماشا   نظارہ ز جنبیدنِ مژگاں گلہ دارد

لیکن یہ شعر اصل میں کس کی ملکیت ہے اس کا صحیح علم کم لوگوں کو ہوگا۔ قاضی صاحب نے اس پر تفصیلی بحث کی اور بتایا کہ نتائج الافکار میں نور جہاں بیگم، مجمع الاشعار میں عشرتی، زر اللغات میں نسبتی کے نام منسوب ہے۔ علائی اسے مغربی اور غالب اسے قدسی کی غزل سمجھتے ہیں۔ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی اسے تیرتی کے زائیدہ ہائے فکر سے سمجھتے ہیں۔ قاضی صاحب نے ثابت کیا کہ یہ غزل نصرتی کی ہے اور انھوں نے غالب کے اس قول کی کہ یہ غزل مطربوں کی زبان پر بھی تصدیق کی اور بتلایا کہ اس کا ایک پرانا گراموفون ریکارڈ بھی موجود ہے (قاضی صاحب کے ماخذ صرف تذکرے اور بیاضیں نہیں ہز ماسٹر وائس کی گراموفون ریکارڈ بھی ہے)۔

ایک دن فن تنقید اور تنقید نگاروں کا ذکر تھا بولے صاحب "تنقید" بھی مصدر ہے جس سے عرب واقف نہیں۔ یہ بھی صحیح نہیں جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ شبلی نے پہلی مرتبہ یہ لفظ استعمال کیا اور وہی اس لفظ کے موجد ہیں۔ اردو میں عام استعمال ان کی بدولت ہوا ہو تو عجب نہیں۔ پھر انھوں نے اس لفظ کی قدیم مثالیں دینی شروع کیں انھوں نے بتایا کہ قدیم ترین مثال جو انھیں معلوم ہے ضیائے برنی کی تاریخ فیروز شاہی میں ملتی ہے، "در تنقید روایت و تعریفِ روایت" جو بھی کتاب ان کے زیر مطالعہ رہتی ہے ملنے والوں سے زیادہ

زگفتگو اس سے متعلق ہوتی ہے۔ میں ایک بار ان سے ملنے گیا۔ آثر لکھنوی صاحب کی "پہچان ہیں" زیر مطالعہ تھی۔ پوچھنے لگے لفظ "رنڈی" عورت کے معنی میں مستعمل ہے یا نہیں۔ میں نے کہا میر اثر کے یہاں یہ لفظ اسی معنی میں موجود ہے۔ بولے لکھنؤ کے شعرا اور مصنفین کے کلام سے سند چاہئے۔ میں نے کہا یاد آتا ہے فسانۂ عجائب میں بھی یہ لفظ مذکور ہے۔ کہنے لگے آثر صاحب لکھتے ہیں کہ لکھنؤ میں عورت کو رنڈی نہیں کہتے۔ زمانۂ حال کا مجھے علم نہیں لیکن زمانۂ سابق میں لکھنؤ کے متعدد شعرا اور مصنفین نے یہ لفظ اسی معنی میں استعمال کیا ہے، آج کل میں یہ اسناد جمع کر رہا ہوں۔ انھوں نے شاگردانِ وبیر میں سے کسی کی ایک غیر مطبوعہ مثنوی کا ایک مصرع سنایا:

محل رنڈیوں سے ہے سارا بھرا

میں نے کہا ممکن ہے اس سے مراد زنانِ بازاری ہوں۔ بولے نہیں میں نے سیاق کلام دیکھ لیا ہے، اس میں واجد علی شاہ کے متعلق لکھا ہے:

نہ کیوں کر کریں رنڈیاں ان سے چاہ کہ ایسا تو مرد اور یہ مال و جاہ

"تہاقا" کے متعلق اثر صاحب نے لکھا تھا: "قسم لیجیے جو لکھنوی ہونے پر بھی میں نے سنا ہو" کہنے لگے فسانۂ عجائب کے علاوہ یہ لفظ برق کے دیوان میں موجود ہے:

کبک کی چال جو دیکھی تو تہاقا مارا

اسی طرح مصنف نے دعویٰ کیا تھا کہ موسم کو موسِم (بالفتح) کرنے والے اہلِ لکھنؤ ہیں، قاضی صاحب نے میر کا شعر سنایا:

قفس میں میر نہیں جوش داغ سینے پہ ہوس نکالی ہے ہم نے بھی گل کے موسم کی

(اس غزل کے قوافی برہم، شبنم، ماتم وغیرہ ہیں)

میں نے ایک بار ان سے پوچھا اس بات کی کیا سند ہے کہ یہ شعر غالب کا ہے:

مجلسِ وعظ تو تا دیر رہے گی غالب   یاس ہی مے خانہ ہے پی کر کے ابھی آتے ہیں

مسکرائے پھر بولے کہا جاتا ہے غالب کو خط لکھ کر پوچھا گیا تھا، انھوں نے جواب دیا:
"مجھ پر کیا شامت آئی تھی کہ پاس ہی مے خانہ ہوتے ہوئے مجلس وعظ میں جا کر بیٹھتا"
پھر بولے، یہ شعر دراصل یوں ہے:

مجلسِ وعظ تو تا دیر رہے گی قائم   یہ ہے مے خانہ ابھی پی کے چلے آتے ہیں

کچھ لوگ اسے قائم چاند پوری کا شعر سمجھتے ہیں لیکن قائم، لازماً بطور تخلص نہیں آیا اور نہ یہ شعر دیوان قائم (نسخۂ لندن) میں موجود ہے۔

بے پناہ حافظہ اور ادبیات کے مطالعہ کے علاوہ جو وصف ان کو ان کے معاصرین سے ممتاز کرتا ہے، وہ بارہویں اور تیرہویں صدی ہجری کے ہندوستان پر ان کی تاریخی نظر اور بصیرت ہے۔ اس عہد کے مصنفین نظم و نثر میں جن اشخاص کا ذکر آتا ہے ان کی شخصیت متعین کرنے میں انھیں اپنے تاریخی مطالعہ سے بڑی مدد ملتی ہے۔ دیوان انند رام مخلص والے مضمون میں جو نوٹ انھوں نے نور بائی پر لکھا ہے اسے دیکھئے دستور الفصاحت (مرتبہ عرشی) میں ایک عبارت آئی تھی "بالآخر محمد عاشق تصور واسطہ گردید" بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ تصور، محمد عاشق کا تخلص ہے، انھوں نے تبصرے میں لکھا کہ "تذکرے محمد عاشق تصور کے ذکر سے خالی ہیں، میرا خیال ہے کہ یہ محمد عاشق مصور ہیں جن کا ذکر انشاء کے اس شعر میں آیا ہے:

واہ اے میاں محمد عاشق شبیہ کش   کھینچی ہے تم نے کیوں کر دلدار کی شبیہہ

سیاسی امور کے متعلق ان کی رائیں صائب ہوتی ہیں اور ان مسائل پر ان کی نظر گہری ہے۔ گو وہ اب ملکی سیاست میں حصہ نہیں لیتے لیکن یورپ جانے سے پہلے برسوں وہ اس دشت کی سیاحی کر چکے ہیں۔ یہ زمانہ غالباً ۱۹۱۸ء، ۱۹۱۹ء کا تھا، وہ تحریک

خلافت میں شریک ہوئے اور اسی راستے سے وہ کانگریس میں آئے، انھیں اسی زمانے میں تحریک خلافت اور کانگریس کے تقریباً سربرآوردہ اصحاب کو قریب سے دیکھنے اور ان میں سے بعض کے ساتھ کام کرنے کا اتفاق ہوا۔ وہ مولانا محمد علی مرحوم کی دردمندی اور خلوص سے ایک حد تک متاثر نظر آتے ہیں یورپ سے واپسی کے بعد انھیں سیاسی کاموں کی طرف غالباً توجہ کا موقع نہ ملا۔ تقسیم ہند سے کچھ پہلے وہ انجمن ترقی اردو اور شاخ بہار کے سکریٹری تھے اور اس عہدے پر وہ کئی سال تک رہے اور اردو کے مسئلہ پر وہ مولوی عبدالحق صاحب کے ساتھ لوگوں سے برسرِ پیکار رہتے رہے۔ مولانا ابوالکلام ہوں یا ڈاکٹر سید محمود انھوں نے حق بات علانیہ کہی اور برملا کہی۔ وہ جناح صاحب کو مخلص اور ایک لائق قانون داں سمجھتے ہیں لیکن ایسا نہیں کہ انھیں غلطیوں سے منزہ سمجھیں۔ ان پر اور لیگ کے دوسرے اراکین پر ان کے بڑے سخت اعتراضات ہیں ان کے خیال کے مطابق ان اصحاب نے قوم کی باقاعدہ تنظیم کی کوشش بہت کم کی۔ معاملہ صرف نعروں اور ممبر سازی ہی تک رہا۔ وہ گاندھی جی کے خیالات سے متفق نہیں ہیں لیکن انھیں ایک بڑا سیاستدان اور اپنی قوم کا کامیاب لیڈر مانتے ہیں۔ ایک بار سوشلزم کا ذکر ہو رہا تھا بولے ہندوستان میں کمیونزم کے تو کچھ معنی بھی ہیں، سوشلزم کی بات سمجھ میں نہیں آتی اور یہاں اس کی کامیابی بڑی حد تک مشتبہ ہے۔ اس گفتگو کے کچھ ہی دنوں بعد سوشلسٹوں میں انتشار ہوا اور پارٹی کے کرتا دھرتا جے پرکاش نرائن علیحدہ ہو گئے۔

اس سے یہ سمجھ نہ لیا جائے کہ وہ کمیونزم کے حامیوں میں ہیں۔ وہ کہتے ہیں اب دو ہی صورتیں معلوم ہوتی ہیں یا تو اشتمالیت کو بیخ و بن سے اکھیڑ پھینکئے اور اس کے خلاف کروسیڈ کیجئے یا پھر اس تحریک کو مکمل طور پر قبول کر لیجئے۔ درمیان کی کوئی راہ نہیں ہے۔

فنونِ لطیفہ میں وہ شعر کو اور فنون پر ترجیح دیتے ہیں۔ موسیقی اور مصوری سے ممکن ہے یورپ میں انھوں نے دلچسپی لی ہو یہاں میں نے ان سے کبھی ان فنون کا ذکر نہ سنا۔ وہ ریڈیو کبھی نہیں سنتے نہ خبروں سے انھیں دلچسپی لیتے دیکھا اور نہ پکے گانوں سے۔ میرا خیال ہے وہ تقریریں بھی شاید ہی سنتے ہوں۔ میں نے دو موقعوں پر انھیں متوجہ کیا اور اس بات کی خواہش ظاہر کی کہ وہ میرے لکھے ہوئے پروگرام سن کر اپنی رائے سے مطلع کریں، ریڈیو ان کے کمرے کے پاس ہی ان کے بیٹے قاضی مسعود کے کمرے میں بجتا رہا لیکن وہ متوجہ نہ ہو سکے۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ دونوں موضوع ایسے تھے جن سے ان کی دلچسپی مسلّم تھی، ایک تقریر خطوطِ اکبر پر تھی دوسرا غالب پر ایک فیچر تھا۔

فلمیں شاذ و نادر ہی دیکھتے ہیں، سال بھر میں ایک آدھ بار کوئی اچھی فلم دیکھ لی تو دیکھ لی ورنہ اس کا بھی علم نہیں پاتے۔ کہتے ہیں ہندوستانی فلمیں دیکھنے میں وقت اور پیسے دونوں ضائع ہوتے ہیں، کم سے کم اکثریت ایسی ہی فلموں کی ہے۔ بایں ہمہ کبھی کسی نے کسی فلم کی تعریف کی یا انھیں اپنے ساتھ لے گیا تو آمادہ ہو جاتے ہیں۔ ایک بار پٹنہ میں سہراب مودی کی "سکندرِ اعظم" کی دھوم تھی، دیکھنے گئے، واپس آئے تو بولے، وقت ضائع ہوا۔ لوگوں کو اس زمانے کے رسم و رواج معاشرت لباس وغیرہ کے متعلق جب تک اچھے اور صحیح معلومات نہ ہوں تاریخی فلم بنانے کا بیڑا نہیں اٹھانا چاہیے۔

جب سہراب مودی کی فلم "غالب" بنی تو انھوں نے اس خیال سے کہ فلم غالب سے متعلق ہے مجھے اس کی اطلاع دی اور جب فلم دیکھ چکے تو اپنے تاثرات مجھے اوکسفورڈ لکھ کر بھیجے۔ میں جب یورپ سے واپس آیا تو مجھے کھانے پر بلایا اور "غالب" فلم کے ریکارڈ بھی سنوائے اور دیر تک اس موضوع پر گفتگو کرتے رہے۔ انھوں نے اس ایجی ٹیشن کا بھی ذکر کیا جو اس فلم کے خلاف دہلی وغیرہ میں ہوا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ ڈراما نگار نے بلا ضرورت

حقیقت سے انحراف کیا ہے۔ غالب کی زندگی پر بہت اچھا ڈراما لکھا جا سکتا تھا جو حقیقت پر مبنی ہوتا اور جس میں شاعر کے صحیح حالات پیش کئے جاتے۔

ان کی تنقیدی صلاحیتیں یہاں بھی کارفرما تھیں، انھیں کہانی کے ساتھ اداکاری اور ڈائرکشن پر بھی اعتراض تھا۔ وہ نہ ثریا کی اداکاری سے خوش تھے اور نہ اس کے انتخاب پر۔ ان کے خیال میں نرگس اور مدھوبالا اس رول کے لئے زیادہ موزوں ثابت ہوتیں۔ فلم کے موضوع پر اس سے پہلے اس قدر تفصیلی بات کبھی نہیں ہوئی تھی فطری طور پر میرے دل میں ان معلومات کے ماخذ جاننے کی خواہش ہوئی معلوم ہوا کہ اس سلسلے میں انھوں نے فلمی رسالوں اور معیاری انگریزی اخباروں کے فلمی نامہ نگاروں کی تنقیدات کا باضابطہ مطالعہ کیا ہے اور غالب فلم پر جو اہم رائیں اور تبصرے شائع ہوئے ہیں ان کے تراشے انھوں نے رکھ چھوڑے ہیں۔ 'جہانِ غالب' میں جو ایک طرح کی غالب انسائیکلوپیڈیا ہے جس میں غالب سے متعلق ہر قسم کی معلومات جمع ہوں گی اب انھوں نے سہراب مودی، بھارت بھوشن اور ثریا کے ناموں کے بھی اضافے کئے ہیں۔ ان سبھوں کا ذکر ایک آدھ ہی سطر میں ہوگا لیکن ہوگا ضرور۔ اس لئے کہ ایک نے غالب کی زندگی پر فلم بنائی ہے تو دوسرے نے غالب کا رول ادا کیا ہے اور ثریا غالب کی محبوبہ کی حیثیت سے فلم میں جلوہ گر ہوئی ہے۔

ادبی ذوق کے باوجود وہ مشاعروں میں جانا پسند نہیں کرتے اور نہ وہ شاعروں کی اتنی عزت افزائی کرتے ہیں کہ انھیں شعر سننے پر مجبور ہونا پڑے۔ ہاں وہ خود ادبی جلسہ منعقد کر رہے ہوں یا ان کے خاص احباب کسی مشاعرے میں شریک ہو رہے ہوں تو دوسری بات ہے۔ میں نے انھیں صرف دو بار مشاعروں میں شرکت کرتے دیکھا ہے۔ ایک بار ان

کے دوست ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ کے مشاعرے کی صدارت کر رہے تھے، یہ کوئی ۱۹۴۵ء کی بات ہے وہ مشاعرے میں آئے، خاموش بیٹھے رہے اور سگریٹ پیتے رہے۔ دوسری مرتبہ صوبائی انجمن ترقی اردو کی طرف سے انھوں نے اردو کانفرنس منعقد کی تھی، آخری دن مشاعرے کا بھی پروگرام تھا۔ مولانا ظفر علی خاں صدارت کے لئے لاہور سے آئے تھے۔ وہ گئے، خطبۂ صدارت اور کچھ شعراء کو سن کر چلے آئے۔

ایک موقع پر عندلیب شادانی صاحب پٹنہ کالج کے ایک مشاعرے میں شریک ہونے کے لئے آئے اور حسبِ معمول قاضی صاحب کے یہاں ٹھہرے۔ میں نے ان سے پوچھا آپ نے شادانی صاحب کو کبھی سنا بھی؟ بولے اس کا موقع نہیں ملا نہ انھوں نے سنانے کی فرمائش کی نہ میں نے ان سے کچھ کہا۔ یہ اس کے باوجود ہے کہ وہ ان کی شاعری کے مدّاح ہیں انھوں نے کئی نظمیں اپنے رسالے معاصر میں شائع کی ہیں۔ اسی طرح ایک بار ڈاکٹر سچیدانند سنہا کے یہاں ساغر نظامی آئے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے کچھ احباب کو چائے پر مدعو کیا اور ساغر صاحب سے شعر پڑھنے کی فرمائش کی۔ قاضی صاحب موجود تھے، دو گھنٹے تک ساغر صاحب شعر سناتے رہے، لوگ داد سے چھت اڑاتے رہے اور قاضی صاحب سگریٹ کا دھواں۔

یہ قصہ مشاعرے کا ہے ان کے گھر کی بات کچھ اور ہے اگر کوئی معقول شاعر ان سے ملنے جائے اور شعر سننے کا موقع ہو تو اخلاقاً اس سے شعر سنانے کی فرمائش ضرور کرتے ہیں۔

ایک بار میں پرویز شاہدی صاحب کو لے کر ان کے یہاں گیا ان سے قاضی صاحب کے دیرینہ تعلقات ہیں لیکن ایک عرصے کے بعد ان سے ملنا ہو رہا تھا۔ قاضی صاحب بڑے اخلاق سے پیش آئے۔ باغیچے سے اٹھے ڈرائنگ روم میں لے گئے اور علمی اور ادبی باتیں کرنی شروع کیں زیادہ تر صنفِ غزل کے متعلق کلیم الدین احمد صاحب کی کتاب اردو شاعری والی شائع ہو چکی تھی (یہ اکتوبر ۱۹۶۱ء کی بات ہے) اس پر دیر تک بات چیت ہوتی رہی۔

قاضی صاحب ممکن ہے غزل کو نیم وحشی صنف شاعری نہ سمجھتے ہوں لیکن وہ اس کے مداح یوں بھی نہیں معلوم ہوتے۔ 'معیار' میں انھوں نے اعلان کر دیا تھا کہ شعرائے حال کی غزلیں شائع کرنا ہماری روشش کے خلاف ہے چنانچہ انھوں نے کبھی کوئی ایسی غزل شائع نہیں کی۔ ایک بار ہندوستان کے مشہور شاعر فراق گورکھپوری نے اپنی غزل پر نظم کا عنوان لکھ کر اشاعت کے لئے بھیج دیا۔ شرف عالم آرزو جلیلی مرحوم، جو معیار کے کاموں میں ان کے معاون تھے مجھ سے کہتے تھے کہ یہ غزل انھیں واپس کر دی گئی اور لکھ دیا گیا کہ براہ کرم غزل کو نظم بنا کر پیش کرنے کی کوشش نہ کیجئے۔

پرویز صاحب سے اس دن قاضی صاحب نے کئی غزلیں سنیں، ایک غزل کا مطلع یاد رہ گیا ہے :

سنا ہے کل تھا ان کے لب پہ ذکر مختصر میرا
تصور نے رہا ہے طول اسی کو کس قدر میرا

قاضی صاحب محظوظ نظر آئے اور جہاں تک یاد آتا ہے ان کے بعض اشعار کی تعریف بھی کی۔

انھوں نے مجھے مختلف ملاقاتوں میں متعدد ناولوں اور افسانوں کے زبانی پلاٹ سنائے ہیں لیکن انھیں کبھی ناول یا افسانہ لکھنے کا موقع مل سکے گا اس امر میں زیادہ پُر امید نہیں ہوں۔ ان اصناف میں ان کے معیار کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ انھوں نے اپنے رسالے میں کبھی کوئی طبع زاد افسانہ یا ڈراما شائع نہیں کیا۔ مغربی مصنفین کی چیزیں ترجمہ کرا کے شائع کیں اور وہ بھی سخت جانچ اور احتساب کے بعد۔
یہ بات شاید ہی کسی اور کو معلوم ہو کہ قاضی صاحب شاعری میں بھی بند نہیں۔ انھوں

نے موزوں طبیعت پائی ہے اب انھیں شعر کہنے کی شاید ہی فرصت ملتی ہو لیکن برسوں پہلے وہ کبھی کبھی فکرِ سخن کر لیا کرتے تھے۔ یہ چند شعر[1] ان سے یادگار ہیں:

چشمِ شب زندہ دار کو حسرت — دلِ امیدوار کو حرماں
تھی کسی واسطے یہاں لائی — زندگی، تجھ سے تھا یہی پیماں؛

کیوں نہ خود کاتبِ تقدیر ہو خنداں مجھ پر: شوق پروانہ ہے لیکن پرِ پرواز نہیں

میں روز و شب اگر وہ کراہوں تو کیا کروں — اک نوبہارِ ناز کو چاہوں تو کیا کروں

بلبل ہو کہ پروانہ گل و شمع کے آگے — یہ سوختنی ہے تو وہ گردن زدنی ہے

مجھے رونے سے منع کرتے ہیں — یہ بھی اک امرِ اختیاری ہے!

سُنے جو اسے نیند اس کو نہ آئے — مرا حال ہے یہ کہانی نہیں ہے

کیا کہہ گیا ایک محرمِ راز — بلبل نہیں گل ہے نغمہ پرداز

تیرے لئے مجھ سے ہیں ہزاروں — میرا تو جہاں میں ایک تو ہے

---

[1] ان میں سے بعض اشعار ترجمہ ہیں۔ ک۔ ا۔

قاضی صاحب کی کچھ مخصوص کمزوریاں بھی ہیں۔ بے پناہ حافظے کے باوجود انھیں مکمل شعر بہ مشکل ہی یاد رہتے ہیں اور مکمل غزل تو شاید ہی کوئی انھیں یاد ہو (یہ دوسری بات ہے کہ اردو فارسی کا کوئی شعر اگرچہ وہ کتنا ہی غیر مشہور کیوں نہ ہو آپ کو مکمل یاد نہ ہو آپ صرف چند لفظ ان کے سامنے پڑھ دیں وہ نہ صرف شعر سمجھ جائیں گے بلکہ یہ بتا دیں گے کہ یہ شعر کس کا ہے مطبوعہ دیوان میں موجود ہے یا کسی خاص قلمی نسخے میں، کن کن بیاضوں اور تذکروں میں اس کا اندراج ہے، وہ یہ بھی بتا دیں گے کہ یہ شعر صحیح یا غلط طور پر کن کن شعرا کی طرف منسوب ہے) یہی حال خطوں کے پتوں کا ہے، کثرت سے خط و کتابت کے باوجود اگر آپ کا پتا مختصر نہیں ہے تو کبھی یاد نہ رکھیں گے اور ہمیشہ آپ کو تاکید کریں گے کہ اپنا پتا ضرور خط کی پیشانی پر لکھا کیجیے۔ (انھیں دوسروں کی سہولت کا بھی اس معاملہ میں بہت خیال رہتا ہے وہ اس امر کا التزام کرتے ہیں کہ اپنے خط پر تاریخ تحریر اور پتا ضرور درج کریں) میری ان کی ایک مدت سے خط و کتابت ہے لیکن ان کی تاکید رہتی ہے کہ میں اپنا پتا ضرور لکھا کروں ایک بار میں ایسا کرنا بھول گیا، انھوں نے ظفر منزل، شاہ گنج پٹنہ ۶ کو شاہ منزل، ظفر گنج بنا دیا۔ پتا غلط تھا، لیکن خط مل گیا۔

یہی حال مکانوں کا ہے، انھیں کسی مکان کی چوحدی اور محل وقوع یاد رکھنے میں دقت ہوتی ہے، کوئی رفیق ساتھ نہ ہو تو ممکن ہے وہ مطلوبہ مکان پر بڑے توقف کے بعد پہنچیں یا پہنچیں ہی نہیں۔ ایک مرتبہ انھیں پروفیسر قمر الدین صاحب پرنسپل سائنس کالج کے یہاں جانا تھا جہاں ان کے ایک دوست ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی صاحب ٹھہرے ہوئے تھے۔ موصوف کی کوٹھی پٹنہ کالج کے سامنے سرِ راہ واقع ہے اور یقین ہے انھوں نے سیوں بار دیکھی ہوگی۔ صحن خانہ میں پہنچ کر انھیں خیال ہوا کہ وہ کسی اور کی کوٹھی میں آ گئے ہیں۔ واپس آئے اور صدر دروازے پر نام کی تختی غور سے پڑھی، کوٹھی پروفیسر موصوف ہی کی تھی۔

کاغذات اور کتابیں بڑی منتشر حالت میں رکھتے ہیں اور اکثر بھول جاتے ہیں کہ کون سی چیز کہاں ہے۔ انھیں یہ بات تو یاد رہتی ہے کہ مصحفی کے فلاں قصیدے کی نقل جو عرشی صاحب نے رام پور کے کتب خانے سے یا عندلیب شادانی صاحب نے جامعۂ ڈھاکا کے کتب خانے سے بھیجی ہے اس کے مطالب کیا ہیں، کب لکھا گیا، مصحفی کے کس دیوان میں ہے انشاء سے اس وقت شاعر کے تعلقات کس طرح کے تھے، سلیمان شکوہ نے کس حد تک مصحفی کا اور کہاں تک انشاء کا ساتھ دیا تھا۔ غرض یہ ساری باتیں یاد رہتی ہیں صرف یہ یاد نہیں رہتا کہ قصیدے کی نقل کہاں رکھی ہے۔ کاغذات ان کے پاس بہت جمع رہتے ہیں اور دن رات آتے ہی رہتے ہیں یہ فلاں تذکرے سے فلاں شاعر کے حالات مسعود حسن رضوی صاحب نے لکھنؤ سے بھیجے ہیں، یہ نقل ڈھاکے سے یہ لاہور سے آئی ہے، یہ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ سے ڈاکٹر زبیر صدیقی یا شاہ مقبول احمد صاحب نے بھجوائی ہے۔ غرض روز بروز نقول اور کاغذات میں اضافے ہوتے رہتے ہیں۔ خطوط کی بھرمار الگ ہوتی ہے، یہ خطوط نقلوں کے ساتھ چپک جاتے ہیں اور کبھی بارہویں صدی ہجری کے شعراء کے تراجم و اشعار کی نقلیں زمانۂ حال کے ادیبوں کے خطوں کے لفافے میں پہنچ کر مہینوں کے لئے گم ہو جاتی ہیں، لیکن ضائع نہیں ہوتیں اس لئے کہ جس طرح کوڑا کرکٹ کمپنی کے ڈبوں میں ڈال دیئے جاتے ہیں اسی طرح ہفتہ دو ہفتہ کے بعد یہ کاغذات اور خطوط تکیہ کے نیچے سے نکال کر ٹرنکوں اور بوریوں میں ڈال کر بند کر دیئے جاتے ہیں اس دن کے انتظار میں جب بوقت فرصت یہ چیزیں نکال کر علیحدہ کی جائینگی لیکن یہ وقت بڑی مشکل سے آتا ہے اور اسی وقت آتا ہے جب کوئی نہایت اہم کاغذ گم ہو جاتا ہے، ایسے وقت سارے کام بند کر دیئے جاتے ہیں اور صندوقوں کے پٹ اور بوریوں کے منہ کھول دیئے جاتے ہیں۔

لیکن ابھی وہ چند ہی کاغذات دیکھ پاتے ہیں کہ ان میں ایک ایسا کاغذ مل جاتا ہے جس کی

تلاش میں وہ عرصے سے تھے۔ وہ نیا کام ملتوی ہو جاتا ہے بکس پھر مقفل ہو جاتے ہیں اور پرانے کاغذ کی گم شدگی کی وجہ سے جو مضمون نامکمل پڑا تھا وہ یک بیک ہاتھ میں لے لیا جاتا ہے اور اس کی تکمیل شروع ہو جاتی ہے۔

کتابوں کا حال اس سے کچھ زیادہ مختلف نہیں، اکثر کتابیں اور رسالے بھی گم ہوتے رہتے ہیں۔ خطوط اور کاغذات کی طرح ان کے پاس مطبوعہ اور قلمی کتابوں کا اچھا خاصا ذخیرہ موجود ہے اس میں ہمیشہ اضافہ ہی ہوتا رہتا ہے۔ نئی مطبوعات کے ساتھ قدیم نادر مطبوعات اور مخطوطات بھی خریدتے رہتے ہیں۔ مختلف کتب خانوں سے قلمی کتابیں مستعار آتی رہتی ہیں یا ان کی نقلیں پہنچتی رہتی ہیں۔ ان کتابوں کے لئے اب موزوں جگہ باقی نہیں بچی اور ان کے رکھنے میں کوئی ترتیب نہیں۔ قلمی کتابیں مطبوعات کے ساتھ رکھی ہوئی ملیں گی اور ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے مستعار مخطوطات، نول کشوری مطبوعات کے ساتھ خلط ملط ملیں گے۔ کتابیں، احباب اور تلامذہ الگ لے جاتے ہیں، ان سے مانگ کر، وہ قیمتی کتابیں دینے میں بھی تامل نہیں کرتے اکثر و بیشتر وہ کسی موضوع کے لئے خود ہی کوئی کتاب تجویز کرتے ہیں اور خود ہی مہیا کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں کتب خانے آپ کہاں جائیں گے معلوم نہیں وقت پر آپ کو ملے یا نہیں۔ میرا ذاتی نسخہ لے لیجئے گا، ایسی کتابیں اکثر واپس آجاتی ہیں لیکن کچھ کو اپنے نئے مالکوں سے ایسی دلچسپی ہو جاتی ہے کہ واپس نہیں آتیں۔ قاضی صاحب یہ سمجھتے رہتے ہیں کہ کتاب کوئی معقول شخص لے گیا ہوگا تو واپس آہی گئی ہوگی۔ اب اگر سامنے کی الماری یا شلف پر موجود نہیں تو ممالہ صندوق میں کہیں بند ہوگی۔

کتابوں کی جلد بندی پر کبھی توجہ نہیں دیتے، میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ کوئی کتاب جلد ساز کے یہاں سے مجلد ہو کر نئی نئی آئی ہو نہ کبھی اس معاملے میں دلچسپی لیتے ہوئے

انھیں پایا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کتابیں کثرت استعمال سے بوسیدہ ہونے لگتی ہیں پہلے پرانی دفتیں الگ ہوتی ہیں پھر کتاب سے سرورق اترتے ہیں اس کے بعد اصلی کتاب کے صفحے جدا ہوئے شروع ہو جاتے ہیں۔ یہی حال خاتمۂ کتاب کا ہوتا ہے۔

آئے دن کتابیں گم ہوتی رہتی ہیں اور گم شدہ کتابیں ملتی رہتی ہیں۔ کاغذات اور کتابوں کی اس گم شدگی کے لئے وہ ایک اصطلاح Misplace ہمیشہ استعمال کرتے ہیں۔ کبھی کسی کتاب کا تذکرہ آیا کہنے لگے میرے پاس موجود نہیں ہیں Misplace ہو گئی ہے۔ وہ اکثر فخریہ کہتے ہیں کہ میرے یہاں سے کاغذات یا کتابیں گم نہیں ہوتیں صرف کبھی کبھی Misplace ہو جاتی ہیں اور یہ سچ ہے، یہ دوسری بات ہے کہ وہ کتاب ممکن ہے برسوں کے بعد ملے لیکن ملے گی ضرور۔ ایک زمانے میں اورینٹل کانفرنس پٹنہ میں جو انھوں نے معرکۃ الآرا مقالہ مصحفی پر پڑھا تھا وہ Misplace تھا پھر معلوم ہوا دیوان مصحفی کا ایک قلمی نسخہ Misplace ہو گیا ہے لوگوں کے خطوط اردو کے تذکرے اور غالب کی تصنیفات آئے دن Misplace ہوتی رہتی ہیں۔ آج کل میرے مجموعۂ مضامین کے مسودات کہیں Misplace ہو گئے ہیں۔

انھیں گھڑی سے کوئی دلچسپی نہیں، نہ وہ اپنے پاس رکھتے ہیں اور نہ گفتگو کے دوران میں وہ کمرے کے کلاک پر نگاہ رکھتے ہیں لہٰذا انھیں وقت کا اندازہ کبھی نہیں ہوتا، گفتگو جب شروع ہوتی ہے تو ایسی محویت کا عالم طاری ہو جاتا ہے کہ گھنٹہ پر گھنٹہ گزرتا جاتا ہے اور انھیں اندازہ نہیں ہوتا کہ کتنا وقت گزر گیا۔ قاضی صاحب بڑے جلیل القدر محقق ہیں اور اپنی زبان کے مایۂ ناز نقاد، لیکن گفتگو میں وہ خشکی نہیں جو اس قسم کے اہل علم میں عام طور پر ہوتی ہے۔ وہ خوش گفتار ہیں اور اپنے علم اور حافظے کی مدد سے مخاطب پر چھا جاتے ہیں۔ پھر بعض اصحاب کے برخلاف لوگوں کو اپنے پسندیدہ موضوع پر نہیں لے آتے بلکہ

انہی کی دلچسپی کے موضوعات پر گفتگو شروع کر دیتے ہیں۔ ایک بار ایک صاحب برسوں کے بعد ان سے ملنے آئے، باتیں شروع ہوئیں دن کا کھانا آیا دونوں نے کھا لیا پھر باتیں ہونے لگیں چار بج گئے، شام کی چائے آئی پھر باتوں میں مصروف ہو گئے، آٹھ بجے شب کا کھانا آیا، کھانا کھا لیا باتیں اب بھی ختم نہ ہوئیں، آخر جب وہ بہ مشکل رخصت ہوئے اور قاضی صاحب تھکے ہارے اوپر اپنی خواب گاہ میں پہنچے تو دیکھا پورا گھر سویا ہوا ہے اور بارہ بج رہے ہیں۔

انھیں اپنی کتاب یا مضمون کی تصحیح کا بڑا خیال رہتا ہے اس میں وہ جس قدر اہتمام کرتے ہیں کھڑاگ کھڑا کرتے ہیں وہ عام تو عام خاص لوگوں کے بھی بس کا نہیں۔ معیار، ان کا اپنا رسالہ تھا جو انھوں نے سنہ [illegible] میں پٹنہ سے شائع کرنا شروع کیا تھا اس کی کتابت و طباعت کی نگرانی خود وہ کیا کرتے تھے اور تعجب نہیں کاپیاں اور پروف دو چھپنے سے پہلے متعدد بار پڑھ لیتے ہوں۔ لیکن جب پہلا شمارہ نکلا تو فہرست مضامین کے بعد 'معروضات' اور 'تعارف' سے پہلے نہایت نمایاں طور پر غلط نامہ درج تھا جو پورے ایک صفحہ کا ہے، دوسرے شمارے میں پھر نمایاں مقام پر پہلے شمارے کی تصحیح چھاپی گئی۔ اس شمارے کے بعض الفاظ کی تصحیح تیسرے ماہ کے پرچے میں بھی موجود ہے۔ معیار کے دوسرے شماروں کی تصحیحات بھی اسی طرح برابر چھپتی رہیں۔ اب بھی جب وہ معیار کی فائل کسی قدر داں کو دیتے ہیں تو اپنے قلم سے مزید تصحیح و اضافہ کے بعد ہی دیتے ہیں۔ غالب نمبر میں میں نے غالب کے ایک فرضی استاد عبدالصمد پر ان کا مضمون شائع کیا، مضمون لکھنے کے بعد سے چھپنے تک اس میں وہ تبدیلیاں و اضافے کرتے رہے اور جب میں نے اسے احوال غالب میں دوبارہ شائع کرنا چاہا تو انھوں نے اس طرح شائع کرانے سے انکار کر دیا۔ پورا مضمون دوبارہ لکھا یہاں تک کہ انھوں نے عنوان بھی بدل ڈالا

غالب نمبر ہی میں ان کا مضمون "غالب بحیثیت محقق" شائع ہوا۔ ان کے افکار نے تو ان کے ذہن میں پتا نہیں کتنی شکلیں بدلی ہونگی جب مضمون نے یہ قالب اختیار کیا ہوگا مضمون مکمل ہو چکا تو انھوں نے اغلاط کی تصحیح کی، جا بجا قطع و برید کئے، کہیں کہیں مکرر اصلاح کی، بعض باتیں بدلیں بعض نئی لکھیں۔ اب مسودے میں کانٹ چھانٹ کی مزید گنجائش نہ رہی تو انھوں نے سادہ کاغذ کی چیپیاں مضمون پر چسپاں کیں۔ کہیں کہیں سطر اور پیراگراف کا پیراگراف انھوں نے نئی چیپیوں پر لکھا۔ مضمون جب مجھے ملا اور میں نے کتابت کے لئے کاتب کے حوالے کیا تو ان کا والا نامہ آیا جس میں انھوں نے بعض امور کی تصحیح کی تھی۔ مسودہ درست کر دیا گیا، پھر دوسرا خط آیا اس میں یہ خواہش ظاہر کی کہ مسودے میں اس طرح ترمیم کی کر دی جائے، یہ بھی کر دیا گیا ان کی فرمائش تھی کہ کاپی کی تصحیح وہ خود کریں گے۔ علی گڑھ میگزین والوں کے لئے یہ بات بالکل نئی تھی لیکن میں نے اپنی ذمہ داری پر یہ وعدہ کر لیا اور انھیں کتابت شدہ اجزا بھیج دیئے گئے۔ انھوں نے اغلاط کی تصحیح کی کچھ مزید مکرر اصلاح کی اور اضافے کئے۔ کاپی نویس ان غلطیوں کو کاٹ پیٹ کر درست کرنے میں مصروف ہو گیا۔ اس عرصہ میں ان کے کئی خطوط آئے اور اس طرح مضمون میں کچھ نہ کچھ مزید اضافے اور ترمیمات ہوتی رہیں۔ پروف اتروا کر انھیں بھیجوائے گئے اور اس میں بھی مکرر اصلاح ہوئی، تصحیح کے اس اہتمام اور اس دیدہ ریزی کے باوجود جب غالب نمبر شائع ہوا تو وہ تصحیح کی طرف سے مطمئن نظر نہ آئے اور انھوں نے مجھے بتایا کہ مضمون میں بعض فاحش اغلاط رہ گئے ہیں۔ کچھ دنوں کے بعد ہی انھوں نے اپنے دعووں کے ثبوت میں مزید اسناد اور حوالے جمع کرنے شروع کئے۔ قدیم اور جدید فارسی کی سینکڑوں کتابیں پڑھیں ایک ایک لفظ کے لئے شاعروں کے مکمل دیوان دیکھ ڈالے۔ شاہنامہ کو کئی بار پڑھا اور انھوں نے اتنا وافر مواد جمع کر لیا کہ جب میں نے نقد غالب

میں اس مضمون کو شامل کرنا چاہا تو انھوں نے مضمون اسی طرح چھپوانے سے انکار کر دیا اور دوسرا مضمون از سرِ نو لکھنے کا وعدہ کیا، چنانچہ کئی ماہ کی محنت شاقہ کے بعد انھوں نے یہ ڈھائی سو صفحوں کا مضمون تمام کیا۔ اس کی تمہید میں انھوں نے لکھا :۔

"غالب بہ حیثیت محقق" کے عنوان سے میرا ایک مقالہ علی گڑھ میگزین کے غالب نمبر میں اشاعت پذیر ہوا تھا جو بہت عجلت میں لکھا گیا تھا اور اس میں اغلاط طباعت بھی بکثرت تھے۔ میری استدعا ہے کہ یہ کالعدم سمجھا جائے اور مجھے اس کے متعلق ہر قسم کی ذمہ داری سے بری قرار دیا جائے۔"

اس مضمون کی کاپی جو دہلی میں لکھی جاتی رہی میں برابر انھیں علی گڑھ سے پٹنہ بھیجواتا رہا۔ مضمون کی تصحیح وہ مصروفیت کی وجہ سے کرنی نہیں چاہتے تھے لیکن یہ کسی دوسرے کے بس کی بات نہ تھی، میں یورپ جانے کی تیاریوں میں لگا تھا اور اس زمانہ میں بہت مصروف تھا۔ بہر کیف میرے اصرار پر وہ مان گئے اور کاپی کی تصحیح خود انھی نے کی۔ یہ یاد نہیں آتا کہ تصحیح شدہ کاپی ان کے پاس بھیجی گئی تھی یا نہیں کہ وہ دیکھ لیں کہ اغلاط بن گئیں یا نہیں۔ بہتر یہ جب کاپیاں جمیں تو ان کے پروف ان کی خدمت میں بھیج دیئے گئے اور میں انتظامات سے مطمئن ہو کر یورپ چلا گیا وہاں سے جب واپس آیا اور چھپی ہوئی کتاب پر نظر پڑی تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ مضمون کے اختتام کے بعد پانچ صفحوں کا "تصحیح و اضافہ" ہے پھر اس کے بعد "تتمہ تصحیح و اضافہ" ہے، یہیں پر بس نہیں اب مزید پانچ صفحوں کا "غلط نامہ" ہے اس کے اختتام پر پھر "تتمہ غلط نامہ" درج ہے۔ وہ اب بھی مطمئن نہیں اور جب وہ اپنے کسی ذی علم دوست کو اپنے اس مضمون کا آف پرنٹ دیتے ہیں تو اپنے قلم سے مزید تصحیح کرنے کے بعد ہی دیتے ہیں۔

کسی بات کے لکھنے اور ناظرین تک اسے صحیح طور پر پہنچانے کا یہ سارا ولولہ یہ ساری

جدوجہد اور یہ ساری علمی دیانت انھوں نے براؤن اور دوسرے علمائے یورپ سے سیکھی ہے۔ مشرق میں ایک شخصیت سے وہ بیحد متاثر ہیں، اور میں نے اکثر ان کا ذکر بڑے احترام سے کرتے سنا ہے، یہ شخصیت محمد بن عبدالوہاب قزوینی کی ہے لیکن قزوینی کی خوش نصیبی یہ ہے کہ ان کی تصانیف کے لئے انھیں یورپ اور ایران کے بہترین پریس ملے۔ اگر یورپ کے مستشرقین کو اپنی کتابیں ہندوستان کے سڑے بسے پریس میں چھپوانی پڑ جائیں تو یقین مانئے انھیں اپنی کتاب ہی کی ضخامت کا ایک غلط نامہ بھی شائع کرانا پڑے۔

قاضی عبدالودود

محقق اعظم، فنا فی التحقیق قاضی عبدالودود پٹنہ والے یوں تو کیمبرج میں ادبیات کی تعلیم پائی بیرسٹر بھی بنے۔ مگر وکالت اور وہ بھی ہندوستانی حق فرسا ماحول میں ان کے بس کا روگ نہ تھی۔ ہمارے یہاں اس صنفِ فن میں کامرانی کو بہت حد تک دور از حقائق اُپج اور اختراع سے تعلق ہوتا ہے اور ہمارے قاضی صاحب اس سلسلے میں محض نا اہل۔ براہِ ادبیات وہ یورپی محققین کی معاملہ فہمی اور غیر جانبداری سے متاثر تھے۔ قاضی صاحب کی فطری حق بینی و حق گوئی نے تقاضا کیا کہ اسی پائے کی تحقیق و تشخیص کو اپنے ملک میں بھی رواج دیا جائے۔ اردو کو اپنا میدانِ عمل قرار دیا اور اس حد تک کہ آخر اسی کو اپنا اوڑھنا اور بچھونا بنالیا۔ جس طرح وہ اوڑھنا اور بچھونا جو عروسِ نوبہار کے استعمال سے قدر و منزلت پالیتا ہے، اسی طرح قاضی صاحب کی بے لوث محبت اور انہماک نے اردو تحقیق کو نئے زاویے عطا کیے۔ "چند" کاتا اور لے دوڑی" قسم کے نیرنگ تو اردو کو پہلے بھی میسر تھے اور ان داستان گو حضرات میں اردو کے وہ محسن بھی شامل ہیں جو زیبِ داستاں کے لیے حقائق کو نظر انداز کرنے میں بخل نہیں فرماتے یا پھر یہ کہ تحقیق کی کوتاہی کو حسنِ اختراع سے نور اور رنگ بخشتے ہیں۔

میں نے اکثر ادبائے عظام کو قاضی صاحب کی خدمت میں سنجیدہ سر اور مہر بلب بھی بیٹھے دیکھا ہے۔ وہ بڑے سخت گیر بھی ہیں یا حرف گیر بھی کہ ہر لفظ کا جائزہ لیتے

ہیں۔ اہلِ تحقیق ان سے خائف کہ نجانے وہ کس حرف پر انگلی رکھ دیں۔ اور یہ حقیقت ہے کہ ظالم جس حرف، فقرے یا بیان پر انگلی رکھ دے وہ ضرور قابلِ اعتراض ثابت ہوتا ہے۔ ان کے اعتراض کا جواب نہیں، کم از کم منہ پر یا تحریر میں تو ہرگز ممکن نہیں۔ پس پشت لوگ جو چاہے کہہ لیں وہ اور بات ہے۔ قاضی صاحب کی بات کا جواب اس لئے ممکن نہیں ہوتا کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں غور و خوض اور امکانی تحقیق کا ماحصل ہوتا ہے اور اس میں تعصب یا ذاتی پسند کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ یہ جرأت ان کے مزاج کا غالب عنصر ہے کہ حقیقت تلخ بھی ہو تو بے تکلف کہہ گزرتے ہیں۔ اس میں دشمن اور دوست کی تمیز روا نہیں رکھتے کہ حقیقت صرف ایک ہوتی ہے وہ دوست سے متعلق ہو یا کسی اور سے۔

قاضی صاحب یوں تو اس خاندان کے چشم و چراغ ہیں جسے مذہب اور دینیات سے براہِ راست اور گہرا تعلق رہا ہے مگر انگریزی تعلیم اور آزادیِ فکر کی وجہ سے بغیر یقین وہ کسی رو میں خواہ مخواہ بہہ جانے کے قائل نہیں۔ وہ کسی چیز کو محض اس لئے رد یا قبول نہیں فرماتے کہ ان کے بزرگ ایسا کرتے تھے۔ انھیں اپنی نظر پر بھروسہ ہے وسعتِ نظر نے انھیں یہ توفیق بخش رکھی ہے کہ وہ قابلِ نظر چیز کی ماہیت، نوعیت اور حیثیت کو پہچان لیں۔ اسے اصلی رنگ میں دیکھیں اور پھر جیسا دیکھیں ظاہر کر دیں۔ یہ البتہ ہے کہ دل آزاری کا پہلو پیدا نہ ہو۔ اور بہت سی خوبیوں میں یہ خوبی کہ حق گوئی میں انھیں باک نہیں ایک ایسی روشن دلیل ہے جس نے مجھے مجبور کیا کہ ان کے قدموں سے وابستہ ہو جاؤں اور میں خوش ہوں کہ یہ وابستگی باعثِ تسکینِ قلب بھی ہے وجہِ فخر بھی۔ قدرت کو منظور تھا کہ یگانہ کا بدل مجھے ملتا۔ وہ مل گیا میرزا کی سی کج کلاہی، میرزا کی سی حق پسندی و حق گوئی، میرزا کی سی فن شناسی و نکتہ گیری، میرزا کی سی قول و فعل میں یکسانیت، میرزا کی سی خوش مذاقی اور ان ہی کا سا بے داغ چلن۔ ان سب باتوں نے مقناطیس بن کر مجھے اپنی

طرف کھینچا۔ "اے گل بتو خورسندم تو بوئے کسے داری"

مالک رام صاحب کے مجھ پر بہت سے احسان ہیں مگر سب سے بڑا یہ کہ قاضی صاحب سے متعارف کرایا۔ ۱۹۵۷ء کی سردیوں میں یہ حسین اتفاق ہوا کہ ان سے ملاقات ہوئی اور حسین تر اتفاق یہ کہ اسی شام میں انھیں ان کی قیام گاہ تک پہنچانے گیا۔ ان دنوں مالک رام صاحب کی رہائش قرول باغ میں تھی اور قاضی صاحب اپنے دوست جناب نورالدین احمد مرحوم بیرسٹر (اس یارِ باصفا کو مرحوم کہتے ہوئے کلیجہ منہ کو آتا ہے) کے یہاں علی پور روڈ پر اترے ہوئے تھے۔ سفر کا یہ نصف گھنٹہ بلا شرکتِ غیرے ان کی خدمت میں یوں گزرا کہ میں ان کے ہاتھوں بک گیا۔ دوسرے دن انھیں لاہور جانا تھا۔ میں نے پتا حاصل کر لیا اور چند دن بعد خط لکھا۔ غرض یہ تھی کہ اگر واپسی پر وہ دہلی رکیں تو مجھے بھی شرف ملاقات سے نوازیں۔ عرصہ تک جواب نہ آیا۔ میں نے سمجھ لیا کہ یا تو میرا خط تلف ہو گیا یا پھر قابلِ اعتنا نہ سمجھا گیا۔ یہ سمجھ لیا تو ان کا خط مل گیا۔ لکھا تھا کہ مصروفیت کے باعث جواب میں تاخیر ہوئی اور یہ کہ عنقریب دہلی آرہا ہوں۔ قیام وہیں ہوگا۔ پہنچنے پر تمھیں اطلاع دوں گا۔ خط ملے دو ہی دن ہوئے تھے کہ وہ دہلی تشریف لے آئے۔ فون پر آنے کی اطلاع دی۔ میں نے حاضری کی اجازت چاہی۔ فرمایا، تم اپنی دکان کا محلِ وقوع بتا دو میں خود پہنچ جاؤں گا۔ وہ اسی دن آئے اور پھر روز کا ملنا معمول ہو گیا۔

قاضی صاحب کو ٹیلیفون کرنے میں حجاب ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ کبھی بات پوری بھی نہیں ہوتی کہ چونگا رکھ دیتے ہیں۔ فرماتے ہیں، بات صاف سمجھ میں نہیں آتی۔ اور یہ بھی کہ اشد ضرورت کے بغیر اس کا استعمال نہ کرنا چاہیے کہ یہ آلہ حکایاتِ مہر و وفا کہنے کے لیے

ایجاد نہیں کیا گیا۔ یوں بھی اپنی فطرت سے وہ انتہائی اختصار پسند ہیں۔ ضرورت ہو تو ہر روز خط لکھیں گے مگر نہایت مختصر۔ میرے پاس ان کے سینکڑوں خط محفوظ ہیں۔ اکثر و بیشتر چند جملوں اور کچھ چند حروف کی حد تک محدود ہیں۔ مضامین کی بھی یہی صورت ہے۔ کوئی فقرہ حذف نہیں کیا جا سکتا، بڑھانا بھی آسان نہیں کہ مخمل میں ٹاٹ کا پیوند معلوم ہوگا۔ نجی محفلوں میں البتہ دریا گل افشانیِ گفتار بے کراں ہو جاتا ہے۔ ایک ایک نکتہ کو بہ وضاحت بیان فرمائیں گے۔ دلائل و براہین و اسناد سے، اگر ضرورت پڑے تو اپنے فرمودات کو ثابت کرتے چلے جائیں گے۔ بات ہمیشہ تلی اور پختہ کہیں گے، ایسے کہ اختلاف ممکن نہ ہو۔ طرزِ بیان ایسا کہ سننے والے لاجواب ہو جائیں۔ علمی تبحر اور ادب میں بلندیِ مقام کے باوجود ان کی خود اعتمادی میں نہ کوئی ضد کا عنصر ہے نہ خودسری کا شائبہ۔ ان کے اخذ کردہ نتائج کے کسی پہلو پر اگر کسی کو اعتراض ہو تو قاضی صاحب اختلاف پر خلوص سے غور فرماتے ہیں۔ سہو ظاہر ہو جائے تو اعتراف فرما لیتے ہیں مگر حتی الامکان تحقیق کے بعد معترض بھول جائے تو بھول جائے یہ نہ بھولیں گے۔

ایک مرتبہ اشعار میں حروفِ علت کے گرنے کا ذکر آیا تو میں نے کہا کہ فارسی شعرا کے یہاں یہ عیب نہیں پایا جاتا۔ بالخصوص "ی" کا سقوط تو ان کے یہاں ہے ہی نہیں۔ قاضی صاحب کو اختلاف تھا کہ آپ نے متعدد مثالیں اس قسم کے سقم کی فارسی شعرا کے یہاں دیکھی تھیں۔ مگر اس وقت یاد نہ تھیں۔ میں نے بات مان لی، معاملہ ختم ہو گیا کہ آخر میرا مبلغ علم ہے ہی کتنا۔ اور جو ہے وہ اکتسابی ہے نصابی نہیں یعنی اسی قدر جو بزرگوں کی خدمت میں باتوں ہی باتوں سے حاصل ہوا۔ میں اس سلسلے میں "اک نے کہی دوجے نے مانی" کا قائل ہوں۔ ماننے سے پہلے یہ البتہ دیکھ لیتا ہوں کہ کہنے والا کون ہے۔ کہیں مجھ سے بھی گیا گزرا تو نہیں۔ بقول اقبال ؎

گریز از خام کاران و غلام پختہ کارے شو
کہ از مغز دو صد خر فکر انسانے نمی آید

اس کلیے کے تحت قاضی صاحب کی بات نہ ماننے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ خیر کچھ دن اور ٹھہر کر وہ پٹنہ تشریف لے گئے اور وہاں سے انجمن ترقی اردو کے سہ ماہی رسالہ کا ایک پرانا شمارہ بھیجا۔ اس میں ان کا ایک تنقیدی مضمون مولانا حسرت موہانی مرحوم پر تھا۔ (یا ان کے کسی مضمون کے جواب میں تھا) اُس میں فارسی کے اساتذہ کے چند ایسے اشعار پیش کئے گئے تھے جن میں ان کے خیال کے مطابق "ی" گر رہی تھی۔ یہ سب مثالیں غلط تھیں کہ وصل کے الف کی موجودگی میں اعتراض بے محل تھا۔ میں نے قاضی صاحب کی توجہ اس طرف دلائی۔ آپ نے فرمایا اپنی تاویل کے حق میں عروض کی کسی مستند کتاب کا حوالہ دو۔ میں حوالہ کیا دیتا کہ "چراغِ سخن" کے سوا کوئی کتاب نہ دیکھی تھی اور اس کا دیکھنا بھی سرورق کی حد تک بس تھا۔ میں نے لکھ دیا کہ میں اس کے سوا کچھ نہیں جانتا کہ میں نے ایسا ہی سنا اور جہاں تک بن پڑا اس پر عمل بھی کیا۔ اُن کا جواب فطرتی طور پر یہ تھا کہ سنی سنائی بات سند نہیں ہوتی۔ میں خاموش ہو گیا کہ جو بزرگ میر کر فرماتے ہوئے" کو سند نہ مانیں ان سے کون الجھے۔ کئی ماہ بعد قاضی صاحب کا ایک خلاف معمول مفصل خط آیا۔ تحریر کیا تھا کہ میری بات صحیح تھی اگرچہ عروض کی کتابوں میں اس کا ذکر نہیں۔

انہی دنوں ایک مرتبہ قاضی صاحب نے فرمایا کہ حروف علت کے سقوط کا عیب اردو شعرا کے یہاں بکثرت پایا جاتا ہے۔ میں نے عرض کی کچھ لوگ اس سے بچتے بھی ہیں۔ خدا استاد ذوق اور میرزا یگانہ مرحوم۔ قاضی صاحب اس وقت میرے یہاں تشریف فرما تھے۔ پوچھا دیوانِ ذوق ہے؟ میں نے حاضر کر دیا۔ گھنٹہ بھر میں پوری کتاب دیکھ کر بولے

فرمایا "واقعی ذوق کا کلام اس خامی سے پاک ہے"۔ قاضی صاحب تیز پڑھنے میں بے مثال مہارت رکھتے ہیں۔ تین چار سو صفحوں کی کتاب کو دو تین گھنٹوں میں تمام وکمال دیکھ جاتے ہیں۔ اُن کی یادداشت بھی قابلِ رشک ہے۔ اگر انہیں خیال گزرے کہ سامعین میں سے کسی کو اُن کے بیان کی حقیقت پر شبہ ہے تو مخصوص نسخے کا حوالہ دے دیں گے اور اس صفحے یا صفحات کی نشاندہی جو بیان کے ماخذ ہوں۔ ایک مرتبہ میں نے "شعلہ زار" کے خود نوشتہ قلمی دیباچے کی نقل آپ کی خدمت میں پیش کی۔ یہ تحریر تیس صفحوں پر مشتمل تھی۔ قاضی صاحب نے پانچ سات منٹ میں ورق گردانی فرما کر کتاب ایک طرف رکھ دی۔ مجھے خیال ہوا کہ آپ نے از رہِ مروت بس دیکھ لیا، توجہ نہ فرمائی ہوگی۔ وہ بھی بڑے قیافہ شناس ہیں۔ میرا احساس بھانپ گئے۔ لمحہ بھر کے توقف کے بعد میرے مضمون کے حسن وقبح کا جائزہ لینے لگے اور جس قدر قابلِ ذکر باتیں اس میں درج تھیں ترتیب وار ان کو زیرِ بحث لائے۔ اس سے اپنی صاحب نظری کا ثبوت دینا تو مقصد ہرگز نہ ہوگا کہ اُن کی استعداد سے کون کافر انکار کر سکتا ہے یہ مقصد البتہ ہوگا کہ اگر یہ شک مجھے گزرا کہ مطالعہ غور سے نہ فرمایا ہوگا تو یہ رفع ہو جائے اور ان کی تیز خواندگی کی صلاحیت کا تجربہ۔

اپنی فطرت سے میں مجلسی آدمی نہیں۔ ارادتاً کسی محفل میں شریک نہیں ہوتا۔ ہاں اگر مجلس ہی میرے یہاں اُمڈ آئے یا جہاں میں پہنچوں وہاں پہلے سے محفل برپا ہو تو بات الگ ہے۔ میں نے علم وادب میں جس قدر فیض حاصل کیا وہ سب انفرادی صحبتوں میں کہ مجلس ہو تو خوش گپیاں خواہ مخواہ راہ پا جاتی ہیں اور سنجیدہ اور معلوماتی ادب پنپنے نہیں پاتا۔ قاضی صاحب سے بیشتر ملاقاتیں انفرادی ماحول میں ہوتی ہیں کہ وہ ہوتے ہیں اور میں۔ خوب خوب باتیں ہوتی ہیں اور میں بساط بھر اُن کے خزائن معلومات سے جھولیاں بھرتا ہوں۔

گفتار کا غازی میں بھی کم نہیں، یہ الگ بات ہے کہ میری باتیں محض یا وہ گوئی کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اکثر ایسا ہوا کہ میں نے داستان امیر حمزہ چھیڑی تو رُکنے کا نام نہ لیا اور قاضی صاحب قبلہ کو تنگ آ کر کہنا پڑا۔ "اپنی ہی کہے جاؤ گے یا میری بھی سنو گے"۔

قاضی صاحب میں ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ کسی کی تعریف اُس کے منہ پر نہ کریں گے اور مجھ میں یہ خامی کہ بُرائی منہ پر نہ کروں گا۔ یعنی وہ جس کو تعریف کا مستحق سمجھ لیں اُس کی غیر حاضری میں اس کی ستائش میں بخل نہیں فرماتے اور میں پس پشت برائی میں۔ میں تو کسی کی برائی اس کے سامنے اس لئے نہیں کرتا کہ جواب الجواب کاروائی کا خوف دامن گیر رہتا ہے مگر وہ نجانے کسی کو اُس کے منہ پر بھلا کہنے سے کیوں خائف ہیں۔ یہ نکتہ نفسیاتی ہے جسے صرف ہم نفس سمجھ سکتے ہیں۔

دو کرم فرما جنہیں میں نہ جانتا تھا حسنِ اتفاق سے ملے تو کہا کہ قاضی صاحب سے آپ کی تعریف سنی، مدت سے ملاقات کا اشتیاق تھا۔ مگر یہ نہ کہا کہ مل کر مسرت بھی ہوئی۔ بظاہر خوش نظر آئے۔ اس خوشی کی وجہ میرے قیاس کے مطابق یہ تھی کہ قاضی صاحب کی رائے کی مطابقت میں جب مجھ میں کوئی چیز قابل تعریف نہ پائی تو اُن کی مردم شناسی کی لغزش پر خوش ہوئے کہ آخر کہیں تو وہ بھی غلط ثابت ہوئے۔ کوئی رائے تو ان کی قابل گرفت ہوئی۔ اسی قسم کی لغزش میرزا یگانہ مرحوم سے بھی متعلق ہے۔ آپ نے "آیات وجدانی" کے آخری ایڈیشن میں میرا ذکر کچھ ایسی والہانہ محبت سے کیا کہ مجھے اُن کی مردم شناسی کی صلاحیت پر تعجب سا ہوا اور اپنے کامیاب فریب پر البتہ فخر کہ ایسے صاحب نظر کو بھی غلط فہمی میں مبتلا کر دیا۔ میں نے میرزا کو اپنے تاثر سے آگاہ کیا تو وہ صرف مسکرا دیئے۔ مگر یہ تبسم زیر لب بڑا پر معنی تھا، گویا فرما رہے ہوں "اگر تم ہندو لوگ پتھر کے بت کو خدا بنا سکتے ہو تو میں ایک انسان کو اپنا واحد اور عزیز دوست کیوں نہیں سمجھ سکتا۔

قاضی صاحب کے پٹنہ کے نواح میں باغات بھی تھے۔ وہ خود تو شاید فن باغبانی میں ماہر نہیں مگر ان کے یہاں کے آم نہایت میٹھے اور لذیذ ہوتے تھے جب تک باغ ان کی ملکیت میں رہے ایک پیٹی آموں کی ہر برس عنایت فرماتے رہے۔ وضعداری کا یہ عالم کہ اگر کسی برس فصل اچھی نہ ہوتی تو بازار سے خرید کر بھجواتے میں کہ نواسان آموں کا بے صبری سے انتظار کرتے رہتے کرتا تو میں بھی تھا مگر اعتراف سے ہلکا پن ظاہر ہوتا ہے۔ موسم شروع ہوتے ہی ان کے منہ میں پانی بھر نے لگتا۔ خاتمہ زمینداری پروگرام کے صدقے قاضی صاحب کی خاندانی زمینداری جاتی رہی ورنہ مجھے یقین ہے کہ ہر فصل پر غلہ بھی آتا۔ جائداد، املاک کا انتظام ان کے چھوٹے بھائی جناب قاضی سعید مرحوم کے ذمہ تھا۔ وہ جب تک زندہ رہے اپنے حقوق کی بازیافت کے لئے قانونی چارہ جوئی کرتے رہے۔ سعید بھیا، خدا انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے بڑے حوصلہ مند انسان تھے، بڑے مخلص اور مجھ پر حد درجہ مہربان۔ وہ جب بھی دلی آتے قاضی صاحب ہی کی طرح روزانہ ملاقاتوں سے نوازتے۔

پیشہ ور عاشق ہونے کے باعث مجھ میں یہ فطری عیب ہے کہ دوست کے دوست کو رقیب سمجھنے لگتا ہوں مگر قاضی صاحب از راہ شعر عشق آشنا ہونے کے باوجود دوست کے دوست کو خواہ وہ نادیدہ ہو دوست ہی کا چربہ سمجھتے ہیں۔ میں نے یگانہ مرحوم کی تعریف کی، آپ پہلے سے بڑھ کر ان کی عزت کرنے لگے۔ میں نے حفیظ جالندھری کی استادی اور انسان دوستی کی مدح کی آپ بھی محبت سے یاد فرمانے لگے اور غائبانہ سلام شوق پہنچانے لگے۔ میں نے ممتاز حسن صاحب کے اخلاق و اخلاص کو سراہا۔ آپ نے شوق دید کا اظہار فرمایا۔ یہ ان لوگوں کا ذکر ہے جو دور کی آواز ہیں۔ میرزا تو مرحوم ہو چکے حفیظ صاحب اور ممتاز بھیا (اردو بورڈ کے صدر) پاکستان میں ہیں۔ اتفاقیہ ملاقات

کا امکان کم ہے مگر قاضی صاحب نے طے کر لیا کہ جب بھی کراچی جانا ہو ان یاران وفا پیشہ سے ضرور ملیں گے (اس کے بعد یہ کراچی گئے تو ممتاز حسن صاحب سے کئی ملاقاتیں ہوئیں دونوں ایک دوسرے کے اوصاف حسنہ کے معترف رہیں۔

قاضی صاحب صرف ادبی اور فنی معاملوں ہی میں صاحب الرائے بزرگ نہیں بلکہ نجی اور دنیاداری کے معاملے میں بھی ایسی رائے دیتے ہیں جو ہمیشہ مفید ہوتی ہے۔ میں نے اکثر اپنے ذاتی یا کاروباری مسئلوں پر ان کی ہدایت چاہی۔ انہوں نے جو کچھ بھی کہا آخر اسی پر عمل کرنا پڑا کہ اس کے سوا ہر راہ خسارے کی طرف لے جاتی تھی۔ اگست ۱۹۶۵ء میں میرے ایک بڑے ہونہار اور سعادت مند بھتیجے کا امریکہ میں انتقال ہو گیا اور ۱۹۶۶ء کے آغاز میں بچے کی جوانا مرگی کا صدمہ برداشت نہ کر سکنے کے باعث اسکے باپ کا بھی انتقال ہو گیا لالہ درگاداس میرے بھائی تو تھے ہی مگر یہ خوبی انہیں سے متعلق تھی کہ تقسیم کاروبار کی گرما گرمی کے باوجود وہ میرے دست و بازو کی حیثیت رکھتے تھے اور ہر مشکل میں آڑے آتے تھے۔ ان دونوں کی موت سے میں سخت دکھی ہوا اور اپنے اس مقولے کے باوجود کہ "مرنے والوں کو وہ روئے جسے خود نہ مرنا ہو" میں ان کی یاد میں تنہائی میں بھی رویا ہوں اور جب بھی کسی نے میری دکھتی رگ کو چھیڑ دیا ہو میں زودلی کے باعث کسی کام میں جی نہ لگتا۔ کاروبار پر بھی اثر پڑا۔ نرملا بیٹی امکان بھر مدد کرتی مگر بچی آخر بچی، پھر دوپہر کے لئے کام دیکھتی کہ اسے اپنا گھر بھی تو سنبھالنا ہوتا۔ انہی دنوں قاضی صاحب آئے۔ حالات کو دیکھا، معاملات کا جائزہ لیا اور مشورہ دیا کہ اس سے پہلے کہ تمام کاروبار غارت ہو جائے اسے یا تو بیچ ڈالو یا کوئی قابل اعتماد شریک لے لو۔ اپنی رائے کے حسن و قبح کو اس خوبی سے واضح فرمایا کہ بات میرے دل میں بیٹھ گئی۔ میری بیوی اور چند دوسرے خیر اندیشوں کو اختلاف تھا کہ دے کر یہ دکان ہی اب میرے پاس رہ گئی تھی اور اسی سے

گھر کا خرچ چل رہا تھا۔ مگر اس بات کو وہ بھول رہے تھے کہ آمدنی جو محنت چاہتی ہے اس کی ہمت مجھ میں دن بہ دن کم ہو رہی تھی اور یہ بھی کہ اگر میرے بھائی کا جو عمر میں مجھ سے کہیں چھوٹے تھے اچانک انتقال ہو سکتا ہے تو میرا کیوں نہیں ہو سکتا۔ دکان کی قیمت اگر اب لاکھ روپیہ مل سکتی تھی تو میرے مرنے پر دس ہزار بھی نہ ملیں گے۔ میرے بعد اول تو کاروبار کے چلنے کی صورت ہی نہ تھی کہ بیٹا میرا کوئی ہے نہیں اور بچی اور اس کے شوہر اپنے کاروبار میں اس درجہ آسودہ تھے کہ اسے چھوڑ کر میرے ڈیڑھ ہزار ماہانہ والے سلسلے میں اپنی طاقت کیوں برباد کریں گے اور کام ملازموں پر چھوڑنا اپنی بربادی کو دعوت دینا ہے۔ بددیانتی کے موجودہ ماحول میں کہ اپنی اولاد کما کر نہیں کھلاتی، اوروں سے کیا توقع کی جا سکتی ہے۔ جب قاضی صاحب کے سمجھائے ہوئے یہ سب نکتے میں نے عزیزوں کے سامنے رکھے تو وہ مان تو گئے مگر پھر بھی کہتے تھے کہ باپ کے نام کو بیچ دو گے۔ بڑی بے آبروئی ہو گی۔ میں نے بابر، اکبر، شاہجہان کی مثال پیش کی کہ میرے والد لاکھ بڑے آدمی تھے مگر ان بادشاہوں کے مقابل کیا حیثیت رکھتے تھے اور اگر آج مغلوں کی اولاد جوتے چٹخاتی پھرتی ہے تو ہم کس کھیت کی مولی ہیں۔ میری باتوں سے یہ لوگ لاجواب تو ہوئے مگر قائل نہیں۔

میں نے معاملہ پھر قاضی صاحب کی خدمت میں پیش کیا۔ فرمایا ان لوگوں کی نیت و نعل محض جذباتی ہے اور بے دلیل۔ مگر میں غور کرتا ہوں تو دیکھتا ہوں کہ اگر تم نے دکان کو فروخت کر دیا تو روپیہ تو پھر مل جائیگا مگر تمہارے صرفِ اوقات کی صورت کیا ہو گی۔ گھر میں پڑے پڑے کیا کرو گے اور خاص طور پر کہ تم مصروف زندگی کے عادی ہو، بیکار رہنے سے بیمار پڑ جاؤ گے۔ میرے خیال میں تو کوئی شریک تلاش کرو۔ نصف حصہ دے دو کچھ روپے بھی پاس ہو جائیں گے اور کام کا سلسلہ بھی چلتا رہے گا۔ میں نے رائے سے اتفاق کیا۔ گھر والوں کو جب قاضی صاحب کے نئے فیصلہ سے آگاہ کیا تو وہ بہت خوش

ہوئے کہ نام بھی بچ جائے گا۔ کام بھی اور دام بھی۔ ہم بھائیوں میں ۱۹۶۲ء میں تقسیم املاک ہوئی تو اس سلسلے میں قاضی صاحب کے مشورے بے حد مفید اور کارآمد ثابت ہوتے رہے۔ ان کی ہمیشہ رائے یہ ہوتی کہ جھگڑے کو طول دینا اذیت کا باعث ہوتا ہے اسے نپٹانے اور ختم کرنے کے لئے اگر کچھ مالی خسارہ بھی ہوتا ہو تو خندہ پیشانی سے برداشت کر لینا چاہئے۔ اصول اور آبرو کی بات البتہ الگ ہے۔

میرے اُن ملنے والوں سے جو دہلی میں رہتے ہیں، قاضی صاحب جب بھی ملے تپاک سے ملے۔ اکثر انتہائی مصروفیت کے باوجود اپنے دروازے میرے احباب محبت آشنا پر ان میں سے خواہ کوئی محض گپ باز قسم کا آدمی ہو بند نہ کئے کہ وہ اسے اپنی شانِ بندہ نوازی کے خلاف سمجھتے ہیں اور جس کی میں نے تعریف کی اس سے ملنے کے خواہاں ہوئے۔ قاضی صاحب دوستی اور دوست داری کے سلسلے میں کس درجہ وسیع المشرب ہیں اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے کیجئے۔

مولانا عبدالمجید حیرت شملوی مرحوم میرے کرم فرما تھے مگر نادیدہ کرم فرما کہ ان سے ملاقات کا موقع انتہائی خواہش کے باوجود برسوں نہ ملا مگر محبت اور تعلقات کا یہ عالم کہ قریب قریب روز کی خط و کتابت جاری رہی۔ ہاں تو اُن کا ذکر قاضی صاحب سے بھی اکثر آتا، فرماتے کبھی جب جی چاہے چلو میں بھی تمہارے دوست کو دیکھ لوں اور جب آپ نے دیکھا کہ میں تو جانے سے رہا تو وہ ایک مرتبہ لمبوہ پہنچے تو بے تکلف حیرت بھیا کے یہاں چلے گئے کاش میں بھی ہمراہ ہوتا اور دیکھتا کہ یہ دو عظیم فنکار محبت کے رشتے میں منسلک ہو کر ایک دوسرے سے کیا گفتگو کرتے ہیں اور گل افشانی گفتار کا انداز کیا ہوتا ہے۔
قاضی صاحب نے تو اپنے فطری اختصار کے صدقے یہ کہہ کر معاملہ ختم کر دیا کہ تمہارے حیرت میاں واقعی بڑے اچھے انسان ہیں مگر حیرت صاحب نے متواتر کئی خطوں میں قاضی صاحب کی

تشریف آوری کے گن گائے۔ ان کے بحر علم بے کرانی کی تعریف کی اور اپنی قسمت کو مختلف پہلوؤں سے سراہا کہ جس عظیم ہستی سے ملاقات کی تمنا انہیں برسوں سے تھی (اور جس کے بر آنے کا بظاہر کوئی امکان نہ تھا) وہ خود چل کر ان کے یہاں پہنچی۔ قاضی صاحب کی ذاتِ گرامی سے وہ اس درجہ متاثر تھے کہ جب دہلی میں میری اور اُن کی پہلی اور آخری ملاقات ہوئی تو فرمایا "شعلہ بھیا! تمہارا یہ احسان میری جان پر بہت بڑا ہے کہ قاضی صاحب سے ملاقات کا سامان کر دیا۔

انہی دنوں میرا نواسہ سدھیر پٹنہ گیا۔ قاضی صاحب کی خدمت میں حاضری لازم تھی۔ ان کے یہاں پہنچا تو آپ نے کئی دن واپس جانے کی اجازت نہ دی اور مدارات اس قسم کی روا رکھیں کہ جب تک جیئے گا اسی قسم کی مدارت کی تمنا لئے رہے گا۔ عام حالات میں سدھیر پٹنہ جاتا تو اس کا کہیں اور قیام کرنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا مگر وہ اپنے سکول کے طلبہ کے ہمراہ حکومت کی طرف سے نیپال کی سیاحت کے لئے گیا تھا اور ان کا ایک ساتھ رہنا عاید شدہ پابندی کا جزو تھا، اس کے باوجود قاضی صاحب کا یہ اہتمام اسے اپنے یہاں ٹھہرانا اور ہمراہیوں کے پاس قیام کی اجازت نہ دینا ان کی بزرگانہ محبت اور پدرانہ تعلق خاطر کا ثبوت ہے۔ سدھیر میرے یہاں رہتا تھا۔ کم عمری کے باوجود ان دنوں بھی گرو جوان تھا۔ واپس آیا تو اپنا بستر وغیرہ خود کھولا، اپنا سامان سنبھالا۔ نیپال سے کچھ تحائف ہمارے لئے لایا تھا وہ دے دئے، مگر ہر دوسرے تیسرے دن کوئی نہ کوئی نئی چیز اس کے پاس ہوتی۔ ہم سمجھے اپنے لئے لایا ہوگا۔ ایک دن پوچھا۔ لبے اتنی ساری چیزیں اٹھا لایا۔ قیمت کہاں سے دی تھی؟ جواب دیا یہ چیزیں قاضی صاحب اور ماموں مسعود (قاضی صاحب کے اکلوتے صاحبزادے) نے دی تھیں۔ میں نے کہا ابے الو! پہلے کیوں نہ بتایا، کہا مجھکو دی تھیں نا میرے لئے تھیں۔" میں نے کہا تو ہمارے لئے کیا دیا؟ کہنے لگا " سلام " میں

نے پوچھا اور کچھ ؟ کہا "بس"۔۔۔۔۔۔۔ جولائی ۱۹۶۷ء میں مجھے کئی دن تک قاضی صاحب کی خیریت کی اطلاع نہ ملی۔ نہ خط آیا نہ خط کا جواب۔ میں نے کہا کہ حقیقت حال کا پتا چلانے کے لئے پٹنہ فون کرنا چاہئے، کہا "اس تکلف کی کیا ضرورت ہے میں خود چلا جاتا ہوں۔ خیریت بھی دریافت ہو جائے گی اور ہفتہ بھر میں بھی گھر سے اڑ آؤں گا اور یہ بات صرف ایک ہی مرتبہ کے کہنے سننے تک محدود نہ رہی بلکہ دو تین روز جب تک میں نے فون نہ کر لیا، سدھیر بابو کا اصرار جاری رہا۔

قاضی صاحب کی شان بندہ نوازی، وضعداری اور رواداری کو ایسی جوئبار خوش آب سے تشبیہہ دی جا سکتی ہے جو ہمیشہ رواں دواں رہتی ہے، دور دور تک کناروں کو شاداب رکھتی ہے، تشنگان کو تسکین بخشتی ہے اور قریب آنے والوں کو فرحت بخش ہوا سے نوازتی ہے۔ ۱۹۶۷ء میں قاضی صاحب دلی آئے تو نسبتاً طویل عرصے کے لئے قیام فرمایا۔ عام طور پر وہ ایک ماہ تک رکتے ہیں۔ اب کے دو ماہ سے اوپر ٹھہرے۔ اُن دنوں میں درد گردہ میں مبتلا تھا۔ ان کے یہاں جانا ممکن نہ رہا۔ معمول یہ تھا کہ وہ آتے تو اکثر ملاقاتیں دکان پر ہوتیں یا کبھی کسی قہوہ خانہ میں گوشۂ تنہائی ڈھونڈ کر جا بیٹھتے۔ اکثر ہم دونوں اور کبھی ان کے ایک دو نیاز مند بھی ہمراہ ہوتے مگر بیشتر یہ بھی ہوتا کہ میں اُن کی جائے قیام پر حاضری دیتا۔ (اپنی وضعداری کے صدقے وہ ہمیشہ جناب نورالدین احمد کے یہاں اترتے اب البتہ توحید کا دعوےٰ نہ رہا کہ جناب فخرالدین علی احمد کے یہاں قیام کا شرک شامل ہو گیا ہے) مگر اب کہ میں سفر کے قابل نہ تھا اور دہلی میں صورت سفر ہی کی ہے کہ کسی دوست کی ملاقات کو جانا ہو تو دس میل کا آنا جانا تو معمولی بات ہے۔ قاضی صاحب آتے اور دکان پر آتے۔ اور یہ بات اُن کے لئے سخت صبر آزما یوں تھی کہ میرا مکان کسی مرکزی اور معروف جگہ پر نہ ہونے کے باعث آسانی سے نہ ملتا اور قاضی صاحب ڈھونڈیا کے معاملے

میں چابکدست نہیں اس لئے انہیں میرے یہاں آنے سے پہلے ہر مرتبہ کسی رہبر کو تلاش کرنا پڑتا۔ پھر میں مکان کی آخری منزل پر رہتا تھا اور قاضی صاحب کا اس قطب مینار پر چڑھنا اور ایسے میں کہ عمر ستر سے تجاوز کر چکی تھی، ہفت خواں طے کرنے کے برابر ہے مگر واہ رے قاضی صاحب کا جذبۂ محبت کہ وہ آتے اور میرے احتجاج کے باوجود بار بار آتے کہ راہ تعلق میں ان کی پامردی نہ کسی لغزش کی متحمل ہے اور نہ ہمت و استقلال کسی سنگِ راہ کو رکاوٹ بننے دیتے ہیں۔ اللہ انہیں خوش رکھے زندہ و سلامت۔

۱۹۷۱ء کے وسط میں میری بیوی چولھے کے گیس سے بے طرح جھلس گئی۔ دو ماہ کے قریب ہسپتال میں رہی۔ قاضی صاحب کے ہر خط سے فکرمندی کا اظہار ہوتا۔ اور بات یہیں تک محدود نہ رہی کہ جب انھیں علاج کے سلسلے میں صرف کثیر کا علم ہوا تو آپ نے ایک معقول رقم بھجوائی۔ پہلے تو میں اسے قرضِ حسنہ سمجھا مگر اب نہ یہ قرض رہا اور نہ حسنہ کہ میں اب تک اسے لوٹانے سے قاصر رہا۔ اور بظاہر اب میری نیت بھی وہ نہیں جسے خوش نیتی سے تعبیر کیا جا سکے۔

ایک عرصے سے ان کی صحت ٹھیک نہیں رہتی۔ غدود مثانہ کی سوزش اگر کبھی تنگ کرتی ہے تو کبھی وہ دھانس جو دن بھر کی کھانسی کے بعد ہفتوں رفاقت میں رہتا ہے۔ ۱۹۷۳ء میں وہ یہیں دلی میں تھے کہ اختلاج قلب کا دورہ پڑا۔ بہت دن ہسپتال میں رہے۔ اپنی بلند ہمتی کے صدقے وہ اس کے بعد بھی کئی مرتبہ دہلی تشریف لائے مگر حقیقت یہی ہے کہ اب ان کی صحت دنیوی ہنگاموں کی برداشت نہیں رکھتی۔ گزشتہ ماہ پٹنہ میں تباہ کن سیلاب آئے۔ قاضی صاحب وہیں تھے۔ میری پریشانی ظاہر۔ میں نے خط لکھے۔ شاید دیر میں ملے۔ ان سب کا جواب روایتی اختصار سے مجھے ۱۵ ستمبر ۱۹۷۵ء کو ملا۔ خدا کا شکر کہ ہر طرح خیریت رہی۔ نقل حاضر کرتا ہوں کہ تازہ ترین صورتِ حال کا مظہر ہے۔

پٹنہ - ۱۱ستمبر ۱۹۷۵ء مجی تسلیم - خط ملا۔ اس سے قبل بھی ایک یا دو خط آئے تھے۔ جواب میں چند سطریں لکھیں بھی مگر کاہلی خط کو تمام کرنے سے مانع آئی۔ آج کل بظاہر کوئی شکایت نہیں۔ میرے معالج نے چند روز قبل مجھے دیکھ کر یہ رائے ظاہر کی تھی کہ میں پہلے سے بہت بہتر ہوں۔ مگر میں بہت کاہل ہو گیا ہوں۔ مشکل سے اپنے کو کسی کام پہ راضی کرتا ہوں۔ فخر الدین علی احمد صاحب کا خط چند دن قبل آیا تھا جواب نہیں دیا۔ پرسوں پھر ایک خط آیا۔ آج گمان ہے کہ جواب دوں۔ اس کاہلی کا علاج شاید ہی اطبا کے پاس ہو۔

سیلاب کا حال آپ نے اخباروں میں پڑھا ہو گا۔ ہم لوگوں کو کچھ نقصان نہیں پہنچا۔ کچھ تکلیف البتہ ہوئی۔ دو دن بجلی کے بغیر گذارہ کرنا پڑا۔ ٹیلیفون آج تک بند ہے مسعود سلام کہتے ہیں۔ مخلص، قاضی عبدالودود"

"مضمون جس کا ذکر آپ کے خط میں ہے میری نظر سے نہیں گزرا۔ اسے دیکھنا چاہتا ہوں" (میرا یہ مضمون قاضی صاحب کے دوست اور میرے محسن جناب نورالدین احمد بیرسٹر سے متعلق گزشتہ ماہ شائع ہوا۔ شعلہ)

سید حسن عسکری

قاضی صاحب ـ عالم اور انسان

دسمبر ۱۹۳۰ء کے آخری ہفتے میں کل ہند اورینٹل کانفرنس اور ریکورڈس کمیشن کے اجلاس پٹنہ میں پہلی بار منعقد ہوئے۔ اس یادگار ہفتے میں کافی علمی چہل پہل رہی۔ کمیشن کے سلسلے کی کارروائیاں بالخصوص نمائش کا انتظام تو ہائی کورٹ کی عمارت میں کیا گیا لیکن کانفرنس کی نشستیں تو یونیورسٹی کے دائرے ہی میں محدود رہیں۔ اور ظاہر ہے کہ یہاں اجتماع نسبتاً بہت زیادہ تھا۔ اس وقت میں ان دو میں کسی کا باقاعدہ ممبر نہ تھا۔ کمیشن کے سلسلے میں تو نوادر مخطوطات وثائق وفرامین، تصاویر اور خطاطی کے نمونوں وصلیوں کی فراہمی کے متعلق مجھ سے کچھ چھوٹا موٹا کام لیا بھی گیا لیکن کانفرنس میں تو محض ایک تماشائی کی حیثیت سے ہی شرکت کر سکا۔ کانفرنس میں ایک شعبہ اردو کا بھی تھا جس کے صدر صلاح الدین خدا بخش مرحوم تھے جنہیں میں جانتا تھا بلکہ ان کی ایک تقریر بھی سن چکا تھا۔ شام کے بعد ایک روز مشاعرہ کا بھی انتظام تھا جس کی صدارت بھی صلاح الدین خدا بخش مرحوم ہی کو کرنی تھی مگر وہ کسی وجہ سے اس فرض کو انجام نہ دے سکے۔ میں مشاعرہ کے ہال میں پہلے سے ہی موجود تھا لیکن حسب عادت ایک پچھلی طرف کی کرسی یا بنچ پر بیٹھ گیا تھا۔ میرے ایک عظیم آبادی آشنا کچھ دیر کرکے پہنچے اور میری بغل میں بیٹھ گئے۔ کرسی صدارت پر انگریزی لباس میں ملبوس ایک باوقار وجیہہ پر رعب بزرگ متمکن دکھائی دیتے۔ پہلے کبھی میں نے انہیں نہیں دیکھا تھا۔ بغل

کے دوست سے میں نے موصوف کے بارے میں کچھ پوچھا۔ کسی قدر طنز سے بولے۔ یار والے باوجود برسوں کے قیام کے پٹنہ کی مشہور شخصیتوں سے بھی لاعلم رہ جاتے ہیں۔ میں نے اپنی کمزوری کا اعتراف کیا۔ پھر کہنے لگے۔ یہ ہی تو قاضی عبدالودود صاحب ہیں۔ کیا ہوا اگر ایک بیرسٹر نہیں آئے۔ یہ بھی تو بیرسٹر ہیں اور بی اے کینٹب بھی۔ پٹنہ کے ایک خاندانی رئیس کے جو کسی حد تک قدامت پرست کٹر قسم کے مذہبی لیکن عالم آدمی تھے، یہ سب سے بڑے صاحبزادے ہیں۔ قومی کاموں میں انگلینڈ جانے کے قبل پیش پیش رہتے تھے۔ اور شاد عظیم آبادی کے دیوان کو بھی مرتب کیا تھا۔ علم و ادب بالخصوص اردو کے تذکروں اور قدیم دواوین میں انھیں بڑی دلچسپی رہی ہے اور ان میں کافی دستگاہ رکھتے ہیں۔ آج کل مصحفی کی حیات و کلام و مصنفات کو مغربی تنقید کی روشنی میں ایک سیر حاصل کتاب کی شکل میں مرتب کر کے اسے منظر عام پر لانے میں مصروف ہیں۔ قانون کی بہ نسبت زبان و ادب سے زیادہ لگاؤ ہے۔ صاحب ثروت و تمول ہیں۔ پریکٹس نہیں کرتے —— شاید کچھ اور بھی کہتے مگر مشاعرہ شروع ہو چکا تھا۔ اور سب کی توجہ اسی طرف مبذول ہو گئی۔ بس کچھ دیر پر شاد لسمل الٰہ آبادی اور عندلیب شادانی لہک لہک کر اپنے مخصوص دلکش انداز اور نہایت ہی مترنم آواز میں اپنی شاعرانہ موشگافیوں کو پیش کر کے حاضرین سے داد پر داد لے رہے تھے۔ سارے مشاعرے پر چھائے ہوئے تھے۔ جب یہ دونوں اپنا کلام سنا چکے تو میں آہستہ سے ہال سے نکل آیا۔ عرصہ تک میں نے قاضی صاحب کے متعلق کسی سے کچھ پوچھ تاچھ نہیں کی۔

قاضی صاحب کی شخصیت، ان کے تیور و تمکنت میں کچھ ایسی جاذبیت تھی کہ باوجود عدم توجہی کے شنید و دید کے کچھ اثرات باقی رہتے۔ کچھ ایسے نقوش میرے عکس دماغ پر مرتسم ہو چکے تھے جو بالکل زائل نہ ہو سکے۔ کبھی کبھی خدا بخش خان مرحوم کے کتبخانے

میں میری نظر ان پر پڑ جاتی تھی۔ کچھ یاد تازہ ہو جاتی تھی لیکن نہ معلوم کیوں میں اتنا مرعوب تھا۔ متعارف ہونے کا خیال میرے دماغ میں کبھی نہیں آیا۔ جنوری ۱۹۳۴ء کے زلزلے نے پٹنہ کی جن عمارتوں کو ہلا ڈالا، ان میں کتب خانہ مشرقیہ کے کرزن ہال کے بغل کی دو منزلہ عمارت بھی تھی۔ ایک منزل جو بہت مخدوش ہو گئی تھی، اتار دی گئی۔ مخطوطات کے لئے علیحدہ عمارت تو بہت بعد کو بنی۔ جہاں تہاں کتابیں اور مخطوطات الماریوں میں بند کر دی گئیں۔ قارئین کی سہولت کے لئے ایک چھوٹا کمرہ مخصوص کر دیا گیا تھا۔ دو ایک میزیں تھیں اور کچھ کرسیاں اور دیوار سے سٹی ہوئی کتابوں سے بھری الماریاں جگہ بہت تنگ تھی۔ یاد نہیں زلزلے کے کتنے دنوں یا مہینوں بعد میں ایک روز اس کمرے میں میز کے مشرق طرف کی ایک کرسی پر بیٹھا کسی کتاب کی ورق گردانی کر رہا تھا کہ پیچھے کی طرف کچھ آہٹ معلوم ہوئی۔ پلٹ کر دیکھا، قاضی صاحب اپنے مخصوص انگریزی لباس میں ملبوس کھڑے تھے۔ استعجاب کی کچھ کیفیت طاری ہونے کو ہی تھی کہ "آداب عرض" کے بعد قاضی صاحب نے محض اتنے جچے تلے الفاظ زبان پر لائے "مجھے قاضی عبدالودود کہتے ہیں۔ میں بھنور پوکھر محلہ اور شاہ رشید اللہ صاحب وکیل کے مکان میں رہتا ہوں۔ کیا آپ آج شام کو میرے ساتھ چاء پینے کے لئے آئیں گے" میں اب سنبھل چکا تھا۔ کہا، بڑی خوشی سے حاضر خدمت ہو جاؤں گا۔ وکیل صاحب کے دولتکدہ کو جانتا ہوں گو موصوف سے میری ملاقات نہیں ہے۔

خدو خال، شکل و شباہت، وضع و لباس سے عادات و اطوار کا تو کچھ اندازہ ہو سکتا ہے لیکن سیرت و کردار، ذات و صفات، فضل و کمالات کا کچھ علم تو پیہم ملاقاتوں اور گفت و شنید کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔ اور خدا کے فضل اور قاضی صاحب کی شفقت و مہربانی سے اس کے مواقع مجھے بہت ملے۔ شخصیت کا مکمل طور پر اندازہ

ایک مشکل امر ہے اور میرے ایسے آدمی سے تو اس کی امید ہی نہیں کبھی ہو سکتی۔ چھوٹی چھوٹی باتوں سے انسانی اقدار اور اخلاقی بلندی کی جھلک مل جاتی ہے میں نے قاضی صاحب کو دیکھا اور ایک دوست نے جو کچھ مجھے بتایا اس سے ان کو قریب سے دیکھنے اور کچھ استفادہ کرنے کی خواہش ہوئی۔ مگر یہ خواہش دب گئی۔ وہ تو مجھے نہیں جانتے تھے۔ اور نہ شاید ہی کسی نے میرے متعلق کچھ ان سے کہا ہو، اس لئے کہ میرے ملنے والے بہت کم اور مخصوص قسم کے کالجی دوست تھے اور ان کا آنا جانا قاضی صاحب کے یہاں نہ تھا۔ میں حیرت زدہ تھا کہ قاضی صاحب نے کیوں مجھ سے ملنے میں پہل کی۔ خود ہی ذریعۂ تعارف بنے۔ کیا اس سے ان کی شرافت نفس اور اخلاقی خصوصیات پر روشنی نہیں پڑتی۔ جب میں ان کے دولتکدہ پر پہنچا، بڑی کشادہ پیشانی اور انتہائی خلوص سے ملے۔ کہنے لگے کہ کالج کے اساتذہ شاذ و نادر ہی کتب خانہ میں دکھائی دیتے ہیں۔ شاید آپ کا بھی تعلق پٹنہ کالج سے ہے۔ میں جب کبھی جاتا ہوں تو آپ پر نظر پڑتی ہے۔ اس لئے خواہش ہوئی کہ آپ سے ملوں۔ میں نے کہا کہ شعبۂ تاریخ سے میرا تعلق ہے۔ پوچھا، کون سی کتاب یا مخطوطہ زیر مطالعہ ہے۔ میں نے جواب دیا کہ کچھ عرصہ ہوا ایک صاحب جو ڈاکٹریٹ کے لئے ایک مقالہ لکھ رہے تھے۔ بنگال کی تاریخوں سے متعلق کچھ مواد میرے ذریعے سے حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اس ضمن میں مظفر نامہ مصنفہ کرم علی پر نظر دوڑانے کی نوبت آئی۔ ان کا کام تو ختم ہو گیا لیکن یہ کتاب میرے لئے بڑی جاذب نظر ثابت ہوئی۔ وقت گذاری کے لئے اس کی ورق گردانی کرتا رہتا ہوں۔ اتنا ہی سنا تھا کہ قاضی صاحب اس کتاب کے نام کی وجہ تسمیہ، موضوع، مصنف، اس کی مابہ الامتیاز خصوصیات، خاص خاص اور نئی نئی باتوں پر تفصیلی روشنی ڈالنے لگے۔ میں حیران تھا کہ ان کے متعلق ساری باتیں کس قدر کم اور نا آشنی بخش تھیں۔ کہاں ادب اردو و فارسی کہاں تاریخ غالباً ان کا موضوع تاریخ و تحقیق رہا ہوگا۔ مجھے قاضی صاحب نے

گئے میں غور سے سنتا رہا۔ بعد میں جب کتب خانہ میں پہنچا تو ان کی تفصیلی اور تنقیدی گفتگو کی روشنی میں میں نے اس کتاب کا زیادہ غائر نظر سے مطالعہ کیا اور دو چھوٹے بڑے مضمون لکھ کر اُڈیل ایکڈمی اور علی گڑھ کے ایک ریسرچ جرنل کے اراکین کی فرمائش پوری کر دی۔ قاضی صاحب کو کیا معلوم کہ اگر وہ بہت سے نکتوں، گوشوں، و دقائق کو منکشف نہیں کرتے ان کی وضاحت نہیں کرتے تو میں علیگڑھ والے مضمون کو جس کا عنوان تھا، "مظفر نامہ۔ ایک تنقیدی جائزہ" نہیں لکھ سکتا تھا۔ ایک دوسرے موقع پر بھی اسی مظفر نامہ کا ذکر آیا، کہنے لگے، میرے پاس ایک نہایت قدیم خوشخط اور صحیح نسخہ اس کتاب کا ہے آپ چاہیں تو اسے مستعار لے کر اطمینان سے گھر پر پڑھیں۔ میں خوشی خوشی اسے گھر لایا۔ بہت کچھ اس میں سے نقل کر ڈالا پھر واپس کر دیا۔ ایک اور موقع پر فرمایا کہ اس کی مقفی، مسجع عبارات اور لفاظی سے قطع نظر کر کے آیئے ہم اور آپ اس کا ترجمہ کر ڈالیں۔ تجویز بڑی مناسب تھی۔ میں راضی ہو گیا قاضی صاحب نے تو بہت کچھ ترجمہ کر ڈالا مجھ سے پوچھا تو میں نے جواب دیا کہ میں نصف اول کو اپنے ہاتھ میں لیتا ہوں۔ کہنے لگے میں تو نصف اول کا بہت حصہ پورا کر چکا ہوں۔ آپ نصف آخر لیں میرے لئے دلکشی تو پہلے ہی حصے میں تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میں نے کچھ نہیں کیا۔ معاملہ جوں کا توں رہا۔ آمد و رفت اور ملاقاتوں کا سلسلہ جو آج سے تقریباً چالیس بیالیس سال پہلے شروع ہوا اور جو بحمد للہ اب تک جاری ہے، میرے لئے بہت ہی مفید مطلب اور منفعت بخش ثابت ہوا۔ متنوع موضوعات، مختلف مباحث کے علمی تحقیقی مسائل اکثر و بیشتر زیر بحث آئے ماضی و حال کی کچھ نامور شخصیتوں کے احوال و اقوال اور تصنیفات کا ذکر آیا۔ اچھے برے مضمون پر بلا جھجک رد و قدح کی جاتی رہی۔ غرض بہت سی خاص خاص باتوں کے متعلق قاضی صاحب کے گراں قدر خیالات اور تشریحی توضیحی اور تفصیلی ناقدانہ رائیں ان کی زبان سے سننے میں آتی رہیں، اور میرے محدود معلومات میں معتد بہ اضافہ ہوتا رہا۔ المختصر میں نے قاضی صاحب سے

بہت کچھ پایا، حاصل کیا۔ مجھ سے وہ کیا پا سکتے تھے۔ اکتساب و استفادہ کا معاملہ بالکل یک طرفہ تھا۔ میرے اپنے خاص موضوع تاریخ کے مختلف پہلوؤں، گوشوں پر نئے زاویۂ نگاہ سے کبھی کبھی روشنی ڈال کر افادہ حاصل کرنے کے مواقع قاضی صاحب نے مجھے بہم پہنچائے۔

میں جب بھی قاضی صاحب کے جائے قیام پر پہنچا، خواہ وہ شاہ رشید اللہ کا دولتکدہ ہو، خواہ قدم کنواں کی وسیع کوٹھی اور دو منزلہ مکان جس کی اوپر کی منزل پر زمانۂ علالت میں تنہا صرف نوکر چاکر کے ساتھ وہ رہتے تھے، مجھے اوپر بلا لیا کرتے تھے۔ لیٹے لیٹے باتیں کرتے رہتے تھے۔ میں تو زیادہ تر ہمیشہ چپ ہی رہتا تھا۔ اس لئے نہیں کہ وہ مجھے بولنے کا موقع نہیں دیتے تھے۔ میں بولتا ہی کیا؟ میں تو کچھ سننے کچھ اپنانے کے لئے ہی جاتا تھا۔ جب کبھی مجھے کوئی نیا مخطوطہ فارسی کا ہو یا اردو کا، منظوم ہو یا منثور، تذکرہ ہو یا دیوان، مجموعۂ کلام ہو یا مجموعۂ خطوط و انشا، بیاض اندر اِم مخلص ہو یا مرثیۂ شخص نامعلوم، تاریخی قطعات واسوخت وغیرہ سے لبریز ہو، مہاراجہ کلیان سنگھ عاشق کی اردو مثنوی ہو یا کمال علی صفی کے فارسی اردو دواوین اور مکاتیب یا دلدار کے اردو قطعات، غرض جو کتاب مجھے نئی قدیم اور جاذبِ نظر معلوم ہوتی تھی میں اس کا قاضی صاحب سے ضرور ذکر کرتا اور بسا اوقات کتابوں کو مستعار لے کر ان کی خدمت میں پیش کر دیتا۔ اکثر کتابوں کا متن قاضی صاحب نے معاصر میں یا کہیں دوسری جگہ شائع کرا دیا لیکن مقدمہ، پیش لفظ، تعلیقات وغیرہ بہت کم کسی شائع کردہ مخطوطہ کو نصیب ہوا۔ مخطوطات دلدار، دیوان رضا اور کسی حد تک مثنوی عاشق کا شمار مستثنیات میں تھا۔

میرے ایک شاگرد نے جو ہری واستو کائستھوں کے ایک علمی گھرانے کے نام لیوا تھے اور جن کے مورثین مغلوں کے عہد میں عہدہ "قانون گوئی" پر فائز تھے جن کے اسناد و حکمنامہ شاہی کا انگریزی میں ترجمہ کر دینے کی ہدایت بھی گئی تھی وہ قدیم رؤسا کی طرح ایک بھاری بھرکم کتب خانہ کو تحویل

اور جاہ و منزلت کے نمود کے لیے ضروری سمجھتے تھے۔ رائے بہادر نے ایک کتاب اپنے دیہات بکھرا سے لاکر دی۔ یہ مثنوی گوہر جوہری تھی جس پر مقالہ لکھ کر ڈاکٹر صدر الدین ڈی لٹ ہوئے۔ میں کھل اٹھا۔ دوڑا دوڑا قاضی صاحب کی قدم کنواں والی کوٹھی پر پہنچا۔ جو بہت زمانہ ہوا بک گئی۔ قاضی صاحب علیل تھے۔ لیکن حسب معمول اوپر بلوالیا۔ میں نے مثنوی ان کے ہاتھ میں دے دی۔ لیٹے لیٹے سرسری نگاہ ڈالی۔ کہنے لگے: زبان اچھی نہیں ہے مجھے برا لگا مگر میں چپ رہا۔ بات دراصل یہ تھی کہ وہ اس وقت خود ہی اچھے نہیں تھے۔ کسی تکلیف کی وجہ سے موڈ خراب تھا، لیکن خلقی کریم النفسی اور خاص شفقت جو مجھ پر فرماتے تھے مانع ملاقات و گفتگو نہیں ہوئی۔

قاضی صاحب نے غالباً ڈلی سینی ٹوریم سے آنے کے بعد اپنا معیاری اردو ماہانہ "معیار" کے نام سے نکالا تھا۔ اور اس میں مرحوم شرف عالم آرزو جلیلی جو سائنس کالج میں طبیعات کے لکچرر تھے ان کے معاون تھے۔ کچھ دنوں بعد بابائے اردو مولانا عبدالحق مرحوم پٹنہ میں وارد ہوئے۔ پٹنہ کالج کے طلبہ نے انہیں عصرانہ دیا تھا۔ میں بھی موجود تھا۔ کسی نے مولانا کو خلاف توقع میری طرف بھی موڑ دیا۔ کہنے لگے، جنوری سنہ [illegible] میں کل ہند اردو کانفرنس دہلی میں زیر صدارت سر تیج بہادر سپرو منعقد ہو رہی ہے۔ آپ بھی آئیے۔ اور ایک مضمون پہلے لکھ کر بھیج دیجئے۔ میں نے کہا کہ شرکت تو ممکن نہیں، اس لئے کہ دسمبر کے اواخر میں کلکتہ کے ریکارڈس کمیشن میں مجھے اپنا مقالہ پڑھنا ہے۔ مضمون کے متعلق سوچوں گا۔ کڑکدار آواز میں کہا، آپ کو لکھنا ہے۔ معلوم ہوتا تھا کہ میں ان کا مدتوں سے جانا پہچانا ہوں۔ میں نے انھیں اور انھوں نے مجھے پہلے پہل ہی تو دیکھا تھا مگر عرصہ سے ایک خلش تھی کہ مثنوی گوہر جوہری کو منظر عام پر لانا چاہئے۔ آرزو جلیلی مرحوم میرے دوست تھے۔ ہم دونوں نے حاجی گنج ساز صاحب کی حویلی سے چند تاریخی اہمیت کے کاغذات حاصل کئے تھے۔

وہ نمائندہ ہو کر کاغذات کے ساتھ مثنوی گوہر جوہری اور اس پر ایک سیر حاصل مقالہ کو لے کر، جو رسالہ اردو اپریل ۱۹۴۰ء کی اشاعت میں شائع ہوا، دہلی پہنچے۔ حامد اللہ افسر صاحب مرحوم کی نہیں نہیں کے باوجود مولانا عبدالحق نے خود دخل دے کر ساری چیزیں نمائش میں رکھوائیں اور مقالہ رکھ لیا، بعد میں کل کا کل اسے رسالہ میں چھپوا دیا۔

جس زمانے میں قاضی صاحب علیل رہا کرتے تھے، اس وقت بھی میرا آنا جانا بند نہیں ہوا۔ میرے لئے تو خیر کبھی بھی ایسا موقع نہیں آیا کہ نیچے ملازم نے کہہ دیا ہو، صاحب مصروف ہیں اور ملاقات سے معذور۔ میرا خیال ہے کہ کسی کو ایسی نوبت پیش نہیں آئی ہو گی۔ چاہے وہ علیل ہوں چاہے صحت مندی کی حالت میں، طالبان تحقیق کو ان تک پہنچنے میں کوئی بھی کسی قسم کی رکاوٹ ڈالنے کا مجاز نہ تھا کہ قاضی صاحب ہمیشہ لئے دیئے رہتے ہیں لیکن بڑے وسیع الاخلاق اور پر خلوص انسان ہیں۔ اگر وہ کسی کے لئے کچھ کرتے ہیں تو اس کا بھولے سے بھی کبھی ذکر نہیں کرتے۔ وہ بظاہر خشک مزاج، بڑے خود دار دکھائی دیتے ہیں لیکن میں نے انہیں کبھی خود بیں، خود پرست، مغرور و متکبر نہیں پایا۔ تصنع و تکلف سے انہیں بیر تھا اور ہے۔ جو لوگ بنتے ہیں اور کسی قسم کے تقدس کا ڈھونگ رچاتے ہیں بالخصوص غلط قسم کی صوفیت اور مذہبیت کا رنگ روپ اختیار کر کے عوام کو فریب دیتے تھکتے نہیں، ان سے ان کو خاصی چڑ ہے۔ بڑے بڑے نامور اشخاص بھی ان کی زد سے نہیں بچتے۔ سعدی کی ہزلیات، رومی کے کچھ عریاں قسم کے اشعار کا حوالہ دے کر اپنی ناپسندیدگی اور بیزاری کا برملا اعلان کرتے ہیں۔ خرقہ پوش متصوفین کی بہت سی حکایتیں بقید حوالجات انہیں یاد ہیں اور کبھی کبھی اس کا اعادہ کرتے ہیں۔ عبدالقادر بیدل کی قادر الکلامی اور ان کی انفرادیت، شاعرانہ عظمت و بزرگی کے قائل ہیں لیکن ان کے مذہبی غلو بلکہ متشدد قسم کی عصبیت بالکل پسند نہیں کرتے۔ میر النفس بر عاطبوعہ یا قلمی بیدل کے خطوط اور چہار عنصر جیسی کتابیں

زیر مطالعہ آئیں۔ جو کچھ قاضی صاحب سے سنا تھا سب کچھ ان کتابوں میں پایا۔ انھیں کی طرح تفحص و تکد طبیعت پر طاری ہوئی۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہوا کہ دوران گفتگو میں کسی تاریخی شخصیت یا واقعہ کے ذکر و اذکار کی نوبت آئی تو قاضی صاحب کو فارسی اردو کے شاعروں کے تذکروں میں کچھ ایسے امور کی تلاش و جستجو ہوئی جس کا کسی مضمون و مقالہ میں لایا جانا ضروری تھا۔ اکثر قاضی صاحب نے مجھ سے بھی کچھ پوچھا معلوم تھا یا یاد تھا تو کہہ دیا۔ فوراً حوالا اور ماخذ کا بقید سنین و صفحات سوال اٹھا اور میں بغلیں جھانکنے لگا۔ کہا دیکھ کر بتاؤں گا بات آئی گئی ہوگئی۔ اس لئے کہ شاید ہی پھر کبھی اس استفسار کے اعادہ کی نوبت آئی ہو۔ جس زمانے میں قاضی صاحب سکریٹری انجمن ترقی اردو کی فرمائش پر دیوان جوشش کو مرتب کر رہے تھے، اس وقت محمد روشن جوشش، ان کے بھائی محمد عابد دل اور ان دونوں کے والد راجہ جسونت رائے ناگر کے متعلق باتیں نکل پڑیں۔ میں نے کہا کہ شیخ علی حزیں نے بنارس سے پھلواری شریف کے ایک خانقاہی بزرگ کو خط لکھ کر محمد روشن جوشش کی سفارش کی تھی۔ حسب عادت فوراً کہا، آپ نے یہ کہاں دیکھا۔ تفصیلات و حوالہ کی مانگ ہوئی۔ اصل ماخذ کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کی خواہش ظاہر کی گئی۔ خوش قسمتی سے راجہ رام نرائن موزوں نائب ناظم بہار کے خطوط میں حزیں کا یہ خط بھی تھا۔ میں نے اس مخطوطہ کو جس کا نام دستور الانشا پڑ گیا ہے، دوسرے ہی روز قاضی صاحب کے سامنے رکھ دیا۔ اور اطمینان کی سانس لی۔ مجھے ایک مرتبہ احمد علی خیا آمت کے اخلاف میں ایک رئیس زادہ کی الماری کے خزانۂ مخطوطات کو دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ منجملہ اور نوادر کے محمد عابد دل کے مختصر مگر مکمل دیوان پر نظر پڑی۔ میں جب قاضی صاحب کے یہاں پہنچا تو اس کا ذکر کرنا ضروری تھا۔ خوش دکھائی دیئے۔ کہنے لگے، مجھے چند ٹکڑے دل کے کلام کے یورپ سے ملے تھے۔ نقل کر کے ساتھ لیتا آیا۔ لیکن یہ اجزا

مسکن عطش نہیں ہو سکتے۔ آپ اگر لا سکتے ہیں تو اسے ضرور لائیے۔ پٹنہ سٹی جانا کچھ عرصہ تک نہ ہو سکا جب گیا تو پتا چلا کہ جن جن کتابوں کی اہمیت پر بڑے لکھنے سے میں نے زبانی ریویو یا خیال آرائی کی تھی۔ مع اپنے مالک کے ارض مقدس پہنچ گئیں۔ ان میں دیوان دلیؔ بھی تھا۔ مدتوں بعد حال میں یہ کتاب مع س۔ ش۔ ص والے انتساب۔ راز وصی بلگرامی کے مقدمے کے شائع ہوئی۔ ایک نسخہ مجھے، دوسرا قاضی صاحب کو تیسرا کلیم صاحب تک پہنچ گیا۔

قاضی صاحب کے متعلق اس کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ تحقیق کے میدان میں وہ آپ اپنی مثال ہیں اور بڑی اہم، بلند مرتبہ شخصیت کے حامل ہیں۔ بڑے روشن خیال، صاف دل، صاف گو، تکلف سے دور ہیں۔ لیکن پرانے زمانہ کے رؤسا کی وضعداری مہمان داری، صاحبان احتیاج کی ممکن الوسع امداد، اعانت کا جذبہ بھی موجود ہے اور باوجود آزاد خیالی کے قدیم ماحول کے اثرات سے بالکل اپنا دامن چھوڑا نہ سکے۔

سنا جاتا ہے کہ انگریزی تعلیم، خاندانی روایت کے علی الرغم شروع کی۔ گھر پر ابتدائی اور اعلیٰ تعلیم و تہذیب کی تکمیل ہوئی۔ حافظ قرآن مجید بھی ہوئے۔ مجھے کبھی ان باتوں کی تحقیق و توثیق اور اثبات و تصدیق خود قاضی صاحب سے کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ لوگ کہتے ہیں کہ انگلینڈ اور یورپ سے واپس آنے کے بعد قاضی صاحب کا دوسرا روپ تھا طور طریق زندگی میں بہت تبدیلی آگئی تھی۔ بہت سے لوگ خود آشنا ہوتے ہیں اور خود نمائی کے جذبے سے سرشار ہو کر وقت بے وقت اپنے متعلق ہی بہت کچھ ہم صحبتوں کو سنایا کرتے ہیں۔ قاضی صاحب اپنے ماضی و حال کے متعلق بہت کم بولتے ہیں اشارہ تک نہیں کرتے۔ نہ شاید اس ضمن میں کسی کی پوچھ تاچھ کو گوارا کرنے کے لئے تیار ہوتے ہیں۔ لیکن ان کے کچھ اصول ہیں، معمول ہیں۔ دھن اور لگن والے طالبان علم و تحقیق انہیں بہت

پسند ہیں۔ ان کی ہمت افزائی کرتے ہیں۔ مناسب موضوع، عنوان تھا کہ اس کے لئے مطالعہ کی ضروری کتابیں، لکھنے کا اسلوب سب کچھ بتا دیتے ہیں۔ حک و اضافہ، ترمیم و تنسیخ، اصلاح و آراستگی کا فرض بھی خود پہ عاید کر کے علمی تحقیقی خدمت کا حق ادا کرتے ہیں۔ زبان وادب کا شاید ہی کوئی موضوع ہو جس پر قاضی صاحب کچھ نہ کچھ نئی روشنی نہ ڈالیں۔ اس لئے تحقیق کے طالب و متلاشی ان کے پاس بغرض استفادہ پہنچنا ضروری سمجھتے ہیں۔ حالانکہ یونی ورسٹی کے کسی علمی ادارے سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ طالب کی استعداد کی پرکھ کے بعد ہر طرح سے اسے بڑھاوا دیتے ہیں۔ اس سے ان کی شخصیت کی سیرت و کردار، تہذیب و شائستگی، شرافت و انسانیت کی جھلک ملتی ہے۔ وہ خود بڑے وسیع المطالعہ، باریک بیں، نکتہ رس، معنی آرا ہی نہیں، سخت قسم کے نقاد بھی ہیں۔ وہ کبھی بھی کسی کے نظریات و تجربات اور تراوش افکار کو سراہنے کے لئے آسانی سے تیار نہیں ہوتے، جب تک ان کے قال و حال کو اپنی کسوٹی سے جانچ پڑتال نہ کرلیں۔ اپنے غیر معمولی فہم و ذکاوت، ذہنی صلاحیت، معلومات فراواں اور زبردست حافظہ کی بدولت اس کا حق رکھتے ہیں کہ بڑے سے بڑے ادیب و فنکار، شاعر، انشا پرداز، مورخ کی ذات و صفات اور علمی تحقیقی کارناموں پر اپنی کوئی خاص رائے قائم کریں۔ تحقیق، تنقید، تاریخ کسی میں قید نہیں۔ وہ اپنے ہوں یا بیگانے کسی کو بخشنے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ لیکن ان کی دوسری خصوصیات، خوبیوں اور محاسن کو بھی نظر انداز نہیں کرتے۔ مصنف آب حیات کی متعدد خامیوں کی دھجیاں بکھیر دیئے ہیں۔ لیکن ان کی دلآویز انشاپردازی کو سراہتے ہیں اور خلافت کے مسئلے کے متعلق ان کی صاف گوئی، حقیقت شناسی کو بہت مناسب اور برمحل سمجھتے ہیں۔ شاد عظیم آبادی کی مختلف قسم کی انسانی کمزوریوں کو بار بار بے نقاب کرتے نہیں جھکتے لیکن ان کی شاعرانہ عظمت کے ہمیشہ معترف رہے۔ اگر کسی میں معمولی سی

کج روی دیکھتے ہیں اور بہ خود غلط ہونے کی خوش فہمی اور پندار کا شائبہ پاتے ہیں تو ٹوک دینے میں کچھ ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے۔ غرض تخریب نہیں، تشریح و اصلاح ہوتی ہے۔ مگر کبھی کبھی معاملہ آگے بڑھ جاتا ہے اور ناگوار صورت اختیار کر لیتا ہے۔ دلی کے ایک مشہور پروفیسر اور صدر شعبہ اردو پہلے جب کبھی پٹنہ میں آتے تھے تو ایک رو قاضی صاحب کے ہی مہمان ہوا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ قاضی صاحب نے ان کے اعزاز میں اپنے کچھ خاص احباب کو دعوت پر بلایا تھا۔ مجھے بھی دعوت دی گئی تھی چار، ناشتہ کا دور چل رہا تھا کہ اسی اثنا میں کسی نے ایک پارسل پروفیسر صاحب کے حوالہ کیا۔ انہوں نے اسے کھولا اور اپنی نئی شائع شدہ کتاب کو قاضی صاحب کے ہاتھ میں دے دیا جن کے بغل میں وہ خود بیٹھے تھے۔ کہا۔ یہ پہلا نسخہ ہے جو ریڈ ڈائریکٹ ہو کر میرے پاس پہنچا ہے۔ قاضی صاحب نے اسے الٹ پلٹ کر دیکھا۔ ایک جگہ نگاہ ٹھٹکی، حسب عادت ایک دیئے گئے حوالہ کے متعلق کچھ پوچھ بیٹھے کوئی تشفی بخش جواب نہ ملا۔ مجھ سے مخاطب ہوئے۔ کیا آپ نے اس کتاب کو کہیں دیکھا یا پڑھا ہے۔ میں نے کہا، پڑھا تو نہیں البتہ اتنا جانتا ہوں کہ میرے استاد محترم سرجادو ناتھ سرکار نے اس کی فوٹو کاپی لندن سے منگوائی تھی۔ پھر پروفیسر موصوف کی طرف پلٹے۔ پوچھا۔ آپ نے اس فوٹو کاپی یا اصل کتاب کو کب اور کہاں دیکھا۔ یاد نہیں کیا جواب ملا۔ اس کے بعد معاصر کے دو نمبر کے بیشتر اوراق مفصل تبصرہ و تنقید کی نذر ہو گئے۔ پروفیسر موصوف اس کے بعد جب کبھی پٹنہ آئے۔ قاضی صاحب کے یہاں نہیں ٹھہرے گو رسمی ملاقات جاری رہی۔

کتابوں۔ ماخذات، حوالہ جات کا معاملہ الگ تھا جیسی طرز طلب کی ضرورت نہیں تھی۔ بے تکلف مانگ بیٹھتے تھے لیکن افراد و اشخاص کے بارے میں قاضی صاحب کا انداز طلب مختلف تھا۔ وضعداری صاف صاف فرمائش کی اجازت نہیں

دیتی تھی۔ ایک مرتبہ فرمانے لگے۔ فیضی صاحب میرے پرانے شناسا ہیں۔ اکثر خط وکتابت رہتی ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ وہ کسی سرکاری کام کے سلسلے میں پٹنہ آنے والے ہیں۔ مجھ سے ضرور ملیں گے لیکن صحیح طور پر معلوم نہیں، کب پہنچ رہے ہیں، کہاں ٹھہریں گے۔ میں سمجھ گیا۔ میں نے کہا، میرے کالج کے پرنسپل ہی تو سکریٹری ہیں۔ اس وقت فیضی صاحب بمبئی کے لا کالج کے پرنسپل تھے۔ جب وہ جلسے کے کمرہ سے نکلے، میں نے کہا، قاضی صاحب سے تو آپ ضرور ملنا چاہیں گے۔ کہنے لگے، میں پٹنہ آؤں اور قاضی صاحب سے نہ ملوں۔ میں نے پتا بتلایا۔ دونوں فضلا میں ملاقات ہوئی۔ میں بھی موقع پر موجود تھا۔ لیکن نہ معلوم کیوں جو گفتگو دیر تک ہوتی رہی اور جس کا موضوع مخطوطات تھا جو کہ بالخصوص ایک خاص قسم کے مذہبی موضوعات پر تھیں اور پردۂ خفا میں مستور رکھی گئی تھیں، ان کا منظر عام پر لانا، اصل متن کی صحت پر زور، اچھی طرح انہیں شائع کرنا وغیرہ وغیرہ، یہ سب کچھ مجھے خشک معلوم ہوا۔ حالاں کہ بہت کام کی باتیں دیر تک ہوتی رہیں۔ میں بیٹھا رہا۔ کسی حد تک بیدلی سے سنتا رہا۔ اس کے برعکس منوہر سہائے انور اور قاضی صاحب کی دیر تک مسلسل گفتگو میرے لئے بڑی دلچسپ اور خاصی پر معلومات تھی۔

جب انور صاحب پٹنہ پہونچے اور کتب خانہ میں وارد ہوئے تو مجھ سے بھی ملاقات ہوئی۔ قاضی صاحب کے بارے میں پوچھا۔ میں انہیں لے کر کھجور پوکھر والے مکان پر پہنچا۔ انور صاحب سگریٹ کے عادی تھے۔ جب ان کا ذخیرہ ختم ہو گیا تو باوجود اس کے کہ قاضی صاحب خود سگریٹ نہیں پیتے، نہ کسی کو پیش کرتے ہیں ان کے لئے خاص طور سے منگا لیتے تھے۔ وہ خانِ آرزو کے مجمع النفائس پر کام کر رہے تھے۔ اس ضخیم تذکرہ کے متعلق قاضی صاحب نے اتنی باتیں بتلائیں جو مجھے معلوم نہ تھیں۔ منجملہ اور باتوں کے کہا کہ اگر اس کتاب سے تاریخی مواد کی تنقیح و تجمیع کی جائے تو ایک خاصی کتاب تیار ہو سکتی

ہے۔ پھر خان آرزو کی دوسری خصوصیات پر باتیں چلتی رہیں۔

قاضی صاحب مولانا عرشی رامپوری، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی ثم الہ آبادی، ڈاکٹر حافظ محمود شیرانی، ڈاکٹر نذیر احمد صدر شعبۂ فارسی کے ہمیشہ معترف و معترف رہے۔ ایک موقع پر موخر الذکر کے متعلق مجھ سے کہنے لگے کہ موجودہ عہد میں ہند و پاک میں اس پایہ کا تفتیش و تلاش کا دلدادہ، کوشش و کاوش سے ٹھوس علمی تحقیق کام کرنے والا شاید ہی کوئی دوسرا ہو۔ علی گڑھ کی ہسٹری کانفرنس کا جب پہلا اجلاس علی گڑھ میں منعقد ہوا تو الطاف بریلوی مدیر مصنف نے چند اشخاص کو چار کی دعوت دی تھی مولانا امتیاز علی عرشی، ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی اور کئی دوسرے حضرات شریک دعوت تھے۔ نہ معلوم راقم السطور پر بھی بریلوی صاحب کی نظر کیوں کر پڑ گئی۔ پروفیسر قریشی سے مورلینڈ کی دو کتابوں پر ہندوستان عہد اکبر اور عہد اورنگ زیب میں تبادلۂ خیال کر رہا تھا اور انہوں نے نہایت واضح طور پر اپنے خیالات ان کتابوں اور ان کے مصنف کے متعلق بتائے۔ جب بات کچھ رکی تو مولانا عرشی مجھ سے مخاطب ہوئے۔ قاضی صاحب کی خیریت اور حالات کے بارے میں پوچھا۔ یاد نہیں میں نے کیا کہا۔ البتہ اتنا اب تک یاد ہے کہ مولانا موصوف نے بڑے پیارے انداز سے فرمایا: میں صرف ایک شخص سے ڈرتا ہوں اور وہ یہی آپ کے قاضی صاحب ہیں۔ قاضی صاحب کی تنقید میں دل آزاری، استہزا، بدگوئی اور کسی قسم کی ذاتی عصبیت اور ہٹ دھرمی کا شائبہ نہیں ہوتا۔ ان کی تنقیدیں تخریبی نہیں تعمیری ہی کہی جا سکتی ہیں۔ ان کی جھبرانہ نقادانہ نظر نقائص پر ہی مرکوز نہیں رہتی، لیکن جب جس چیز کو وہ خامی اور کمزوری سے خالی نہیں سمجھتے ہیں اور وہ ان کے سامنے آجاتی ہے تو ان کی زبان اور قلم رواں دواں ہو جاتے ہیں گفتار آگے چل کر تحریر کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ کچھ لوگ شاید اسے خوردہ گیری سمجھیں لیکن

قاضی صاحب اپنی ذہنی افتاد، فکری مزاج، تحقیقی رجحانات سے مجبور ہو کر زبان وقلم سے کام لینے لگتے ہیں۔ ظاہر داری، تکلف اور بیجا طرف داری سے انہیں نفور ہے۔ علمی تحقیقی، تاریخی ادبی امور پر خاموشی انھیں طبعاً ناپسند ہے لیکن لفظی نزاع، بحث و تکرار، رد وقدح، جواب، جواب الجواب کے مروجہ طریقوں سے وہ کوسوں دور رہتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی اوچھی باتوں پر وہ کسی سے الجھنا پسند نہیں کرتے۔ انہیں اس کا احساس ہے کہ بھول چوک تقاضائے انسانیت ہے۔ غلطیوں کی گرفت کا سب کو حق ہے۔ خود اپنے شائع شدہ مقالات کا غلط نامہ شائع کرتے ہیں۔ اپنی باتوں پر دوسروں کی حرف گیری کو ٹھنڈے دل سے سننا اور غور کرنا چاہتے ہیں۔ شوکت سبزواری اور خلیق انجم نے جب قاضی صاحب کی کچھ فروگذاشتوں پر انھیں ٹوکا بلکہ کچھ ناروا انداز اور غیر مناسب الفاظ کے استعمال سے بھی دریغ نہیں کیا تو جہاں تک مجھے علم ہے، قاضی صاحب کی طرف سے کوئی گرفت یا گرفتہ خاطری عمل میں نہیں آئی۔ ایک بااصول، باریک بین، نکتہ سنج نکتہ چیں اپنی اصابت رائے پر بیجا زور نہیں دیتا، اپنے تحریری خیالات کو حرف آخر سمجھتا ہے نہ دوسروں پر تھوپنا اور منوانا مناسب سمجھتا ہے۔ وضعداری، تلخ کلامی، دل آزاری کی اجازت نہیں دیتی۔ قاضی صاحب کو تنگ نظری، رعونت اور کسی قسم کی سطحیت اور چھوٹاپن سے متہم نہیں کیا جاسکتا۔

قاضی صاحب ہمیشہ کچھ نہ کچھ پڑھتے ہی رہتے ہیں۔ موضوع و مضمون کی قید نہیں۔ ہلکی پھلکی ادبی کتابیں ہوں یا وزن دار بھاری بھرکم علم و فضل سے مملو۔ کئی زبانوں سے واقف ہیں۔ یہ بات مجھے ان کے بھائی قاضی سعید صاحب مرحوم سے معلوم ہوئی جب میں نے ہندوستان کے زمانہ وسطی کے مذہب و ثقافت پر ایک کتاب منگوائی اور وہ فرانسیسی زبان میں نکلی تو مجھ پر مایوسی اور اشتیاق کی ملی جلی کیفیت طاری ہوئی۔ قاضی سعید مرحوم

سے میری بہت بے تکلفی تھی۔ ہم دونوں اکثر علمی کاموں کے سلسلے میں سفر و حضر میں ساتھ ساتھ رہتے تھے۔ وہ خود سات سال برلن میں رہ کر جرمنی زبان سے واقف ہو گئے تھے۔ اور جرمن بول سکتے تھے۔ کہنے لگے۔ بھیا سے کہئے۔ وہ تو فرانسیسی زبان بھی طرح سے جانتے ہیں بلکہ کچھ اور مغربی زبانوں سے بھی ناآشنا نہیں ہیں۔ میری ہمت اس کی متقضی نہیں تھی کہ قاضی صاحب کو تکلیف دوں۔ میں نے ان سے اس کا کچھ ذکر ہی نہیں کیا۔ قاضی سعید مرحوم سے بھی معلوم ہوا کہ قاضی صاحب کا کیمبرج میں خاص موضوع معاشیات اور سیاسیات کے علاوہ تاریخ بھی تھا۔ اور انھوں نے بہت سی کتابیں ان موضوعات پر پڑھ ڈالی تھیں اور یہ کہ لندن کے دوران قیام میں بھی فارسی اردو ادب سے شیفتگی اور فکر و مطالعہ برقرار تھا۔ یہی وجہ ہے کہ موصوف اپنی گفتگو میں مختلف مباحث پر کچھ نہ کچھ روشنی ڈالتے رہتے ہیں۔ میں سنتا اور استفادہ کرتا رہتا ہوں۔ قاضی صاحب کی مسہری ان کا ٹیبل ہے۔ اسی پر بیٹھ کر وہ لکھتے ہیں۔ اردگرد کتابوں کا ڈھیر کچھ بے ترتیبی کے ساتھ دکھائی دیتا ہے۔ ان کتابوں کی زبان مختلف، موضوع متنوع ہوتا ہے۔

پروفیسر نذیر حسن عابدی دہلی کالج میں لکچرر تھے۔ پٹنہ آئے اور میں خود ان سے کتب خانہ میں ملا۔ قاضی صاحب کے بارے میں دریافت کیا۔ میں انھیں لے کر قاضی صاحب کے دولت کدے پر پہنچا۔ بڑی دلچسپ اور کام کی باتیں ہوتی رہیں۔ عابدی صاحب غالب کے فارسی کلام پر کام کر رہے تھے۔ کتب خانہ میں دیوان اور متفرقات کلام فارسی کا مطالعہ کر رہے تھے۔ ظاہر ہے قاضی صاحب کی یہ خاص دلچسپی کا موضوع تھا۔ عابدی صاحب بھی بڑے ذہین تحقیقی کام کرنے والے تھے۔ ایک ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ گرمیوں کے ایام تھے اور آم کا زمانہ۔ ایک روز مجھ سے کہنے لگے، قاضی صاحب نے ایک ٹوکری نہایت عمدہ آموں کی میرے پاس بھیج دی ہے۔ میں نے بڑے شوق سے انہیں کھایا۔ شب کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ سوچا، غالب کی طرح اظہار تشکر فارسی نظم میں کروں۔ ایک

چھوٹے موٹے قصیدہ کی شکل ہو گئی تھیں۔ نے کہا کہ اگر آپ کو کچھ تذبذب ہو تو مجھے دیجئے، پہنچا دوں گا۔ بالآخر یہ فارسی نظم قاضی صاحب کے ہاتھ میں پہنچ گئی۔ کہنے لگے، مجھے جائے قیام کا پتا تو بتلایا تھا۔ پتا نہیں، کب تک ٹھہریں گے۔ مجھے سوجھ گئی۔ عابدی صاحب سے ملا دو۔ کہا۔ آپ پھر قاضی صاحب کے یہاں کیوں نہیں گئے۔ ضرور جائیے۔ دوم تبہ قاضی صاحب اپنے سب سے چھوٹے بھائی پروفیسر فریدا ور ان کے بچوں سے ملنے کے لئے پاکستان گئے۔ واپس آئے۔ میں نے وزیرالحسن عابدی صاحب کے بارے میں پوچھا۔ کہنے لگے، ایران سے واپس ہو کر لاہور کے کالج میں ہیں اور اچھے ہیں۔ مجھ سے ملنے کے لئے آئے تھے۔

ابھی چند دنوں کی بات ہے، قاضی صاحب کتب خانہ خدابخش مرحوم میں پہلے سے موجود تھے۔ میں بھی پہنچا اور میز کی دوسری طرف کی کرسی پر بیٹھ کر جناب امیر خسرو کے رسائل الاعجاز کی ورق گردانی کرنے لگا۔ قاضی صاحب کسی دوسری کتاب پر آنکھیں جمائے ہوئے تھے۔ لیکن بیچ بیچ میں کسٹوڈین اور مجھ سے کچھ باتیں بھی کر لیتے تھے۔ میں نے انہیں مخاطب دیکھ کر کہا، اگر مثنوی نہ سپہر کے مصنف خزائن الفتوح یا مفتاح الفتوح میں، جس میں جنگ و فتوحات کا تذکرہ ہے۔ ہندوؤں کو بدکیش زاغ رد وغیرہ وغیرہ کے الفاظ سے یاد کرتے ہیں تو اس کا کچھ جواز بھی ہو سکتا ہے لیکن رسائل میں جو صنائع بدائع کی کتاب ہے جس میں وہ لفظوں سے کھیلتے ہیں اور جس میں کافروں سے جھڑپ اور جنگ و جدل کا ذکر نہیں ہے۔ کیوں زیادہ کر کے ناسزا، نامناسب، غیر واجب، قابل اعتراض الفاظ سے اغماض نہیں کیا۔ میں نے یہ بھی کہا کہ غنیمت ہے کہ دواوین خسرو میں جو اس تاجدار نظم و سخن کی خاص چیز ہے اور جن سے اس کی فنی عظمت اور شاعرانہ انفرادی بلند پائیگی ظاہر و باہر ہے، ایسی باتیں نہیں ملتیں۔ کہنے لگے خسرو کا دیوان بھی ایسی باتوں سے بالکل خالی نہیں۔ میں نے خود کسی جگہ ایک قطعہ دیکھا تھا جس میں ہندوؤں کے متعلق طنز و

تضحیک کے الفاظ تھے۔ قاضی صاحب کے کتب خانہ سے چلے جانے کے بعد میں نے ایران و نول کشور کے چھپے ہوئے نسخوں کو کھنگالا۔ مجھے کچھ ایسی چیز نہیں ملی۔ خیال ہوا کہ مخطوط نسخوں کی ورق گردانی کر لی جائے۔ مجھے ایک قطعہ مل گیا جو اس شعر سے شروع ہوتا ہے ؎

بزد کہ سجدہ کنند ایں برہمن عجمی
ہمہ بنات کہ محراب چشم ہر صنمی

اس کے بعد کا یہ شعر ہے ؎

درآب و آئینہ بینی ہمیشہ صورت خویش
کہ آفتاب پرست و بت پرست ہمی

چوتھے شعر میں فرماتے ہیں ؎

دریغ نیست کہ سوزند ہند داں خود را
ز دوستیت کہ چون سومنات محترمی

مقطع کے پہلے کا شعر بھی جاذب نظر تھا ؎

سیاہ تختۂ ہند و بود سپید رقم
تو در سیاہی ازاں در سفیدئ رقمی

معلوم نہیں اس قطعے کی طرف اشارہ تھا یا کسی اور ٹکڑے کی جانب۔ اس ضمن میں پھر کوئی بات قاضی صاحب سے نہ ہوئی اور نہ میں نے کلیات کے دیگر اوراق پر نظر ڈالنے کی ضرورت سمجھی۔

فارسی و اردو کے علاوہ انگریزی کی بھی کتابیں مختلف علوم عقلی و نقلی کی قاضی صاحب کے زیر مطالعہ رہتی ہیں۔ معیاری انگریزی ناولوں کا بھی چرچا ہوتا ہے۔ اور ان کے

مقابلے میں اردو کے ناول نویسوں، افسانہ نگاروں کی پرکھ اور پرکھارت پر خیال آرائی کی جاتی ہے۔ جب مجھے پہلی بار معلوم ہوا کہ قاضی صاحب انگریزی اور اردو ناولیں بھی پڑھتے ہیں تو کسی حد تک حیرت زدہ ہوا۔ قاضی صاحب کی شفقت کا کمال نہیں ہو سکتا میں ناول خوانی کو ان کے مطالعہ، غور و فکر اور تحقیق علمی کے دائرہ سے باہر سمجھتا تھا۔ یہ میری غلط فہمی تھی۔ مقصود بالذات نہیں بالفرض تھا۔ وقت گزاری، لطف اندوزی کا جذبہ نہیں تھا بلکہ صاحب تصنیف کی سیرت و کردار کے مطالعہ زمان و مکان کی سیاسی، سماجی، معاشرتی، اقتصادی حالات کی عکاسی سے دلچسپی تھی۔ قاضی صاحب کے فضل و کمال، وقت نظر، تحقیق و تدقیق، وسیع النظری، ہمہ گیری، وسیع القلبی کی جھلکیاں ان کے پر جوش مسلسل گفتار سے ملتی ہیں۔ جب اپنوں کے مقابلے میں غیروں اور دور دراز والے بیگانوں، اہل قلم اور ان کی باتوں اور خصوصیات کی جائز مدح سرائی کرتے ہیں، بالعموم اور بالطبع وہ کسی فرد کی تعریف نہیں کرتے، خاص کر اس کے سامنے اس کے برعکس۔ اگر ان کے پاس آکر کوئی شخص کچھ بیجا بات یا حرکت کر بیٹھتا ہے تو باوجود اپنی فطری خوش خلقی، سنجیدگی۔ انصاف پسندی کے اسے ٹوک دیتے ہیں۔ کبھی کبھی غصہ کی حالت بھی طاری ہو جاتی ہے۔ جھلا اٹھتے ہیں لیکن حد اعتدال سے آگے نہیں بڑھتے اور تھوڑی دیر میں نرم پڑ جاتے ہیں۔

قاضی صاحب متبحر عالم ہی نہیں، صحیح معنوں میں ایک انسان اور ولی بھی ہیں۔ اپنی سیرت و کردار، عادات و اطوار، وضع و رویہ، گفتار، آؤ بھگت، نشست و برخاست میں بلاشبہ وہ کسی حد تک خشونت طبع، سوکھے روکھے، ناآشنا مزاج، اپنے دہن، کشیدہ اور اپنے تیکھے تیور کی وجہ سے بارعب دکھائی دیں گے۔ مگر دراصل وہ ایسے ہیں نہیں۔ میں ضرور ہمیشہ ان سے مرعوب رہا۔ حالانکہ بہت قریب سے دیکھ کر مجھے ان کے دلآویز دلفریب پہلو اور خلوص، فراخدلی، ایثار، شفقت جیسی خصوصیات پر بھی نظر پڑی کبھی کبھی جب قاضی

صاحب اپنی موٹر میں کتب خانہ بغرض مطالعہ یا کسی اہم کام کے لئے آتے ہیں تو چھوٹے چھوٹے لڑکے لڑکیوں کا ایک جھنڈ بھی ان کے ساتھ ہی پہنچتا ہے۔ وہ تو اندر چلے جاتے ہیں اور بچے میدان میں کھیلتے رہتے ہیں۔ جب نکلے وہ سب لپک کر موٹر پر چڑھ دوڑے۔ کبھی ایسا بھی ہوا کہ ہم ان کے سامنے بیٹھے ہوئے چائے ناشتہ میں مشغول ہیں۔ رکابیوں تشتریوں میں کچھ بسکٹ اور مٹھائی موجود ہے۔ دفعتاً کچھ بچے اوپر چڑھ کر کمرے میں داخل ہو کر صوفوں پر بیٹھ جاتے ہیں اور قاضی صاحب ہر ایک کو کچھ ٹکڑے برتنوں سے نکال کر دیتے جاتے ہیں اور وہ لے کر خوش خوش واپس ہو جاتے ہیں۔ ایک مرتبہ شاید میں اکیلا ہی تھا کہ ایسا واقعہ ہوا۔ میں نے دبی زبان سے کہا کہ کاش کہ یہ بچے آپ کے اپنے ہوتے۔ دبی زبان سے صرف اتنا کہا "یہ تو ہے" ان تین لفظوں میں جو حسرت پنہاں تھی اس کا کچھ اندازہ صاحب دل کو ہی ہو سکتا ہے بات بڑھانے کی مجھے جرأت نہیں ہو سکی۔

کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ قاضی صاحب ایک عملی انسان نہیں ہیں، باوجود جمعیت خاطر جامع کمالات ہونے کے، کوئی مستقل یادگار کسی مکمل گرانقدر تصنیف کی صورت میں پیش کرنے کا انہیں کبھی احساس ہی نہیں ہوا۔ یقیناً صاحب متمول ہیں۔ اس لئے ملازمت کا تو سوال ہی نہ تھا۔ پریکٹس شروع کی تھی لیکن جاری نہیں رکھی۔ اہل وعیال کی جھنجھٹوں کا بھی سامنا نہیں کرنا پڑا ان کے اکلوتے نہایت سعادت مند باصلاحیت صاحبزادے قاضی مسعود کی تعلیم و تربیت کا بھار ان کے نانا شاہ رشید اللہ صاحب پر تھا جو ایک بڑے کامیاب وکیل تھے۔ ماشاء اللہ ایم۔ اے۔ بی۔ ایل ہیں۔ لیکن نانا کے باوجود سارے لوازمات کی موجودگی کے ان کی جگہ پر نہ کر سکے۔ آرام سے تجرد کی زندگی گذار رہے ہیں۔ میں نے دو ایک بار قاضی صاحب کی توجہ ان باتوں کی طرف مبذول کرانے کی کوشش کی۔ کچھ نتیجہ

نہیں نکلا۔ اور میں نے بھی حوادث سے آگے بڑھنا مناسب نہیں سمجھا۔ قاضی صاحب کی اہلیہ محترمہ زیادہ تر علیل ہی رہتی ہیں۔ علاج معالجہ میں کوئی کوتاہی نہیں ہوئی۔ اپنی نجی باتوں اور گھریلو زندگی کے امور کے متعلق نزدیک ترین لوگوں سے بھی اشارۃً تک نہیں کرتے اور نہ کچھ سننا چاہتے ہیں۔ پتا نہیں، مہمان نوازی میں کس حد تک ان کی اہلیہ محترمہ کا اشتراک عمل رہتا ہے۔ ایک مرتبہ میں قاضی صاحب کے یہاں بھنوپورہ کھر والے مکان پر پہنچا۔ قاضی صاحب کہیں گئے ہوئے تھے۔ میں واپس لوٹا۔ ابھی پھاٹک تک ہی پہنچا تھا کہ ملازمہ جلد جلد سیڑھی سے اترتی آواز دیتی دکھائی دی۔ کہا رکئے۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ پاس آکر اس نے کہا۔ بیگم صاحبہ نے آپ کو تکلیف دی ہے۔ اوپر چل کر ۱۳ رجب کے کونڈا اور نیاز میں شرکت کر لیجئے۔ مجھے یاد نہیں تھا کہ یہ حضرت علی ابن ابی طالب کی ولادت کا دن ہے۔ قاضی صاحب کی خوش دامن صاحبہ بقید حیات تھیں اور ایک خانقاہی خاندان سے ہونے کی وجہ سے جناب امیر علیہ السلام سے بڑی عقیدت رکھتی تھیں۔ قاضی صاحب کو ان سب باتوں سے کوئی واسطہ نہ تھا۔

ذاتی علم و فضل، خاندانی وضعداری، رکھ رکھاؤ بھی بیجا بات طنز، ہنسی مذاق یا الفاظ و لہجہ کی کرختگی کے منافی تھی غیر مناسب تھی۔ قاضی صاحب کے بارے میں کوئی شخص قہقہہ کا تصور ہی نہیں کرسکتا ہے۔ میں نے تو کبھی انھیں کھل کر مسکراتے بھی نہیں دیکھا۔ حالانکہ ان کے بڑے پیارے منجھلے بھائی قاضی سعید مرحوم کا گورا سرخ و سفید چہرہ زیر لب تبسم سے کبھی خالی نہیں رہتا تھا۔ قاضی صاحب کو ان کی بے وقت اور غیر متوقع رحلت سے بڑا دھچکا لگا۔ مجھے جب اس سانحے کی خبر ملی، بھاگا بھاگ پہنچا۔ دیکھا، قاضی صاحب خاموش بیٹھے ہوئے تھے۔ مرحوم کے ملنے والے اور ان کی قومی خدمتوں کے معترف بہت لوگ بیٹھے تھے۔ کچھ لوگ انتظامات میں مصروف تھے۔ اور زیادہ تر میری طرح

چپ اور غمزدہ تھے۔ نماز جنازہ اور تدفین تک جو قریباً آدھی رات کے وقت ختم ہوئی ہم سب نے قاضی صاحب کو ایک ہی حالت میں پایا۔ قل کے روز میں ایک کمرہ میں اوروں کے ساتھ قرآن مجید کی تلاوت بہر ثواب کر رہا تھا۔ دوسرے کمرے میں کچھ عمائدین شہر کے ساتھ قاضی صاحب بیٹھے تھے۔ دفعتاً بلند آواز سے کوئی گریہ کناں ہوا۔ میں نے اٹھ کر دیکھا۔ قاضی صاحب پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے۔ انتہائی کوشش کے باوجود صبر و ضبط کا یارا نہیں رہا۔ تقاضائے بشریت نے اثر دکھایا۔

قاضی صاحب نہ مذہبی آدمی ہیں نہ مذہب سے بیزار۔ روشن دماغ آزاد خیال ہیں۔ حسب عادت اگر کوئی مذہبی مسئلہ گفتگو کے درمیان آجاتا ہے تو نہ وہ اہل سنن کو بخشتے ہیں نہ اہل تشیعہ کو اور اہل تصوف کے بارے میں تو بعض وقت بہت سخت کڑی کڑی باتیں کہہ جاتے ہیں۔ میں نے صرف حضرت مخدوم شرف الدین بہاری کے خلاف تو کبھی کوئی بات ان کی زبان سے نہیں سنی۔ بڑے بڑے صوفی مشائخ ان کی تعریض سے نہیں بچے۔ ایک دفعہ مجھ سے کہنے لگے۔ آپ لوگ اماموں کو نبیوں پر بھی فوقیت دیتے ہیں۔ میں نے بڑے ادب سے اختلاف کیا۔ پہلے تو ایک مشہور مقامی شاعر کا جو شیعہ ہیں، حوالہ دیا۔ میں اپنی بات پر مصر رہا اور جواباً کہا کہ بعض حضرات کی گفتگو اور اقدام فضا کو دیکھ کر ہوتا ہے۔ میں نے پوچھا کہ کیا آپ نے کسی کتاب میں ائمہ اثنا عشر کے بارے میں لکھا دیکھا ہے کہ ان پر وحی اترتی ہو۔ کہا وحی تو نہیں، الہام تو ہوتا ہی تھا۔ میں نے کہا، دونوں میں بڑا فرق ہے۔ پھر بات پلٹ گئی اور مسائل اٹھ کھڑے ہوئے۔ جیسے عقد ام کلثوم اور سکینہ بنت الحسین کے بارے میں عبدالحلیم شرر کی شر افشانی قاضی صاحب نے مستند کتب سے کچھ دلائل کے علاوہ مفتی محمد عباس اور کچھ عراقی علماء کی کتابوں کا حوالہ دیا۔ قاضی صاحب نے تردیک آیات بینات کے مقابلہ میں آیات محکمات۔ کشف الظلمات یا ابی الحمرات

جیسی جرابی کتابوں کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے حالانکہ اس کا نام انھوں نے کبھی نہیں لیا۔ بات ختم ہوئی۔ خلفاء کے معاملے میں ان کی رائے عام اہل سنن کے عقائد سے کلی طور پر شاید نہیں ملتی لیکن کبھی وضاحت سے اس پر گفتگو نہیں کی۔ علی العموم مذہبی معاملوں پر بحث و تمحیص انھیں بہت ناپسند ہے لیکن بات جب چھڑ جاتی ہے تو صاف گوئی سے اپنا خیال ظاہر کر کے گفتگو کا سلسلہ بند کر دیتے ہیں۔ نماز روزہ کی پابندی ضروری نہیں سمجھتے۔ کچھ لوگ انھیں لامذہب سمجھتے ہیں۔ مگر میرا خیال مختلف ہے۔ ماحول اور قدیم روایات سے کلی طور پر چھٹکارا نہ پا سکے۔ قاضی صاحب بہتیرے باایمان مسلمان ہیں اور مسلمانوں کے عقیدے کو کبھی وہ اس کا اعتراف نہیں کرتے ایمان و اسلامیت سے بھی بڑی چیز ان کے نزدیک آدمیت اور انسانیت ہے۔ فی الحقیقت آدمی اور انسان ہونا بہت مشکل امر ہے۔ کسی نے سچ کہا ہے

سخت دشوار ہے انساں کا انساں ہونا۔

سید شاہ عطاء الرحمٰن

قاضی عبدالودود کا ننھیالی خاندان

قاضی صاحب کے دادیہالی خاندان سے متعلق میری معلومات گویا نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اس لئے اس پر میں روشنی نہیں ڈال سکتا اور مجھے افسوس ہے کہ اس موضوع پر شاید کوئی لکھنے والا بھی نہیں سوائے اس کے کہ خود قاضی صاحب اس موضوع پر کچھ لکھ سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں صرف اتنا بتا سکتا ہوں کہ قاضی صاحب کے پردادا جناب قاضی محمد اسمٰعیل ساکن بخشی محلہ پٹنہ کی شادی جناب قاضی اسد علی ساکن دولت پور ضلع گیا کی لڑکی سے ہوئی۔ قاضی اسد علی کے آبا و اجداد چھ پشتوں تک مسند قضا پر فائز رہے:۔ قاضی اسد علی۔ قاضی رحمت اللہ عرف پیر علی۔ قاضی احمد اللہ۔ قاضی سلام اللہ۔ قاضی غیاث الدین۔ قاضی صدر جہاں۔ قاضی اسد علی کی وفات ۱۲۷۴ھ میں ہوئی۔ [1]

قاضی عبدالودود کے پرنانا حاجی سید شاہ محمد مبین کاکوی کی بھی شادی قاضی اسد علی کی ایک دوسری صاحب زادی سے ہوئی اس رشتے سے قاضی صاحب موصوف کے پرنانا اور پردادا دونوں ہم زلف تھے۔

قاضی محمد اسمٰعیل کے ایک بیٹے قاضی عبدالحمید ہوئے ان کی شادی موضع

---

[1] قاضی اسد علی کے حالات دیکھیے تذکرۂ صادقہ مصنفہ مولوی عبدالرحیم صادق پوری و تاریخ کملا مصنفہ احمد کبیر

جبرو امتصل حاجی پور ہوئی ان کے بیٹے قاضی عبدالوحید ہوئے ان کی شادی سید شاہ حاجی لطف الرحمٰن (ابن سید شاہ محمد مبین) کی صاحبزادی سے ہوئی (جن سے تین بیٹے قاضی عبدالودود، قاضی محمد سعید اور قاضی محمد فرید اور ایک لڑکی)

اب مجملاً یوں سمجھیے کہ قاضی عبدالودود صاحب کے پردادا اور پرنانا دونوں ہم زلف تھے اور قاضی صاحب کے نانا اور دادا دونوں خالہ زاد بھائی ہوئے پھر قاضی صاحب نے والد ماجد قاضی عبدالوحید، قاضی صاحب کے نانا شاہ لطف الرحمٰن کا رشتہ میں بھتیجا اور داماد بھی ہوئے۔ قاضی عبدالحمید کی ایک صاحبزادی یعنی قاضی صاحب کی پھوپھی کی شادی قاضی عبدالمجید ساکن باڑھ ضلع پٹنہ سے ہوئی

یہاں پر یہ بات بھی لکھ دینی مناسب ہے کہ قاضی اسد علی کی دوسری شادی قاضی صاحب کے پرنانا شاہ مبین متوفی ۱۲۹۳ھ[1] کے دادا سید شاہ نعیم اللہ متوفی ۱۲۰۴ھ کی صاحبزادی سے ہوئی تھی۔ اس لحاظ سے قاضی صاحب کے دادیہالی اور نانیہالی سلسلہ میں رشتہ مصاہرت کئی پشتوں سے چلا آرہا ہے۔

اب قاضی صاحب کے نانیہالی خاندان کا حال سنیے۔

یہ خاندان حضرت موسیٰ رضا علیہ السلام کے واسطے سے حضرت سرور کائنات تک منتہی ہوتا ہے اسی لئے رضوی سادات کہلاتا ہے۔ روایتاً مشہور

---

[1] قسطاس البلاغۃ مصنفہ مولانا محمد سعید حسرت عظیم آبادی

ہے کہ یہ خاندان ہندوستان میں مشہد مقدس سے آیا غالباً یہ وہی زمانہ ہوگا جب کہ حضرت امام تاج فقیہہ علیہ الرحمۃ فاتح منیر، بہار آئے اور بختیار خلجی کے تسلط کے بعد اکثر مہاجرین بہار کے قریہ قریہ میں سکونت پذیر ہوتے گئے دورِ خلجی اور دورِ تغلق میں بہار کا علاقہ بزرگان دین اور علمائے متین کا گہوارہ رہا ہے۔ منیر، بہار، پٹنہ، کاکو، تو ایک دوسرے سے اتنا وابستہ تھے گویا ایک ہی سلسلہ کی کڑیاں ہوں۔ پٹنہ میں حضرت شہاب الدین پیر جگجوت، منیر میں ان کے داماد حضرت یحییٰ منیری، بہار میں پیر جگجوت کے نواسے، حضرت مخدوم الملک شرف الدین بہاری، کاکو میں پیر جگجوت کی صاحب زادی مخدومہ حضرت بی بی کمال قدس سرہا اپنے اپنے وقتوں میں صاحب رشد و ہدایت ہستیاں تھیں۔ اسی دور میں اور دیگر مقامات میں بھی بزرگان دین آتے گئے اور اپنے رشد و ہدایت سے عرب و عجم کے لوگوں کو فیض یاب کرتے رہے۔ زیر بحث خاندان ایک ایسے ہی کورده موضع سیودھا میں (جو غالباً سید ہا کی تصحیف ہے) آکر آباد ہوا۔ اور اپنی سیادت و نجابت، فقر و سلوک، اور رشد و ہدایت کے اعتبار سے معزز و ممتاز تھا۔ ان بزرگوں کے نام نامی اور اسمائے گرامی پرانے سفینوں اور نذر و نیاز کے وسیلے سے جو معلوم ہو سکے ہیں وہ یہ ہیں :-

حضرت مخدوم شاہ معظم، و شاہ اعظم، شاہ بدر عالم، شاہ موہن و شاہ بہلاد (؟)۔ مخدوم حاجی شاہ بٹے قدس سرہا یہ اوپر کے بزرگ ہیں ان کے بعد دو نام اور ملتے ہیں۔ مخدوم شاہ صفی اللہ و مخدوم شاہ شفیع اللہ۔ یہ سب بزرگان اسی موضع سیودھا میں آسودہ

ہیں۔ ان کے مزارات قرب و جوار میں مشہور و معروف تھے۔ سیوہ دھا ایک ندی وردھا کے کنارے پن پن اور ترگنا اسٹیشن کے درمیان پٹنہ سے سات کوس پر واقع ہے۔ راقم الحروف کے سن شعور تک اس بستی سے خاندانی تعلق تھا۔ اکثر آنا جانا لگا رہتا وہیں قیام رہتا۔ آبائی مکان حال تک قائم تھا۔ کاشتکاری اور زمینداری کا سلسلہ بھی تھا اب بالکل مسدود ہو گیا۔ اب صرف بزرگوں کے مزارات کے سوا کچھ باقی نہیں۔

اسی خاندان کے ایک بزرگ حضرت حاجی محمد سید شاہ عبدالرحمٰنؒ ساکن موضع سیوہ دھا پرگنہ سانڈہ ضلع پٹنہ تھے آپ کے والد ماجد کا نام سید شاہ عبدالحی اور دادا کا نام سید شاہ فرید تھا۔ ان دونوں بزرگوں کا مزار بھی اپنے آبائی قبرستان سیوہ دھا میں واقع ہے شاہ عبدالرحمٰنؒ کی شادی کاکو کے ایک بزرگ حضرت شیخ شمس الدین دوانقیؒ کے خاندان میں ہوئی۔ حضرت شمس الدین بغداد کے ایک قریہ دوانق کے باشندہ تھے۔ وہیں سے کاکو تشریف لائے ان کا روضہ پختہ آج بھی کاکو میں موجود ہے اور شمس روضہ کے نام سے موسوم ہے۔ اس خاندان کے جدید تعلیم یافتہ لوگوں نے اپنے نام کے ساتھ شمسی کا اضافہ اسی نسبت سے کیا ہو بہرکیف اسی خاندان کے اگلے بزرگوں میں یعنی حضرت شیخ شمس الدین کے پرپوتے شیخ عبدالرحمٰن تھے۔ ان کی صاحب زادی سے حضرت سید شاہ عبدالرحمٰن سیوہ دھوی کی شادی ہوئی۔ شادی کے بعد شاہ صاحب موصوف سسرال باشی ہو گئے۔ کاکو ہی میں سکونت اختیار کر لی گویا اس خاندان کے سب سے پہلے بزرگ یہی ہیں جو سیوہ دھا سے کاکو آ کر سکونت پذیر

ہوئے۔

حضرت والد ماجد سید شاہ محفوظ الرحمٰن حمد کاکوی نے انہی بزرگ کے متعلق اپنی کتاب یادگار کاکو میں رقم فرمایا ہے کہ ؎

آٹھ پشتوں سے ہوں یہیں آباد
جدِ اعلیٰ تھے کاکو کے داماد

اب تو دسویں پشت ہوگئی۔

شاہ عبدالرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ شیو دھوی ثم کاکوی کے اوپر کے بزرگوں کے صرف نام ہی نام ہیں کوئی نشان نہیں اور نہ اب کوئی بتانے والا ہے ؎

وہ جو نامور تھے زمانے میں کہیں ذکر سن لو فسانے میں
مجھے دیر ہوگئی بتانے میں یہی نام ہے کہ نشاں نہیں

ان کے بعد کے اخلاف کے حالات یوں تو بہت ہیں اگر سب بیان کیے جائیں تو دفتر ہو جائے صرف جستہ جستہ ضروری اطلاعات قلمبند کروں گا تاکہ اتنا بھی محفوظ رہ جائے۔

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ آپ کی شادی کاکو کے ایک بزرگ خاندان میں ہوئی۔ آپ حاجی حرمین شریفین تھے اور اپنے وقت کے صاحب رشد و ہدایت و فقر و قناعت تھے۔ فرخ سیر نے اپنے ۳ سنہ سال جلوس میں بطور نذرانہ خرچ خانقاہ کے لیے چند مواضعات محمود پور دیورتھا، احمد پور کرہرا اور چک عبدالرحمٰن وغیرہ میں بذریعہ فرمان شاہی عنایت کیے تھے۔ جو حال تک اس خاندان کے زیر ملکیت تھے آپ کا انتقال کاکو میں ہوا اور ایک سطح مرتفع پر جو خاص خاندانی مقبرہ ہے

اس کے صف اول کے مزاروں میں پہلا مزار آپ ہی کا ہے۔ یہ قبرستان "ڈیہی باغ" کے نام سے موسوم ہے۔ جسکو اب دیہی باغ کہتے۔ آپ کے تین صاحب زادے تھے۔ سید شاہ امان اللہ عرف شاہ مالو۔[۲] سید شاہ عطی اللہ عرف شاہ کالو۔[۳] سید شاہ محمد رومی۔ پہلے اور تیسرے صاحب زادوں سے سلسلہ نہ چلا صرف دوسرے صاحب زادے شاہ کالو سے سلسلہ جاری ہوا۔ ان کا مزار بھی کاکو میں ہے۔

حضرت شاہ عطی اللہ عرف کالو کے تین لڑکے تھے۔ بڑے سید مجیب اللہ یہ کڑا مانک پور الٰہ آباد میں نہ جانے کس سلسلے میں شہید ہوئے۔ منجھلے بیٹے سید محمد اسحٰق تھے۔ یہ صاحب اولاد تھے مگر ان کی سکونت کاکو میں نہ رہی ادھر ادھر منتشر ہو گئے۔ تیسرے صاحب زادے حضرت سید شاہ حبیب اللہ۔ یہ بڑے پائے کے بزرگ تھے۔ آپ کو بیعت طریقہ قادریہ میں حضرت سید شاہ علی اسلم گویا دل، قلندر صوفی قادری قدس سرہٗ سے تھی۔ جن کا مزار محلہ چنکیا بازار پٹنہ میں ہے۔ آپ کی شادی موضع کھری بازید پور میں جناب حضرت دیوانی شاہ رفیع الدین بلخی قدس سرہٗ کی صاحبزادی سے ہوئی تھی۔ آپ کے کشف و کرامات کے بہت سے واقعات بیان کئے جاتے ہیں۔ آپ کو دربار رسالت سے بہ عالم رؤیا گیارہ خطابات عنایت ہوئے تھے۔ فقیر حبیب اللہ[۱]۔ محرم حبیب اللہ[۲]۔ مخدوم حبیب اللہ[۳]۔ شاہد حبیب اللہ[۴]۔ ہادی حبیب اللہ[۵]۔ حبیب حبیب اللہ[۶]۔ شاہ حبیب اللہ[۷]۔ رحیم حبیب اللہ[۸]۔ کریم حبیب اللہ[۹]۔ قطب حبیب اللہ[۱۰]۔ ولی حبیب اللہ[۱۱]۔

آپ نے دو صغر سن لڑکوں کو چھوڑ کر وصال فرمایا۔ ان دونوں کو

مزار پر انوار سے روحانی تعلیم ملتی رہی۔ ایک کا نام شاہ کلیم اللہ عرف شاہ دھولن، دوسرے کا نام شاہ اہل اللہ عرف شاہ کالن۔

شاہ کلیم اللہؒ کی بیعت اپنے والد ماجد سے سلسلہ قادریہ فردوسیہ میں صغر سنی ہی میں ہوگئی تھی۔ آپ کو فیض روحانی حضرت مخدوم الملک بہاری اور مولانا مظفر بلخی سے بھی حاصل تھا۔ آپ کا قیام زیادہ تر پٹنہ میں محلہ مہراج گھاٹ بیگماں کی حویلی میں رہا۔ راجہ شتاب رائے کی بیٹی ایک بار علیل ہوئی، مشہور تھا کہ آسیب زدہ ہے۔ کچھ بھی ہو دوا کے ساتھ دعا بھی اور تعویذ بھی اس کی برکت سمجھئے وہ اچھی ہوگئی۔ راجہ نے ایک معتد بہ رقم پیش کی یا جاگیر دینا چاہی آپ نے انکار کیا۔ بامرار ایک مکان رہائشی پٹنہ میں ملا۔ آپ نے لاولد پٹنہ میں انتقال کیا۔ نعش کاکو لاکر سپرد خاک کی گئی۔

شاہ اہل اللہ عرف کالن بھی صغر سنی ہی میں اپنے والد ماجد سے بیعت تھے۔ ان کی شادی موضع محسن پور ضلع پٹنہ میں حضرت مخدوم سید منجھن قدس سرہٗ راجگیری کے فرزندوں میں سے ایک حضرت میر صابر علی علیہ الرحمۃ کی صاحبزادی سے ہوئی تھی۔ آپ بھی ورد و وظائف کے بڑے پابند، صاحب رشد و ہدایت تھے۔ مزار کاکو میں آبائی قبرستان میں ہے۔

آپ کے صاحبزادے حضرت شاہ تسنیم اللہ تھے آپ کی بیعت سلسلہ قادریہ فردوسیہ میں اپنے عم حقیقی سے تھی۔ آپ کی شادی موضع لبنا بیگولی متصل دریائے سون ضلع شاہ آباد میں جناب

قاضی سید شاہ غلام اولیا قدس سرہ کی لڑکی سے ہوئی تھی۔ آپ کو فقر و سلوک کے ساتھ اسپ رانی اور فن سپہ گری کا بھی ذوق تھا۔ بابو کنور سنگھ کے والد فن سپہ گری میں آپ ہی کے ممتاز شاگردوں میں تھے آپ نے ، ذی الحجہ ۱۲۶۷ھ میں بمقام کاکو انتقال فرمایا۔

آپ کے دو فرزند تھے ایک سید شاہ امداد حسین دوسرے سید شاہ تبارک حسین۔

جناب سید شاہ امداد حسین (قاضی صاحب کے نانا کے دادا) کو بیعت اپنے والد ماجد سے تھی۔ چونکہ آپ کے والد ماجد اپنی کبر سنی کے باعث باہر تشریف نہیں لے جا سکتے تھے اس لئے ان کی نیابت آپ ہی کرتے اور لوگوں کی بیعت لیتے تھے۔ آپ کی شادی موضع کھر بھبا ضلع پٹنہ میں جناب سید امیر علی قدس سرہ کی لڑکی سے ہوئی تھی۔ آپ بیعت لینے کے لئے گنگا پار (شاید دربھنگہ یا مظفر پور) گئے ہوئے تھے وہیں انتقال ہوا۔ مریدوں نے نعش بذریعہ دریا پٹنہ لاکر سیو دھا پہنچایا اور وہیں اپنے قدیمی آبا و اجداد کے پہلو میں مدفون ہوئے۔

آپ خود بھی رضوی سید تھے اور آپ کی اہلیہ بھی رضوی سیدہ تھیں یعنی حضرت مولانا شاہ نظام الدین رضوی کی اولاد سے تھیں[1] آپ کے حقیقی نانا قاضی سید شاہ غلام اولیا قدس سرہ ساکن لدنا پکولی کا سلسلہ نسب بواسطہ حضرت مخدوم شاہ درویش قدس سرہ بھیوی کے حضرت مخدوم سلطان سید اشرف جہانگیر جھجوی قدس سرہ سے جاملتا ہے

---

[1] دیکھئے ریاض الانوار

آپ کے بھائی سید شاہ تبارک حسین کی شادی موضع ڈیالواں مولوی کاظم علی مرحوم وکیل کی لڑکی سے ۱۲۶۴ھ میں ہوئی۔ سید شاہ تبارک حسین کے صاحب زادے سید شاہ حبیب الرحمٰن عرف شاہ مبارک تلمیذ وحید الہ آبادی تھے اور ان کے صاحب زادے خان بہادر شاہ محمد کمال شاگرد وحید الہ آبادی۔ شاہ مبارک حسین کے نواسے شاہ محمد حسن عرف بسمل شاگرد شاد عظیم آبادی ہیں۔ شاہ تبارک حسین کا انتقال ڈیالواں میں ۷ صفر ۱۲۹۱ھ میں ہوا۔ مدفن کاکو ہے۔ سید شاہ امداد حسین کے صاحب زادے حاجی سید شاہ محمد مبین ہوئے (یہ قاضی صاحب کے حقیقی پرنانا تھے۔) چونکہ صغر سنی میں ہی یتیم ہو گئے تھے اس لئے اپنے دادا شاہ تیم اللہ اور اپنے عم محترم شاہ تبارک حسین کی آغوش شفقت میں پرورش و تربیت پائی۔ آپ کی شادی قاضی اسد علی کی ایک صاحب زادی سے ہوئی تھی۔ آپ کا انتقال بعمر ۴۵ سال ۵ ذی قعدہ ۱۲۹۳ھ بمقام عظیم آباد لودی کٹرہ اپنے ہم زلف حاجی شیخ احمد اللہ کے مکان پر ہوا۔ نعش کاکو لائی گئی۔ مولانا سید حسرت نے تاریخ وفات کہی "مسکن وے جنت فردوس شد" ۱۲۹۳ھ

آپ کے تین فرزند ہوئے۔ بڑے سید شاہ حاجی لطف الرحمٰن منجھلے سید شاہ عفو الرحمٰن حمد تلمیذ حضرت اکبر داناپوری۔ چھوٹے سید شاہ عبدالرحمٰن عبد شاگرد حافظ نذر الرحمٰن حفیظ عظیم آبادی۔

شاہ لطف الرحمٰن کے دو فرزند مجیب الرحمٰن اور حفیظ الرحمٰن اور تین لڑکیاں ہوئیں۔ مجیب الرحمٰن کم سنی ہی میں فوت کر گئے۔ شاہ حفیظ الرحمٰن کی شادی اپنے پھوپھی زاد بھائی فضل امام صاحب کاشانہ کی بڑی

لڑکی سے ہوئی۔ تین لڑکیوں میں سب سے بڑی لڑکی کی شادی قاضی عبدالوحید ساکن قدیم بخشی محلہ وحال لودی کٹرہ پٹنہ سیٹی سے ہوئی شاہ لطف الرحمٰن کے منجھلے بھائی شاہ غفور الرحمٰن کے تین فرزند، شاہ ولی الرحمٰن ولی۔ شاہ منظور الرحمٰن اختر اور شاہ عطاء الرحمٰن عطا (راقم الحروف)۔

شاہ لطف الرحمٰن (قاضی صاحب کے نانا) کے حالات کے سلسلے میں مزید باتیں قابل ذکر ہیں:۔

آپ کی ولادت قاضی دولت پور اپنی نانیہال میں ۳، محرم ۱۲۷۴ھ مطابق ۱۸۵۷ء میں ہوئی۔ آپ کی اردو فارسی کی معمولی تعلیم کاکوہی میں مولوی ہاشم علی سے ہوئی۔ آپ کی شادی موضع مونگراؤں متصل شہر گھاٹی ضلع گیا مولوی میر فضل حسین کی لڑکی سے ہوئی۔ آپ کو بیعت حضرت مولانا شاہ فضل الرحمٰن قدس سرہ گنج مرادآبادی سے تھی۔ آپ نے تین بار فریضہ حج ادا کیا۔ آپ کا انتقال آپ کے داماد قاضی عبدالوحید کے مکان پر لودی کٹرہ میں ہوا۔ اور روضہ حضرت منعم پاک کے احاطہ میں مدفون ہوئے۔

نامناسب نہ ہوگا اگر یہیں پر قاضی عبدالوحید کا مختصراً تذکرہ کر دیا جائے۔

قاضی عبدالودود صاحب کے دادا قاضی عبدالحمید جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا شاہ لطف الرحمٰن کاکوی کے خالہ زاد بھائی بھی تھے اور سمدھی بھی۔ قاضی عبدالحمید کے فرزند جناب قاضی حافظ عبدالوحید

ساکن قدیم محلہ بخشی پٹنہ حال مقام محلہ لودی کٹرہ ۱۲۸۹ھ میں پیدا ہوئے۔ تاریخی نام "منظور النبی" تھا۔ عربی اور فارسی کی تعلیم کے بعد انگریزی تعلیم حاصل کی۔ انٹرنس کے بعد ایف اے کلاس میں تھے کہ یکایک اس سے متنفر ہوئے اور اتنی شدت کے ساتھ کہ ع

جو لکھا پڑھا تھا نیاز نے اسے صاف دل سے بھلا دیا

پورے عالم باعمل اور شریعت پر بہ شدت کاربند ہو گئے۔ مولانا احمد رضا خاں بریلوی کے زمرۂ معتقدین میں رہ کر اہل سنت والجماعت کے متشدد مبلغ بن گئے۔ علمائے کرام کے بڑے بڑے جلسے منعقد کئے مدرسہ حنفیہ قائم کیا۔ طلبہ کے قیام، طعام اور لباس کا انتظام اپنے صرف خاص سے کرتے تھے۔ مذہبی رسالہ تحفۂ حنفیہ جاری کیا جو اپنے ہی پریس میں چھپتا تھا۔ ندوۃ العلماء کے شدت کے ساتھ مخالف تھے۔ اسی ماحول میں قاضی عبدالودود صاحب کی تعلیم و تربیت ہوئی۔

یہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ قاضی عبدالودود صاحب کب اور کہاں پیدا ہوئے۔ آپ کی پیدائش اپنے ننیہال کاکو میں ہوئی سال ولادت راقم الحروف کی دانست میں ۱۳۱۴ھ مطابق ۹۷-۱۸۹۶ کے لگ بھگ ہو گا۔ یہ بات گوش زد ہے کہ جس سال کاکو میں شدید آتش زدگی ہوئی اور ساری کی ساری بستی آگ کی لپیٹ میں آ گئی اسی سال قاضی صاحب کی ولادت ہوئی۔ یہ آگ ۱۳۰۳ فصلی مطابق ۱۳۱۴ھ میں لگی۔ میرے اخی معظم شاہ ولی الرحمٰن ولی کی پیدائش

۱۳۱۶ھ میں ہوئی۔ تاریخی نام "شاہ رفیع" ہے۔ وہ قاضی صاحب سے لگ بھگ دو سال چھوٹے تھے۔ اس لحاظ سے بھی قاضی صاحب کی تاریخ پیدائش کا اندازہ ہو جاتا ہے اور یہ بات واضح ہوتی ہے کہ قاضی صاحب نے بہ عمر ۱۳ سال حفظ قرآن سے فراغت حاصل کی۔ ان کے حفظِ قرآن کی تاریخ ہے۔ "حافظ وقاری ہوئے" شاہ ولی صاحب نے
۱۳۲۷ھ
حفظ قرآن ۱۳۳۰ھ میں کیا۔ "ولی حافظ ہوئے مبارک ہو" اس وقت
۱۳۳۰ھ
ان کی عمر ۱۴ سال کی تھی۔

قاضی عبدالوحید نے زیادہ عمر نہیں پائی۔ سالِ وفات کا علم مجھے نہ ہو سکا۔ اگر ان کی عمر وفا کرتی تو قاضی عبدالودود صاحب کی عربی تعلیم مکمل ہو جاتی اور ان کی شخصیت اس وقت کی بہ نسبت کچھ اور ہوتی۔ والد ماجد کے انتقال کے بعد قاضی صاحب نے انگریزی تعلیم حاصل کی۔ والد کے مسلکِ شریعت اور ننہالی خاندان کے مشربِ طریقت سے بالکل علیحدہ ان کا اپنا آزادانہ مسلک ہے جو ہر طرح کی تقلید سے بے نیاز ہے اور تقلید بہ قول احسان کچھ زیادہ پسندیدہ طرزِ عمل بھی نہیں ؎

اگر تقلید بودے شیوۂ خوب
پیمبر ہم رہِ اجداد رفتے

اور جو "صاحب نظر" ہیں انھوں نے کب اپنے آبائی مسلک پر رہنا پسند کیا ؎

باعن میاویز اے پدر فرزند آذر را نگر
ہر کس کہ شد صاحب نظر دینِ بزرگاں خوش نکرد

آپ نے قاضی صاحب کے ننھیالی خاندان کی داستان سن لی۔ جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا خاندانی اعزاز صاحب علم و ہنر کے لیے وجہ امتیاز نہیں۔ قاضی صاحب کا علم و فضل خود خاندان والوں کے لیے قابل فخر ہے۔

بندۂ علم شد ی ترک نسبت کن جامی

کاندریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست

قاضی صاحب بھائیوں میں سب سے بڑے ہیں ان کے دو بھائی قاضی محمد سعید اور قاضی محمد فرید تھے۔ افسوس ہے کہ چند سال ہوئے دونوں کا انتقال ہو گیا۔ منجھلے قاضی محمد سعید جرمنی سے تعلیم پاکر آئے تھے۔ زندگی بھر مجرد رہے۔ قومی کاموں میں سرگرم اور اپنے معاشی امور کے نگراں رہے۔ بڑے مخلص، ہمدرد، سخی مہمان نواز۔ چھوٹے بھائی قاضی محمد فرید نے لندن سے معاشیات کی ڈگری حاصل کی۔ کراچی یونی ورسٹی کے صدر شعبۂ معاشیات تھے۔ صاحب اولاد تھے قاضی صاحب کی ایک بہن تھیں۔ ان کی شادی خان بہادر سید محبوب عالم رئیس بجھورہ سے ہوئی تھی۔ ایک بچی یادگار چھوڑ کر انتقال کر گئیں۔

قاضی صاحب کی شادی پٹنہ کے مشہور و معروف وکیل شاہ رشید اللہ بجھورہ پوکھر کی صاحب زادی سے ہوئی ایک فرزند قاضی مسعود ہیں۔

اوراق گذشتہ میں آپ نے تفصیلی حالات دیکھ لئے اب مجملاً

قاضی صاحب کے ننہیالی خاندان کا شجرۂ نسب ملاحظہ ہو:۔

سید شاہ فیروز ۔ مدفن سیودھا

سید شاہ عبدالحی " "

سید شاہ عبدالرحمٰن " کاکو

سید شاہ حبیب اللہ " "

سید شاہ اہل اللہ " "

سید شاہ تتیم اللہ " "

سید شاہ امداد حسین " سیودھا

سید شاہ مبین " کاکو

سید شاہ لطف الرحمٰن " پٹنہ

قاضی عبدالوحید = دختر " پٹنہ

قاضی عبدالودود

قاضی مسعود

سید محمد حسنین

...لیکن تو چیزے دیگری

اقبال کا "مردِ مومن" احکامِ شرعی سے مبرّا ہو کر اگر بشری اوصاف کے ساتھ ظہور لے سکتا ہے تو اسے جناب قاضی عبدالودود بیرسٹر کا قالب اختیار کرنے میں جھجک نہ ہوگی۔ دلیری و بے باکی، حق بینی و بیانی، ذوقِ یقین اور جد و جہد جیسے مومنانہ صفات کی تلاش و دید میں یہاں کاوش کی ضرورت نہیں۔ جو قاضی صاحب کو جانتا ہے اور جس نے ان کے روز و شب کا مشاہدہ بہت قریب سے کیا ہے، وہ ان کے کردار کی خصوصیاتِ بالا سے انکار نہیں کر سکتا۔

قاضی صاحب کی قاموسی شخصیت علم و فراست کی اس بلندی پر جا پہنچی ہے جہاں اقوال و اعمال کو عقل نہیں انا کنٹرول کرتی ہے ــــــ ان کے اس مرتفع وجود سے ہر کہ و مہ کا خفیف یا حقیر نظر آنا تعجب انگیز نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قاضی صاحب کی نظر و فکر کسی کی استقامت یا وجاہت نہ دیکھ سکی۔ واحسرتا! تحریر ہو یا تکلم، وہ آج تک کسی فرد کو تعریف و تحسین کے دو جملے بھی نہ دے سکے ــــــ بادی النظر میں یہ تفخرانہ شعار قدِ قامتی میں

نجی کی دلالت کرتا ہے مگر حقیقت برعکس ہے۔ یہ مجذوب تحقیق دانشورانہ سربلندی کے باوجود مقام کبریائی شناخت سے محروم ہے! قاضی صاحب کا قلم نشتر لگا سکتا ہے، مرہم نہیں لگا سکتا۔

میں قاضی صاحب کا ہم وطن ہوں۔ اپنے بچپن سے انھیں جانتا ہوں۔ میری نگاہوں نے قاضی صاحب کا close range سے جائزہ لیا ہے۔ قاضی صاحب نے میرے مقالہ تحقیقی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا:-

> "یہ اعتراف کیا گیا ہے کہ ایسے لوگ جن سے استفادہ کیا گیا ہے، بہت ہیں۔ مگر چونکہ فرداً فرداً ذکر کرنا ناموں کی ایک لمبی فہرست کا اندراج ہوگا۔ اس کے عوض مصنف ان کی خدمت میں ہدیۂ عقیدت اور اظہار تشکر کا نذرانہ پیش کرتا ہے۔ قاعدہ ہے کہ ایسے اصحاب کا نام بنام ذکر کیا جائے، بلکہ یہ بتایا جائے کہ کس سے کیا مدد ملی ہے۔ اس قاعدے کی خلاف ورزی کر کے ڈاکٹر محمد حسنین نے ایک اچھی مثال قائم نہیں کی۔"

ماہنامہ تسنیم پٹنہ بہار نمبر ۱۹۵۹

اس وقیع تبصرہ میں جو ۱۰ صفحات پر مشتمل اور محض ایک قسط تھا، قاضی صاحب نے میرے مقالہ کی ۴۶ اساسی اور متعدد ضمنی غلطیوں کی نشاندہی کی ہے ـــــ یہ میری عزت افزائی ہے کہ قاضی صاحب نے میرے مقالہ پر توجہ دی ـــــ زیر نظر مقالہ میرے ان مشاہدات کا پرتو ہے جو دوران تحقیق قاضی صاحب کی قربت میں حاصل ہوئے۔

آغاز کار میں دیوان قدسی کا صرف ایک نسخہ پیش نظر تھا۔ یہ پٹنہ یونیورسٹی لائبریری کی ملکیت تھا۔ اس کی تاریخ کتابت ۱۰۲۹ھ تھی۔ ایک نسخہ کا ذکر تاریخ شعرائے بہار میں

تھا ۔۔۔ کلیم صاحب نے مشورہ دیا کہ میں مرزا احمد علی ندوی پر کام کروں ۔
قاضی صاحب کی منظوری ضروری تھی ۔۔۔ قاضی صاحب سے ملنے جائیے اور وقت مانگ کر لیجئے ۔ ان کے روز و شب ان کی سیرت و سرشت کے تابع ہیں ، راہ اور رفتار میں تبدیلی ناممکن ! ۔۔۔ تصرف وقت ہو یا استعمال ملبوسات ، آداب گفتگو ہوں یا آداب تحریر ، قاضی صاحب اپنے معمولات میں کٹر سنی ہیں ۔ ان کے جدِ امجد ، قاضی عبدالمجید اور نانا شاہ لطف الرحمٰن عرف بگّو صاحب اپنے زمانہ کے ان معززین میں تھے جو اہل ثروت تھے اور اہل علم بھی ۔ والد ، قاضی عبدالوحید کو قدرت نے خدمت دنیا و دین کا جذبہ بخشا تھا ۔ مروّجہ مشرقی روایت کے بموجب قاضی صاحب کی ابتدائی تعلیم اسی نہج پر انجام پائی ۔ ان کے ابتدائی دینی تصورات کی آبیاری میں سرسید احمد کی خطبات احمدیہ اور شبلی کی علم الکلام اہم کتابیں ہیں ۔ میں نے ان کی زبانی سرسید احمد کی تنقیص کبھی نہ سنی ۔۔۔ وہ حافظ قرآن ہیں ، عربی داں ہیں اور انگریزی اور فرانسیسی زبانوں پر دسترس رکھتے ہیں ، مگر ان کی بصیرت اور فکر و نظر کا سوز و ساز دل کو نصیب نہیں ۔ بعد الگفتگو انھوں نے اکثر اعتراف کیا کہ عالم وجود کے مسئلہ پر وہ مبہوت ہو جاتے ہیں اور حیات بعد الموت کی صداقت پر انھیں شبہہ ہوتا ہے ۔ بلا جھجک فرماتے ہیں کہ وہ اس لیے مسلمان ہیں کہ پیدائش ، تعلیم و تربیت ایسے خاندان میں ہوئی جو مذہب اسلام کے پیرو تھے ، ورنہ وہ صرف انسان ہیں ، محض انسان ۔ انسانیت کو وہ مذہب تصور کرتے ہیں ۔ رب کو وہ خدا سے موسوم نہیں کرتے ، ایک لافانی عظیم توانائی سمجھتے ہیں جو نظام کون و مکاں پر اٹل ضابطے کے ساتھ قادر ہے ۔۔۔ وہ قانون داں ہیں اور ولایت کے سند یافتہ بیرسٹر ، عرفی اور غیر عرفی ہر امر کے وجود و عدم کو وہ اسی نقطہ نظر سے سوچنے اور سلجھانے کے عادی ہیں ۔ معجزات اور وحی پر ان کا ایمان نہیں ۔ کشف و کرامات کو وہ خرافات سمجھتے ہیں ۔ انہوں نے مجھے

اپنا ایک واقعہ سنایا تھا:۔

جن دنوں میں بغرض علاج ڈاکی سنیٹوریم میں تھا، ایک احمدی مبلغ اپنے کسی عزیز کی عیادت کو آیا کرتے۔ وہ میرے پاس بھی آجاتے۔ مذہبی موضوعات پر گفتگو کرتے اور معجزہ کو دلیل نبوت کہتے۔ میں شروع شروع خوش وقتی کی خاطر ان باتوں میں دلچسپی لیتا۔ مجھے وہ انگریزی اور اردو کے احمدی لٹریچر دے جاتے۔ میں ان سے بے توجہ رہتا۔ میں نے اشارتاً ان پر ظاہر کر دیا کہ مجھے مذہب سے کوئی تعلق نہیں۔ انھوں نے اپنی تبلیغ تیز کر دی۔ میں نے انہیں صاف کہدیا کہ مرزا غلام احمد صاحب کے الہامات بجائے خود کا بھی قائل نہیں۔ انھیں سخت حیرت ہوئی۔ وہ مرزا صاحب کے الہامات کو ظہور شدہ واقعات کی تاریخی شہادتوں کی روشنی میں ثابت کرنے لگے۔ میں نے ان سے کہا کہ یہ گفتگو فضول ہے۔ میں آپ کے سامنے ایک شرط رکھتا ہوں۔ یہ میرے لنگس کی رپورٹ ہے۔ آپ مرزا غلام احمد صاحب سے درخواست کریں، میری طرف سے نہیں، اپنی طرف سے میں دو ہفتہ وقت دیتا ہوں۔ وہ اپنے فیض روحانی سے لنگس کے پیچ دور کر دیں۔ میں ان کے اس عمل کے بعد ایکسرے لوں گا۔ اگر وہ پیچ ثابت ہوئے تو میں خود اپنی بیوی اور اولاد سمیت مرزا غلام احمد صاحب کی نبوت پر ایمان لاؤں گا۔ اگر ایسا نہ ہوا تو مجھے تنا ہو گا کہ ان کے دعویٰ نبوت کو فریب دیئے جانے کا اعلان کر دوں۔ ——— اس روز کے بعد سے وہ احمدی مبلغ ایسے غائب ہوئے کہ پھر صورت نہ دکھائی۔

قاضی صاحب سے ملنے جایئے اور وقت لے کر ملاقات کیجئے، وقت مقررہ پر وہ

ڈرائنگ روم میں استقبال کو موجود رہیں گے۔ آنے میں تاخیر کی امتا خیر زیادہ ہو گئی تو ملاقات کالعدم ـــــ آداب و تسلیم کے ساتھ وہ ناویدہ دار بازو کی بجار کسی ہنگلیا سے مدبرانہ جنبش کے ساتھ مصافحہ کریں گے۔ سر کو خم دیتے ہوئے بیٹھنے کا اشارہ کریں گے۔ آپ کے بعد اپنی جگہ لیں گے جو مد مقابل کی نشست ہو گی ـــــ کیا پئیں گے؟ شربت یا چائے؟ ـــــ یہ سوال نئے اور پرانے ہر ملنے والے سے ضرور کیا جائے گا۔

لانبا ڈرائنگ روم میں صوفے سے لگا ہشت پہل چھوٹی سی میز پر ایک نئی کتاب رکھی تھی۔ یہ آمنہ خاتون، لکچرر میسور یونیورسٹی کی تحقیقی نوادر تھی۔ قاضی صاحب نے کہا۔ ان خاتون کو تحقیق سے غیر معمولی شغف ہے۔ اپنے مقالوں کو یہ "تالیف کے بیٹے" کہتی ہیں۔ یہ کہتے ہوئے مسکرائے۔

نگارشات کو اولاد معنوی کہنا عام ہے۔ ایک خاتون کا انہیں "بیٹے" قرار دینا عجیب سا لگا۔ ہنستے ہوئے تحقیقی نوادر کو اٹھا کر میں دیکھنے لگا۔

اپنی تحقیق کی بات آئی۔ کلیم صاحب کا مشورہ سنایا کہ وہ مرزا محمد علی فدوی پر کام کرنے کو کہتے ہیں۔ سن کر قاضی صاحب نے دوہرے صاد بنائے۔ کہا کہ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ میں دیوان فدوی کے دو نسخے ہیں۔ علاوہ بریں مرشد آباد اور شمالی بہار میں بھی دیوان فدوی کا وجود ممکن ہے ـــــ یہ قیاس نہ تھا، چشم شاہیں کی نگاہ تھی۔ برس دو برس کی چھان پھٹک کے بعد کٹھے چار نسخے دستیاب ہو گئے تھے ـــــ بڑی خوشی تھی، راہ مل گئی، قدم تیز ہو گئے۔ مرزا محمد علی فدوی کے دیوان کی تلاش شروع ہوئی۔

مقالہ تحقیق کا پہلا کام تعین عنوان تھا۔ میں نے عنوان کی مختلف شکلیں سوچیں۔

کلیم صاحب نے دیکھا، مسکرائے۔ قاضی صاحب سے مشورہ کی ہدایت دی ـــــ انھوں نے دیکھا۔ خس و خاشاک کی طرح پل میں پھونک دیا! ـــــ کہنے لگے:

مقصد دیوان ہے یا فدوی شاعر؟ امر غور طلب یہ ہے۔ حالات زندگی میں آپ کو کیا ملیگا؟ فدوی بڑے شاعر نہیں۔ معروف زمانہ بھی نہ تھے۔ چند معاصر تذکرہ نگار ان کا ذکر کرتے ہیں۔ یہی آپ کے ماخذ ہیں، بس۔ ان سے زیادہ مواد کیا ملے گا؟ اپنے رقم کردہ حالات اگر دیوان میں ملجائیں تو امر دیگر ہے۔ اصل کام دیوان کی اڈیٹنگ ہے۔ دستیاب نسخوں سے کلام جمع کرنا ہے۔ تکیہ عشق والا نسخہ ملجائے تو خوب ہے۔ ان نسخوں کا تفصیلی ذکر ہوگا۔ دیوان کی تدوین۔ مکمل صحت متن کے ساتھ۔ اختلافات قرأت علاوہ۔ پھر فدوی تخلص کے دیگر شعراء کا کلام بر غلط طور پر ایک دوسرے سے منسوب ہے۔ زبان پر مفصل بحث ہوگی۔ بڑی صاف اور بامحاورہ زبان لکھتے ہیں۔ میر حسن سے ان کی دوستی تھی۔ خوش طبعی اور شیریں کلامی کا ذکر کرتے ہیں۔ علم موسیقی اور ستار سے بھی فدوی کو ذوق تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مقبول انام کہا ہے اور نسخے ملجائیں تو اڈیٹنگ اچھی طرح ہوگی۔ میر حسن نے لکھا ہے کہ کلام اوائل رابہ آب شستہ، بعد از ان خوب تر گفتہ۔ اغلب ہے فدوی نے یہی نسخہ رکن الدین عشق کی نذر کیا ہو مرشد آباد ضرور جائیے۔ نعر سیٹھ کے یہاں یہ قیام کرتے تھے۔

عجب نہیں ایک نسخہ وہاں بھی مل جائے۔

قاضی صاحب نے کہا، اصل کام دیوان فدوی کی اڈیٹنگ ہے۔ مقالہ تحقیقی کی سرخی یہ ہوگی:۔

دیوان مرزا محمد علی فدوی دہلوی، حالاتِ زندگی اور شاعری

کلیم صاحب نے کہا، دیوان ہی حاصلِ تحقیق نہیں۔ کلام کے علاوہ شاعر کی زندگی، اس کا عہد اور اس کی شاعری کو بھی منظرِ عام پر لانا چاہئے۔ مقالہ تحقیقی کا عنوان یہ ہے۔

مرزا محمد علی فدوی ــــ عصر، حیات، شاعری اور کلام

دونوں عنوانات پیش ہوئے۔ کلیم صاحب نے دیکھا، چھپا رہے۔ کئی دن تک اس موضوع پر بات نہ ہوئی۔ قاضی صاحب نے دیکھا۔ بولے، کلیم الدین احمد صاحب نقاد ہیں۔ فدوی کی شاعری پر وہ اپنے انداز سے سوچتے ہیں۔ کام بڑھ جائے گا۔ دیوان کی اڈیٹنگ آسان نہیں۔ عصر اور شاعری پر لکھنا مزید کام ہوگا۔ اس پہلو پر بھی توجہ رکھئے ــــ قاضی صاحب نقاد نہ تھے محقق تھے۔ کلیم صاحب محقق نہ تھے نقاد تھے۔ ان بھاری جھٹکوں کے درمیان میں ایک کھنچاؤ تھا:

کلیم صاحب نے پٹنہ یونیورسٹی لائبریری سے ڈاکٹر ہادی حسن کی وہ تھیسس جو سر ڈینی سن راس کی نگرانی میں انجام پائی تھی منگوائی۔ اس مقالہ کی نوعیت بھی Factual research کی تھی۔ ڈاکٹر ہادی نے ابو نظام محمد جلال الدین متخلص بہ فلکی شروانی پر ریسرچ کیا تھا۔ مقالہ تحقیقی ضخیم تھا۔ چند اوراق فلکی شروانی کے تعارف اور باقی اس کے کلام پر مشتمل تھے ــــ ڈاکٹر ہادی حسن جامہ زیب تھے اور خوش ذوق بھی اور نہایت خوش خط بھی تھے۔ عینی ثبوت ان کی تھیسس تھی۔ اپنے ہاتھ سے انھوں نے فلکی شروانی کا مختصر سا دیوان نقل کیا تھا۔ اختلافات اشعار دوسرے نسخوں سے حاشیہ میں درج تھے۔ اسی جگہ نوٹ بھی تحریر تھا۔ مسودہ کی تصحیح سر ڈینی سن

اس نے خود کی تھی۔ حک و اضافہ اپنے قلم سے کیا تھا۔ سارا کام باسلیقہ اور باضابطہ تھا۔ یہ اس قدر صاف ستھرا اور خوش ترتیب تھا کہ مسودہ جوں کا توں فوٹو کاپی کرا کے یونیورسٹی میں داخل کر دیا گیا تھا ——

تدوین کلام فدوی میں ڈاکٹر ہادی حسن کا طریقہ کار نمونہ رہا۔ قاضی صاحب نے بھی اسے دیکھا۔ چھپ چکا ہے۔

ہمایوں، ساقی، معارف کے پرانے فائل میں اپنے کام کے اچھے مقالے مل جاتے —— ہمایوں کے اپریل ۱۹۴۶ کے شمارہ میں ایک مقالہ دیکھا۔ یہ سید رضی الدین حیدر کی تحریر تھی۔ پڑھ کر جی خوش ہو گیا جیسے اندھے کے ہاتھ بٹیر لگی۔ فوراً نوٹ لیا:

> بارہویں صدی ہجری میں اردو کے صرف ایک یا دو تذکرے دہلی میں موجود تھے لیکن ارباب عظیم آباد نے چار چار تذکرے لکھے۔ تذکرہ عشقی مولفہ رحمت علی عشقی عظیم آبادی ۱۱۱۵ میں مرتب ہوا۔ اردو کا قدیم ترین تذکرہ یہی ہے۔ اس میں ۴۳۹ شعرائے ریختہ کے تذکرے ملتے ہیں، وغیرہ۔

یہ علم ولولہ خیز تھا —— اردو کا سب سے قدیم تذکرہ عظیم آباد میں لکھا گیا اور مصنف عظیم آبادی تھا —— فوراً قاضی صاحب کو اس مقالہ کی خبر دی اور واقعہ کی تصدیق چاہی۔ جواب آیا۔ تحریر پر تمکین کا آہنگ گفتگو کا ہم نوا تھا۔ انھوں نے لکھا:

> ... جن صاحب نے ہمایوں میں یہ مضمون لکھا تھا۔ انھوں نے شاید عمر بھر کسی تذکرے کی صورت بھی نہ دیکھی ہوگی اور یہ فن میں داخل بھی نہیں ...

خط پڑھ کر جھٹکا لگا اور جذبہ جانب داری پہ تازیانہ پڑا، پہلا اور گہرا۔

پروفیسر محمد مسلم عظیم آبادی نے مغل اور اردو کی بڑی تعریف کی تھی یہ نواب نصیر حسین خاں خیال عظیم آبادی کا وہ معرکۃ الآرا خطبۂ صدارت تھا جسے انھوں نے آل انڈیا اردو کانفرنس کے پہلے اجلاس منعقدہ ۱۴ دسمبر ۱۹۱۶ میں پیش کیا تھا۔ لکھنؤ کے قیصر باغ میں ہزاروں کا مجمع تھا۔ سامعین میں گاندھی جی، موتی لال نہرو، بال گنگا دھر تلک، مدن موہن مالویہ جیسے غیر مسلم اکابر اور محمد علی جناح، سر وزیر حسین، راجا محمود آباد جیسے مسلم عمائد تھے ـــــ مغل اور اردو میں بڑی دلکشی تھی۔ اردو شاعری کی ترویج و اشاعت میں مغل فرمانرواؤں نے کیا حصہ لیا، اس موضوع پر تاریخ کی روشنی میں نصیر حسین خاں خیال نے محققانہ انداز سے اور رنگا بھی اردو میں اظہار خیال کیا تھا ـــــ عقیدت کا برا ہو، عصبیت ساتھ ہو جائے تو ادراک کی لو جل نہیں پاتی۔ نور جہاں کے ان اشعار پر جب نظر پڑی تو قلب حیرت افزا انشراح سے جھوم جھوم گیا، جیسے بادل سے بوندیں نہیں جوہی کے پھول برس رہے ہوں!

دی جگہ تیغ جفا کو دل صد چاک میں ہم ـــ دیکھیں گر کچھ بھی وفا اس بت بیباک میں ہم
نقش پا کی طرح اے ربّ جانِ عاشق ـــــ تیرے قدموں سے جدا ہو کے ملے خاک میں ہم

قاضی صاحب سے مغل اور اردو کا ذکر آیا۔ ملکہ نور جہاں کی ریختہ گوئی کی بات والہانہ کی۔ برجستہ بولے، جی ہاں، خیال نے دہنِ نور جہاں میں زبانِ داغ دیدی ہے ـــــ

پھٹی نظروں سے قاضی صاحب کا چہرہ دیکھنے لگا۔ مسکراتے ہوئے کہا، اس کور عقل کو یہ بھی نہ سوجھا کہ عہدِ اکبر و جہانگیر میں ایسا صاف اسلوب ریختہ کہاں؟

سلکِ عقیدت سے دیوارِ تصوّر میں ٹنگا ادیب الملک نواب سید نصیر حسین خاں خیال عظیم آبادی کا وہ دل آویز مرقع دفعتاً گر کر چور چور ہو گیا! ـــــ

ایسا صریح جھوٹ؟ ـــ اس قدر علی الاعلان؟ ـــ پوچھا، مگر قاضی صاحب!

اس بیان کی تکذیب کسی نے نہ کی ؟ حیرت ہے ایسی بے سر و پا بات سن کر لوگ چپ کیوں رہے ؟

ارے صاحب، اس اجلاس میں مولوی عبدالحق بھی موجود تھے۔ میں نے ان سے دریافت کیا تھا، جناب آپ نے تردید کیوں نہ کی ؟ ـــــ وہ کہنے لگے، تو کیا جوتا پھینک کر مارتا ؟

قاضی صاحب نے ہشیار کیا، اس بات سے ہمارے مذاقِ تحقیق کا اندازہ لگا یئے۔ یہی ہمارا معیار ہے، جو لکھ ڈالیے جو کہہ دیجئے۔ کون ہے جو عقل سے معرض ہے۔ اگر یوں ہوا تو کیا ہوا۔ اگر یہ صحیح نہیں تو اس سے کیا بگڑا ہے ـــــ جب اندازِ تحقیق میں ایسی وحشت ہو راست بیانی یا تلاشِ حقیقت کی فکر کیوں ؟

سمجھ آئی کہ ہر رقوم یا مطبوعہ بات کا سچ ہونا لازمی نہیں۔ کم از کم یہ ثبوت کہ یہ بات قلم بند ملتی ہے، اس لئے یہ دلیل صدق ہے، صحت مندانہ فہم نہیں ـــــ اس امر پر قاضی صاحب سے بارہا گفتگو ہوئی۔ ادبی تحقیقات میں وہ اس اندازِ استدلال اور طریقۂ فہم کو ناقص قرار دیتے ہیں۔

دورانِ تحقیق مجھے یہ دوسری ٹھوکر لگی ـــــ لازم ہے دل کے پاس رہے پاسبانِ عقل !

۱۹۵۱ کی بات ہے۔ پٹنہ میں ریاستی انجمن ترقی اردو کی سالانہ کانفرنس تھی۔ پنڈت تاثر، کیفی، ڈاکٹر عابد حسین، صالحہ عابد حسین، مجاز، آل احمد سرور، فراق، احتشام حسین خواجہ احمد فاروقی، جگن ناتھ آزاد باہر سے تشریف لائے تھے ـــــ خواجہ احمد فاروقی ان دنوں اپنی تصنیف میر حیات اور شاعری کی تکمیل میں مصروف تھے۔ میر تقی کے حالات زندگی سے متعلق وہ صحت مواد کی خاطر قاضی صاحب سے بالاستیعاب رجوع کرتے۔ میر کی

سیدزادگی، ان کے ماموں خان آرزو سے ان کے سلوک ناروا، میر کے والد میر متقی کے خرقِ عادات کی حقیقت پر خط و کتابت آتی جاتی ٹرین کی طرح جاری تھی۔

یہ حضرات دوسرے دن خدا بخش لائبریری میں نوادر اور مخطوطات دیکھنے آئے ـــــ قاضی صاحب وہاں موجود تھے، ان کے استقبال کو نہیں، اپنے کام کی غرض سے عسکری صاحب اور میں مہمانوں کے ہمراہ تھا۔ قاسم صاحب، ناظم کتب خانہ، نے قاضی صاحب کو ان کی آمد کی اطلاع دی۔ وہ صدر کمرے میں چلے آئے۔ علیک سلیک اور آمد و قیام کی رسمی بات ختم ہوتے ہی حمیدہ سلطان نے قاضی صاحب سے اپنے اس مقالہ کا ذکر کیا جو دہلی کے رسالہ ماحول میں شائع ہوا تھا حمیدہ سلطان کے گھرانے سے قاضی صاحب کے دیرینہ روابط تھے۔ قاضی صاحب کے ان ہندی دوستوں میں جو بغرض تعلیم انگلستان میں کئی برس ساتھ رہے، فخرالدین علی احمد اور نورالدین مرحوم بھی تھے یہ ان دوستوں میں تھے جو یورپ کی سیر و سفر میں ساتھ رہتے ـــــ حمیدہ سلطان نے مقالہ میں غالب کی حیاتِ معاشقہ کی اصلیت پر تحقیقانہ انداز سے گفتگو کی تھی۔ غالب نے مرزا حاتم علی مہر کے نام تعزیت نامہ میں یہ لکھا ہے:-

"... میں بھی مغل بچہ ہوں۔ عمر بھر میں ایک بڑی ستم پیشہ ڈومنی کو مار رکھا ہے"

ساتھ ہی اس وفا شعار ڈومنی کی وفات اندوہناک پر انہوں نے ایک غزل مسلسل میں اپنے پر درد تاثرات بھی قلم بند کئے ہیں۔

حمیدہ سلطان نے اس مقالہ میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ وہ ستم پیشہ ڈومنی دراصل دہلی کی ایک شریف و قبول صورت خاتون تھیں جو غالب سے مشورۂ سخن کرتی تھیں اور جذباتی ہم آہنگی نے انہیں مرزا سے قریب کر دیا تھا۔

قاضی صاحب نے حمیدہ سلطان کا جواب اثبات میں دیا ــــ حمیدہ سلطان نے مزید استفسار کیا اور سند رسالہ کے عوض مقالہ پڑھ دیا۔ قاضی صاحب صرف ہوں ہاں کر کے ٹال گئے۔ حمیدہ سلطان جیسے قاضی صاحب سے اپنے خیالات مرقوم کی صحت پر طالب سند تھیں۔ بولیں، یہ مقالہ بہت پسند کیا گیا۔ میں سمجھتی ہوں کہ آپ بھی میری باتوں سے اتفاق کریں گے۔

ــــ دیوانہ را آہوے بس است، قاضی صاحب بپھر گئے۔ تیور بدلتے ہوئے پوچھا، آپ کو یہ روایت کہاں ملی؟ انھوں نے جواب دیا، (میری) نانی جان بگا بیگم سے۔ (یہ ملاعت کے بڑے صاحب زادے باقر علی خاں کی بیوی اور ضیاء الدین خاں کی اکلوتی صاحب زادی معظم زمانی بیگم عرف بگا بیگم تھیں)

قاضی صاحب نے فوراً سوال کیا، آپ کی نانی کی عمر اس وقت کیا تھی جب بیگم غالب زندہ تھیں؟ جب یہ روایت آپ نے ان کی زبانی سنی تو آپ کی عمر کیا تھی؟

چشم زدن میں حمیدہ سلطان اور قاضی صاحب تین چار پشت اوپر جا پہنچے۔ ــــ سائل اور مجیب کون تھا، وکیل اور مدعی کون؟ سامعین اور ناظرین ششدر و حیرت ہو گئے، اس کی شناخت آسان نہ تھی۔ حمیدہ سلطان کو علم سینہ بہ سینہ تھا۔ وہ موروثی حکایات کی امین تھیں۔ قاضی صاحب کے پاس حافظہ کی توانائی تھی۔ وہ ایک بیرسٹر اور عہد شناس مستشرق کے انداز سے سوال در سوال کر رہے تھے ــــ حمیدہ سلطان جز بز ہو گئیں۔ قاضی صاحب نے انھیں دو ٹوک کہا، آپ خاندان غالب سے ہیں۔ اس قسم کے مفروضات منائیدہ روایات سے صرف نظر کیا کریں، ورنہ میں سخت خبر لوں گا، قطع نظر کہ آپ کے گھر سے میرے پرانے مراسم ہیں ــــ جاں نوازی اور جاں ستانی کا یہ دلربا منظر ناقابل فراموش تھا ــــ!

قاضی صاحب اظہارِ حق میں غازی ہیں اور ان کے الفاظ کٹار۔ کیسے لگے، کہاں لگے، انھیں فکرِ زیاں کیوں ہو بھلا ـــــ ان میں مہر ہے ریا نہیں۔ ان کا افضل عدل سے اوپر نہیں اٹھتا۔

علیگڑھ میگزین کے غالب نمبر میں ان کا وہ معرکتہ الآرا مقالہ "غالب کا ایک فرضی استاد" چھپا تھا۔ انیس دلائل پیش کر کے انھوں نے یہ بات ثابت کر دی تھی کہ "دنیا کا کوئی شخص غالب کے سوا عبدالصمد سے ذاتی واقفیت کا مدعی نہیں۔"

ماہرینِ غالبیات میں قاضی صاحب کا نظیر نہیں ؎

ہیں اور بھی دنیا میں محقق بہت اچھے
کہتے ہیں کہ قاضی کا ہے اندازِ بیاں اور

غالب کے سیاہ و سپید کا علم جیسا انہیں حاصل ہے، مرزا کے کراماً کاتبین بھی اس سے ناآشنا ہوں گے۔ بابِ قاضی دیکھنے کا جاتا ہے۔ غالب و شاگردِ میر کا بچہ بچہ یوں الٹا نظر آئیگا جیسے تازہ کٹے درخت کی ڈالی اور پتے! صرف ان ہی شعرا کے سر نہ ہوں گے، وہ مقتول جسم بھی ٹنگے ہوں گے جو قبیلہ ہائے محقق و مدبر کے سربلندوں میں شمار ہیں۔ کسی نے قاضی صاحب کے اندازِ تحقیق کو گورکنی کی مثال دی ہے۔ ممکن ہے اس میں ذم کا پہلو ہو، پرسدگاہ قاضی سے کوئی نہ بخشا گیا، کیا مردہ کیا زندہ!

حالی واحد مصنف ہیں جن کے لئے میں سرِ عقیدت جھکاتا رہا ہوں۔ ایک بار ذکر آیا۔ میں نے کہا قاضی صاحب، حالی میں سیرت کی بڑی بلندی ہے۔ میں انھیں اردو کا واحد اہلِ قلم تصور کرتا ہوں جہاں علم اور کردار میں اتحاد نظر آتا ہے۔

میں آپ سے اتفاق نہیں کرتا۔ آپ نے یادگارِ غالب کا مطالعہ کیا ہے؟

پڑھی ہے قاضی صاحب۔ غالب ان کے استاد تھے۔ دیکھیے کس احتیاط اور احترام سے

ان پر قلم اٹھایا ہے۔ عالم نشاط نہ کہا، عالم سرخوشی کہا۔ یہ نہ کہا کہ مرزا بچپن میں آوارہ مزاج تھے۔ یہ کہا کہ مرزا کا بچپن بڑے اللّے اور تللّے میں بسر ہوا۔ بوڑھے غالب کی رندانہ روش پسند نہ آئی تو کیسے بے تاب ہو گئے۔ خط لکھ کر انہیں نماز پنج وقتی کی تاکید کی۔ یہ ان کی اخلاقی بلندی ہی تو تھی۔ پھر نیک دلی دیکھئے۔ اس کارِ عمل کس قدر صحیح ہوتا ہے۔ محسوس ہوا کہ یہ فعل بے جا اور بے ادب تھا۔ خفیف ہو گئے اور غالب سے معذرت خواہ ہوتے ہیں... آخر یہ سب کیا ہیں؟ ... میں تو سمجھتا ہوں حالی کا قلم ہمیشہ باوضو رہتا ہوگا... شاید خواب میں بھی وہ جھوٹ بولنے کی ہمت نہ کرتے ہوں گے...

قاضی صاحب خاموش سنتے رہے، مسکرائے اور بولے، آپ کا مطالعہ ناقص ہے۔ میں ایسے شخص کو صالح نہیں کہتا جو کسی کا ذب کے کذب و فریب سے چشم پوشی کرے اور ساتھ ہی اس سے عمل نیک کی توقع رکھے... ملا عبد الصمد کی شاگردی کا معاملہ آپ نے غور کیا ہے؟ حالی چاہتے تو غالب سے زندگی میں ہی دریافت کر سکتے تھے کہ حقیقت کیا تھی۔ ان کی اخلاقی بلندی کیا ہوئی؟ ——— آپ نے یہ غور کیا جو شخص عمر رسیدہ استاد کو فرائض دینی سے غفلت برتنے پر اس کے انجام بد کی جانب مائل کرنے کی جرأت کر سکتا ہے، وہ استاد کے دو طرفہ بیانات پر سر تسلیم خم کر لیتا ہے۔ وہ معترف ہیں کہ مرزا کی زبانی یہ سنا گیا ہے کہ مجھ کو مبدا فیاض کے سوا کسی سے تلمذ نہیں۔ چونکہ لوگ مجھ کو بے استاد کہتے تھے ان کا منہ بند کرنے کو میں نے ایک فرضی استاد گھڑ لیا ہے...

اس کے باوجود وہ اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ عبد الصمد فی الواقع ایک پارسی نژاد آدمی تھا... بس اسی پر نہیں کرتے یہ بھی لکھتے ہیں کہ عبد الصمد کے فیض صحبت نے مرزا غالب میں کم از کم وہ ملکہ ضرور پیدا کر دیا تھا جس کی نسبت کہا گیا کہ اگر حاصل شود خواندہ و ناخواندہ برابر است و اگر حاصل نہ شود ہم خواندہ و ناخواندہ برابر... یہی حالی کی راست روی ہے؟

قاضی صاحب گرمِ گفتار تھے۔ اس انداز و تیقن سے جیسے برقی شعاعیں مریض
کے دماغ اور قلب کو بیک وقت آپریٹ کر رہی ہوں! ــــــ پھر کہنے لگے، "حیات
سعدی پڑھیے ... آپ کے باکردار حالی کا یہاں بھی وہی عمل ہے ... سعدی بھی
غلط بیانی میں کم نہ تھے۔ انھیں علیہ رحمت کہنے والے افراد آج بھی کم نہیں ...
گلستاں کی ان حکایات کا ذکر نہیں کرتا جہاں شنیدم کا معاملہ ہے۔ ان بیانات کو
دیکھیے جہاں دیدم کے مدعی ہیں۔ پند و نصیحت کی خاطر من گھڑت واقعات اس طرح
قلم بند کر دیے ہیں جیسے ان کا ذاتی مشاہدہ ہو ... بوستاں کی مثنوی سومنات پڑھیے۔
اس تاریخی واقعہ کو واحد متکلم میں پیش کیا ہے .... حالانکہ تاریخی حقیقت ہے سعدی
کا ورودِ ہند ثابت نہیں ... اور ان بزرگ کی جب حالی سیرت لکھتے ہیں تو سعدی
کی یہ کذب بیانی انہیں نظر نہیں آتی ...."

میں نے پہلو بدلا۔ گفتگو میں قاضی صاحب رکتے نہیں۔ کلنڈر کے پتوں کی طرح
موضوع بدلتا جائے گا۔ وہ گھنٹوں بات کریں گے۔ تھکتے نہیں اور مخاطب کو چھوڑتے بھی
نہیں۔ مجھے یاد نہیں انھوں نے از خود کبھی انقطاعِ گفتگو کی ہو۔ اپنی فہم یا علم کے پرجیکٹ
کرنے کو اگر کسی فریقِ ثانی نے کوئی ایسا وقیع مسئلہ چھیڑ دیا جس پر قاضی صاحب کسی حتمی نتیجہ پر
پہنچ چکے ہوں، تو تسلسلِ کلام سے گفتگو میں حدت آجائیگی۔ اور نہایت مدلل و جامع اور
مختصر فقروں میں باتیں کرنے لگیں گے۔ جیسے ہی اندازہ کریں گے کہ مخاطب سے اتفاقِ رائے
ممکن نہیں، یہ کہتے ہوئے فی الفور موضوع بدل دیں گے،

We agree that we can't agree on this point.

انگلی کھجانے کے بہانے میں نے کلائی سیدھی کرتے ہوئے گھڑی پر نظر ڈالی۔ کئی گھنٹے گذر چکے
تھے۔ بادب ہوکر واؤ سے الف ہونے لگا ــــ قاضی صاحب تانگے بات کرتے

ہوئے اٹھ کھڑے ہوتے۔ بڑھے اور دروازہ تک رخصت کرنے آتے۔ خدا حافظ کہتے ہوئے واپس لوٹتے۔ یہ انداز و ادا آج بھی برقرار ہے۔

قاضی صاحب میں مہمان نوازی کا جذبہ جنگلی بیل کی مثال ہے جو سہارا ملتے ہی بے پناہ بڑھتی جاتی ہے۔ ان کے یہاں دعوتیں بہانے نہیں سہارے ڈھونڈتی ہیں ـــــ معزز مہمان جو پٹنہ تشریف لاتے ہیں۔ انھیں بے حیلے اور بلا تکلف شام کی چائے یا رات کے کھانے پر دعوت دی جاتی ہے۔ جیسی روح ویسے فرشتے، جس منصب کے مہمان ہوتے ہیں، اسی جنس کے چند خواص بھی بلا لئے جاتے ہیں۔ میزبان کا یہ کمالِ گفتار اور کمالِ اخلاق ہے کہ صحبت اسی رنگ و آہنگ میں ڈھل جاتی ہے۔ اہلِ دانش ہیں تو انداز گفتگو دانش ورانہ ہوگا۔ اب سیاست ہیں تو سیاسی کھانچے بھرے اور کھرچے جائیں گے ـــــ فخر الدین علی احمد صاحب، صدر جمہوریہ منتخب ہونے سے پہلے پٹنہ تشریف لائے تھے۔ قاضی صاحب کو انھوں نے اطلاع دی کہ وہ رات کا کھانا ان کے گھر پر کھائیں گے۔ قاضی صاحب نے پوچھا ہمراہ کتنے لوگ ہوں گے۔ معلوم ہوا چار پانچ افراد ساتھ ہوں گے۔

فخر الدین علی احمد صاحب کو کسی میٹنگ میں شرکت کرتے ہوئے آنا تھا۔ انھیں تاخیر ہوگئی اور قاضی صاحب کو ملال۔ تشریف لائے تو دس بارہ افراد ساتھ آگئے۔ قاضی صاحب کا ملال بڑھ گیا۔ خیریت تھی کہ گھر بڑا تھا اور کرسیاں وافر۔ دعوت بحسن وخوبی گذر گئی۔

اس دعوت کے نئے تجربے کا قاضی صاحب نے مجھ سے ذکر کیا۔ کہنے لگے، صاحب! یہ سیاسی لوگ بھی عجیب اخلاق رکھتے ہیں۔ فخر الدین علی احمد صاحب کے ہمراہ جو حضرات تھے ان میں کسی نے بھی بعد طعام شکریہ کہنے کی زحمت گوارا نہ کی۔ ایک صاحب ایم۔ ایل۔ اے تھے۔ نوجوان سے چہرے بشرے سے بدلے لگے۔ فخر الدین علی احمد صاحب کے سامنے یہ شل

خادم سلوک کرتے رہے تھے۔

دیوانِ فدوی کے تین نسخے دستیاب ہو گئے تھے۔ غیر مطبوعہ تذکروں سے اشعارِ فدوی کی نقل نویسی جاری تھی ــــ مخطوطہ شناسی اور قراءتِ اشعار آسان نہیں۔ ابتدا میں نظریں رک رک کر چلیں۔ بعض اشعار و الفاظ چشم اور فہم دونوں پکڑ لیتے۔ انہیں نقل بہ پنسل سے کرتا۔ پٹنہ آتا تو فصیح الدین بلخی مرحوم کی مدد لیتا۔ بوڑھی نگاہ تھی چشمہ لگاتے تھے مگر بدہیئت تحریر یا بدخط الفاظ کو سیاق و سباق کے شکنجہ میں داب کر چٹ سیدھا اور صحیح کر دیتے۔ خدا بخشے، دیوانِ فدوی کے متن کی نقل میں ان سے بڑا تعاون ملا! یہ پٹنہ سیٹی میں رہتے تھے۔ اوائل میں طویل چھٹی کے بیشتر دن ان کے گھر پر گزرتے۔ یہیں دروازہ سے نامراد رہتا تو پھر مددگارِ قاضی سے بامراد جاتا ــــ

قاضی صاحب میں ذہانت غضب کی ہے اور حافظہ بے پناہ۔ عام طور پر قدرت یہ ملکہ ایک ہی فرد کو نہیں دیتی ــــ ان کی تحقیقی سربلندی کی بنیاد ذہانت، حافظہ اور محنت ہے۔ نقل دیوان میں میں دیوانِ فدوی کا ناصاف مصرع پڑھتا اور اسے دوبارہ پڑھنے کی نوبت نہ آتی۔ متن دیکھے بغیر و معنی المعدلفظ مشتبہ کی وضاحت کر دیتے جیسے یہ ان کا کہا کلام ہو!

ان کی زبانی شعر سننے کا اکثر اتفاق ہوا۔ وہ خوش خواں نہیں۔ شعر یوں پڑھتے ہیں کہ ہر رکن کا فردی وجود تسبیح کے دانوں جیسا بے لاگ ہو جاتا پر شعر کی نغمگی نہیں ہوتی ــــ اچھے شعر سن کر مخطوظ ہوتے ہیں، مگر اثر خط عیاں نہیں ہوتا۔ وہ داد دیتے ہیں اور بڑے ضبط کے ساتھ، بندھی آواز تا نخنی ایک لفظ "خوب" کہہ کر۔

ڈاکٹر عندلیب اچھے شاعر تھے اور پریم پجاری کے نام سے اچھا افسانہ نگار بھی تھے۔ یہ دونوں میرے محبوب مصنفوں میں تھے۔

شادانی مرحوم قاضی صاحب کے بے تکلف دوستوں میں تھے۔ پٹنہ آتے تو قاضی صاحب کے یہاں قیام کرتے۔ قاضی صاحب کے رشتہ دار شاہ نجم الدین کاکوی، مقیم حال، پاکستان راوی ہیں :-

دودو بھیا نے مجھے سویرے بلایا کہ ناشتہ ساتھ کرنا۔ ان کے ساتھ ہی میں شادانی صاحب کے کمرے میں داخل ہوا۔ دیکھتے ہی انہوں نے دودو بھیا سے کہا، بھئی رات ایک واقعہ ہوا۔ اس واقعہ نے نیند اچاٹ کر دی۔ دیر تک کروٹیں بدلتا رہا۔ تین پہر رات گئے ایک شعر ہو گیا۔

دودو بھیا نے کہا۔ تفصیل سنایئے۔

شادانی صاحب نے کہا، ان عزیز کے روبرو تفصیل کیا سناؤں۔ صرف شعر سنئے اور یہ کہہ کر قاضی صاحب کو بستر پہ پاس ہی بٹھا لیا۔ بولے، قاضی صاحب! کیا خوب شعر ہے۔ سنئے :-

رات کچھ ایسا تصوّر نے ترے بے خود کیا

میں نے دبی زبان سے اور دودو بھیّا نے اپنی زبانی اس مصرع کو دہرایا اور دوسرا مصرع سننے کے لئے ہم شادانی صاحب کا چہرہ دیکھنے لگے۔

شادانی صاحب نے عالم جذب میں جھومتے ہوئے اسے پھر پڑھا اور پاس ہی پہلو میں بیٹھے ہوئے دودو بھیّا کی گردن میں اپنے دونوں بازو حمائل کرتے ہوئے برجستہ کہا

ڈال کر تیرے گلے میں اپنی باہیں چوم لیں

میں شرما گیا اور دودو بھیا جھینپ گئے۔ شادانی صاحب مسکرانے لگے۔

نقل دیوان میں املا کی بات آگئی۔ قاضی صاحب نے صحت متن پر توجہ مبذول کراتے ہوئے خصوصی ہدایت دی کہ املا میں ضابطہ کی پابندی مقدم ہے۔ میری درخواست پر انہوں نے اس کی تفصیلات بھی لکھ کر دیدیں۔

بتایا کہ اردو میں کسی ہندوستانی لفظ کو ہائے مختفی سے نہیں لکھنا چاہئے، الف سے لکھنا ضروری ہے۔ جیسے کلیجا، پتا، چندا وغیرہ۔ عربی کے الفاظ جن کے آخر میں ہائے مختفی کا اضافہ ہے انہیں ہائے مخفی تو سے لکھنا چاہئے، جیسے تبادلہ تعلیقہ وغیرہ بعض بہت مشہور فارسی الفاظ جو فارسی میں ہائے مختفی سے ہیں اردو میں الف سے لکھے جا سکتے ہیں جیسے لفظ مزا = مزہ

لفظ نھا فارسی میں ہائے مختفی سے ہے مگر اردو میں الف ہی سے لکھنا چاہیے۔ اس لئے کہ کسی نے بھی آج تک ہائے مختفی سے نہیں لکھا۔

فارسی کے وہ الفاظ جن میں تصرف معنوی یا لفظی ہوا ہے وہ مطابق رواج استعمال کئے جائیں۔ جیسے کلیجہ جو دراصل کلیچہ ہے مگر اردو میں عام طور پر کلیجہ ہی لکھا جاتا ہے۔

اخبار، شعرا، اردو فارسی میں ہمزہ نہیں لکھنا چاہیے۔ حالت اضافت میں اخبارے شعرائے پٹنہ یا قدیم فارسی املا اس سے مختلف بھی ہے۔

ذخار = زخار تعذیہ = تعزیہ۔ ذرا لکھنا چاہیے ذرا نہیں مگر اصلی معانی میں ذراۃ۔ واو اظہار کے لئے لکھا جاتا تھا اب غیر ضروری ہے۔ جیسے اوس اسے اُس لکھنا چاہئے۔ لوہار اسے لُہار لکھنا چاہیے، سونار سُنار لکھنا چاہئے۔

حالت اضافت میں ے پر ہمزہ نہیں دینا چاہیے۔ اخبارے شعرائے پٹنہ

احبابِ شعرائے پٹنہ نہیں۔ نغمہ وسرود = نغمہ وسرود نہیں، مگر نغمۂ بلبل لکھنا چاہیے۔
غمخواری من = اس کا املا ہمزہ کے ساتھ بھی صحیح ہے اور ہمزہ کے بغیر بھی۔ اس کی بھی وہی کیفیت ہے جب یائے نکرہ یا ہائے وحدت پر ہمزہ آتا ہے۔

عربی الفاظ میں صرف ہمزہ لکھنا چاہئے جیسے قائم صائب وغیرہ۔

گذشتن گذاشتن اور ان کے مشتقات ذال سے۔ مگر اردو گزرنا ز سے۔ گزاردن ز اور ذال دونوں سے۔

آرائش ، زیبائش : ہمیشہ ی سے علاوہ ہمزہ۔ زیبائش اردو میں ہے فارسی میں نہیں۔ فہمائش فارسی میں نہیں اردو میں بھی کچھ لوگ معترض ہیں مثلاً غالب۔

کام تو چل گیا، پر اردو رسم خط میں اس املائی انتشار کا مسئلہ حل نہ ہوا جو ابتدائے زمانۂ تدریس سے ہی میری فکر کا جزو بنا رہا ہے۔ اس موضوع پر جب بھی سوچتا، اس نتیجہ پر پہنچتا کہ اردو رسم خط اس زبان کی ترویج و اشاعت میں رکاوٹ ہے ـــــ فارسی اور عربی النسل الفاظ کا معاملہ تو معقولیت سے لگ رکھتا ہے، پر اردو الفاظ نراجی عالم میں مبتلا ہیں۔ ایسے چلتے پھرتے سینکڑوں اردو الفاظ ہیں جن کے صحیح املا پر ہم آج تک متفق نہ ہو سکے ـــــ قاضی صاحب سے اس موضوع پر اندلوں بات آئی۔ دتاسی، فوربس ڈنکن، اشپرنگر، گریرسن جیسے عالم زبان کی مثالیں پیش کرتے ہوئے میں عذرداری کرتا کہ رومن رسم خط کے توسط سے اردو دور دیس میں جا پہنچی اور غیر اردو داں ہماری زبان سے دلچسپی لینے لگے کیوں نہ رومن رسم خط کو اب عام کیا جائے؟

قاضی صاحب اختلاف کرتے۔ کہتے کہ دنیا کی کوئی زبان اپنے رسم خط کے ساتھ مکمل ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔ پھر اردو رسم خط میں تبدیلی کیا معنی؟ ــــــ دلیل سے خوش ہو جاتا لیکن دل مطمئن نہ ہوتا۔ غیر اردو داں خصوصاً بڑی عمر کے طلبہ کو اردو سیکھنے میں رسم خط کی وجہ سے جو دشواری اٹھانی پڑتی، اس کا ذاتی تجربہ تھا۔ تجربات کے ان بدیہی نتائج سے پھر آنکھیں کیسے بند کر لیتا؟

چند برس قبل اردو رسم خط کو بدلنے کی بات اٹھی تھی ــــــ شورش چند دانائے اردو نے چھوڑا اور دو چار دانشوروں نے ہونکاری بھری جیسے اندھے کو آنکھ مل جائے، ہندی صحافیوں نے ان محبان اردو کی شان میں قصائد کے دفتر کھول دئے ــــــ قاضی صاحب کے تلوؤں میں آگ لگ گئی۔ اس تحریک کو انھوں نے اردو دشمنی موسوم کیا اور ایسے تمام اہل اردو سے سوشل بائیکاٹ کا مشورہ دیا ــــــ میرے خیالات سے وہ ناواقف نہ تھے۔ نہ جانے کیوں میرے گردن میں بھی اردو دروہی کی مالا ڈال دی گئی۔

مجھے اس کی خبر نہ تھی۔ شعبۂ اردو سے سفینۂ نثر کا ایک کل ہند ادبی پروجکٹ جاری کیا تھا۔ تقریظی کلمات کے لئے قاضی صاحب سے رجوع کیا۔ انھوں نے اشتراک سے قطعاً انکار کر دیا ــــــ بس اسی پر نہ ہوئی۔ رسالہ تحریک دہلی میں مجھ سے انقطاع روابط کا اعلان بھی کر دیا ــــــ آخر کئی ملاقاتوں میں بات صاف ہوئی کہ میں رسم خط کی تبدیلی کا حامی نہیں، رسم خط میں اصلاح کا علم بردار ہوں ــــــ قاضی صاحب کی غلط فہمی دور ہوئی۔ جو بخار تھا سو نکل گیا، ہمارے سابق تعلقات قائم ہو گئے۔

قاضی صاحب کی خفگی ابلتے دودھ کی مثال ہے۔ جوش میں ہے تو جھاگ، سرد ہوا تو ملائی۔ ان کے غصہ میں معاندت نہیں۔ وہ اظہار میں بے باک اور آزاد ہیں۔ ان

کا مزاج مصلحت یا مروت سے میل نہیں کھاتا۔ تکلم ہو یا تحریر، لازماً اظہار میں تیزی اور تندی قلبی کثافت یا کدورت کے لئے تیزاب ہو جاتی ہے۔ کسی سے اگر وہ خفا ہوئے اور زیادہ ہو گئے تو کہیں گے، مجھے ان صاحب کے متعلق اپنی رائے میں تبدیلی کرنی ہوگی ــــــ ڈاکٹر سید حسن عسکری قاضی صاحب کے مقربین میں ہیں۔ ان کے عجز و انکسار کے قاضی صاحب مداح ہیں۔ عسکری صاحب کی سادہ لوحی سے ایک بات قاضی صاحب کو ملال ہوا۔ سخت کبیدہ ہوئے۔ بار بار اس کا ذکر کیا مگر نقش عسکری پر داغ نہ لگا۔

اسی طرح سید حسن صاحب کے ساتھ ایک امر سے دل میں پھانس لگ گئی۔ شکر رنجی سے ملال میں خفگی در آئی۔ چند سے کشیدگی رہی پھر گرم جھونکا جیسی گذر گئی، اے تیری قدرت!

خاکہ سازی میرے لئے دردِ سر ہو رہی تھی۔ لکھنے پڑھنے کی عادت اسکول کے دنوں سے ہی اشتغال زندگی بنی رہی۔ جو پڑھا اپنی پسند سے، جو لکھا اپنی خواہش سے۔ مصلحت یا مطالبہ سے قلم اور نظر نے ہمیشہ عار محسوس کیا ــــــ ریسرچ نیا کام تھا۔ مزاج کو کام اور اقدام کی مطابقت میں کسل مندیا تا۔ تلاش اور چھان بین جاری تھی۔ حصول مواد میں ملاقات اور مراسلات کا سلسلہ قائم تھا۔ اب کاموں کی حد بندی کی ضرورت تھی۔

خاکہ کیسے بنے اور کون بتائے؟ ــــــ اپنی آزادانہ مقالہ نگاری کا سمند جولانہ تھا۔ ضابطے کے حدود میں ایک باضابطہ اور ضخیم تھیسس کا خاکہ بنانا سہل نہ تھا ــــــ سفر کم و بیش ڈیڑھ دو برسوں سے جاری تھا۔ رہنما کئی تھے، ڈاکٹر سید حسن عسکری، پروفیسر محمد مسلم، شاہ عطاء الرحمٰن، فصیح الدین بلخی۔ راہ رو دو تھے، کلیم الدین احمد اور قاضی عبدالودود ــــــ علم و دانش کے دو چشمے مجھے سیراب کر رہے تھے ــــــ خاکہ کیسے بنے اور کون بنائے؟

دوہرا سامنے تھا۔ نگراں کون ہوگا؟ نقاد یا محقق؟ یہ سوال اچانک اٹھ کھڑا ہوا ـــ عام حالات میں ہماری یونیورسٹی کے لئے قاضی عبدالودود بیرسٹر کو اردو میں پی ایچ ڈی تھیسس کا نگراں مقرر کرنا دشوار تھا۔ ایک بار یونیورسٹی نے انہیں ایم۔ اے اردو کا ممتحن بنایا تھا۔ یہ ہمارے اسکول کا خصوصی پیپر تھا۔ نظر توجہ فضل الرحمٰن صاحب کی تھی۔ انھیں اس کا سبق مل گیا تھا۔

ان دنوں فضل الرحمٰن صاحب جی بی بی کالج مظفر پور کے پرنسپل تھے اور آرٹس فیکلٹی کے ڈین۔ قاضی صاحب کی عالمانہ شخصیت اور جرأت اظہار کے یہ قدر دان تھے ـــ قاضی صاحب مخصوص حلقہ میں محترم تھے، پر اساتذہ میں ممتاز نہ تھے۔ ادبی تحقیقات کا ان دنوں وہ چرچا نہ تھا جو آج ہے۔ قاضی صاحب کی سخت گیری سے علمی حلقہ بدحظ تھا۔ نئے پرانے کئی مقبول انام بت توڑ کر انہوں نے سارے قبیلے کو اپنا دشمن بنالیا تھا۔ اچھے سمجھدار لوگ بھی ان کی جانب جلد مائل نہ ہوتے۔

مالک رام اپنی گراں قدر نگارشات کے باوجود، جو تحقیق میں شامل ہیں تنقید میں شمار نہیں، قاضی صاحب کے معیار تحقیق پر پورے نہیں اترتے تھے۔

ذکر غالب مالک رام کی مشہور تصنیف ہے۔ بار بار شائع شدہ اڈیشن اس کتاب کی مقبولیت کا عینی ثبوت ہے۔ غالب کی تاریخ پیدائش کا ذکر مالک رام نے ان الفاظ میں کیا ہے:۔

"مرزا غالب ۸ رجب ۱۲۱۲ھ (۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء) کی رات
میں آگرہ میں پیدا ہوئے۔۔۔"

قاضی صاحب نے اس غیر تحقیقی بیان پر گرفت کی۔ انھوں نے تبصرہ کیا:۔

یہ غالب کی تاریخ پیدائش نہیں۔ یہ مرزا عبداللہ بیگ خاں

خاں کی بیوی عزت النسا بیگم کے اس بچہ کے تولد کی تاریخ ہے
جس کا نام کچھ دنوں بعد اسد اللہ بیگ خاں رکھا گیا اور جو بہت بعد
میں میرزا غالب سے معروف ہوا۔

عطا کاکوی صاحب نے سنا۔ مسکراتے ہوئے بولے، دونوں کی تحقیق غلط۔ یہ تاریخ اور وقت اس نومولود کی پیدائش کا ہے جس کی آمد کی اطلاع دایہ نے زچہ خانہ سے باہر آکر دی کہ عزت النسا بیگم کے بطن سے ایک اولاد نرینہ عالم وجود میں آئی۔ صحیح وقت پیدایش کا علم تو دایہ کو تھا۔

ڈاکٹر خلیق انجم نے قاضی صاحب کی تالیف "اشتر و سوزن" پر قاضی صاحب کے مخصوص انداز سے ہماری زبان یکم ستمبر ۱۹۶۵ء میں تبصرہ فرمایا :۔

محترمی قاضی عبدالودود جیسے محقق پر اردو ادب جتنا ناز کرے کم ہے لیکن انتہائی افسوس کا مقام ہے کہ ان کی صلاحیتیں معمولی کاموں کی نذر ہو چکی ہیں۔

حال ہی میں قاضی صاحب قبلہ کی ایک نئی کتاب "اشتر و سوزن" شائع ہوئی ہے جس میں دو مشہور کتابوں پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ قریب بہ یقین ہے کہ اس کی علّت غائی صرف غلطیاں نکالنا ہے۔ قاضی صاحب کا یہ فعل اس وقت تو جائز تھا جب وہ غلطیوں کے مرتکب نہ ہوتے لیکن ایسی صورت میں جب کہ وہ خود بے احتیاطی سے کام لیتے ہیں کیا انھیں کسی پر بیچ ماننے کا حق ہے ؟

"اشتر و سوزن" میں قاضی صاحب سے جتنے سہو ہوئے ہیں، ان کا تفصیلی ذکر تو آئندہ کبھی کروں گا۔ یہاں صرف اس کتاب کے ٹائیٹل سرورق اور ٹائیٹل کی پشت یعنی کل تین صفحوں کی تحریروں کا جائزہ لینا مقصود ہے۔

(۱) ٹائیٹل پر یہ اطلاع دی گئی ہے کہ کتاب ادارۂ تحقیقات اردو نے شائع

کی ہے لیکن پوری کتاب میں یہ کہیں نہیں بتایا گیا کہ یہ ادارہ پاکستان میں ہے، ہندوستان میں یا ایران میں۔

(۲) سرورق پر مطبع کا نام "مطبع کوہ نور، دہلی" دیا گیا ہے۔ . . دہلی میں کوہ نور پرنٹنگ پریس اور ڈائمنڈ آفسٹ ورکس ہے۔ اس نام کا کوئی پریس نہیں۔

(۳) ٹائیٹل پر سنہ طباعت ۱۹۶۵ دیا گیا ہے۔ اندر سرورق پر ۱۹۶۴ ہے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ کون سنہ درست ہے؟

(۴) سرورق پر کتاب کی قیمت چار روپے درج ہے۔ پشت پر دو جگہ تین روپے اسی پیسے ہے۔ کون قیمت درست ہے؟۔

(۵) سرورق پر عبارت ہے "مطبع کوہ نور دہلی میں چھپ کے کتاب ہوئی ہے"

قاضی صاحب کی تحقیقات لطف لینے کی نہیں۔ ان کی زبان و بیان اور تکنیک پہ آج بھی جملے بازیاں کم نہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ، غل تو بہت یاروں نے مچایا پہ گئے اکثر مان انہیں۔

قاضی صاحب کو حلقۂ خاص الخاص سے حلقۂ خاص میں لانے میں دائرۂ ادب اور اس کے ماہانہ مجلہ معاصر کا بڑا ہاتھ ہے۔ دائرہ کی ماہانہ نشستوں میں ان دنوں قاضی صاحب باضابطہ شریک ہوتے اور علمی و ادبی بحثوں میں حصہ لیتے۔ غیر تحقیق پسند دل و دماغ پر قدِ قاضی کا سایہ پڑنے لگا تھا ـــــــ فضل الرحمٰن مرحوم مجھے مانتے تھے۔ فخر ہے، تدریسی زندگی کے آداب مجھے ان کی مشفقانہ سرپرستی میں حاصل ہوئے۔ میرے ذوق و شوق اور تدریس اساتذہ تدریس پر ان کی غائر نظر رہی۔ اردو داں ذہن کی وجہ سے وہ خود اردو کے نصابی بورڈ کے رکن اور صدر تھے۔ ان کی شرکت سے اردو بورڈ

کا مقدر کھل جاتا اور اکثر اراکین کے منصوبے جی میں رہ جاتے ـــــ وہ اصول کے سخت، معاملات میں کھرے اور ایک مثالی تصور کے انسان تھے۔ معاملہ نصابی کتابوں کے انتخاب کا ہوتا یا ممتحنوں کی نامزدگی کا، مسکراتے ہوئے اس مرتب یا مؤلف ممبر کو میٹنگ سے اٹھ جانے کا اشارہ کرتے۔ ادھر وہ حضرت پیٹھ دکھاتے اور ادھر ان کے پیش کردہ "ادبی کارنامہ" پر رندے چل جاتے ـــــ یہی سلوک ثانی الذکر امر میں ہوتا۔ عمر اور علم کی برتری پر مرحوم کی نگاہ پہلے جاتی۔

پرنسپل فضل الرحمٰن کی توجہ سے قاضی صاحب بہار یونیورسٹی میں اردو ایم اے کے اکزامنر مقرر ہوئے۔ قاضی صاحب رضامند نہ تھے۔ پرنسپل فضل الرحمٰن نے یہ کام میرے سپرد کیا۔ سوالات نجیب اشرف مرحوم نے بنائے تھے۔ وہی پہلے ممتحن بھی تھے۔ جانچ کردہ کاپیاں قاضی صاحب کو بھیجدی گئیں۔

نو دس بجے شب میں عبدالغفور، قاضی صاحب کا ملازم میری تلاش میں گھر پہنچا۔ قاضی صاحب کا پیغام تھا کہ صبح سات بجے ان سے ملوں۔

قاضی صاحب ان دنوں اپنی قیام گاہ کی نچلی منزل کے جنوبی کمرے میں ملاقات کرتے تھے۔ عبدالغفور نے مجھے اندر بٹھایا اور خود اطلاع دینے اوپر چلا گیا ـــــ خلاف توقع مجھے اوپر ہی طلب کیا گیا۔ معمولات کی یہ بے ضابطگی غیر معمولی تھی۔ مجھے حیرت ہوئی۔ خیریت ہے، قاضی صاحب کیسے ہیں؟ میں نے عبدالغفور سے پوچھا ـــــ ٹھیک ہیں۔ آپ ہی کو بلایا ہے۔ چلئے۔

جنوبی حصہ کی سیڑھی سے متصل کمرے میں بیٹھنے کی ہدایت تھی ـــــ سلیپنگ سوٹ پر ڈریسنگ گاؤن ڈالے قاضی صاحب پشت کے کمرہ سے نمودار ہوئے۔ ہاتھ میں بہار یونیورسٹی کا بڑا براؤن لفافہ تھا۔ مصافحہ کرتے ہوئے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ پہلے وہ دروازہ

بند کیا جس سے میں داخل ہوا تھا۔ پھر بیٹھتے ہوئے کہا، صاحب! میں سخت الجھن میں مبتلا ہو گیا اور اس کے ذمہ دار آپ بھی ہیں۔

خیر باشد۔ کیا غلطی ہوئی قاضی صاحب؟

ذمہ داری سے میں بھی بری نہیں ـــــ آپ کو اسی لئے زحمت دی ہے۔ بتایئے میں کیا کروں؟ ـــــ لفافہ سے دو تین کاپیاں نکالیں۔ یہ جانچ کردہ تھیں۔ میری جانب بڑھاتے ہوئے کہا، دیکھئے، کتنے بیہودہ جوابات ہیں۔ یہ دانش گاہوں کے صاحب زادے ہیں۔ ایسی بے سر و پا باتیں لکھتے ہیں۔ انہیں پڑھ کر صحتِ دماغ ختم ہو جائے۔ ایسی تعلیم کو موقوف ہی کر دینی چاہیئے ـــــ

قاضی صاحب جھلا رہے تھے۔ ان کی جانچ کردہ کاپیوں کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ ـــــ کاپیاں دیکھ کر میرے ہوش اڑ گئے۔ ادبی انکشافات یا املائی اختراعات پر نہیں، اوراق کے ان سرخ اور نیلے کراس پر ـــــ ہر جگہ قاضی صاحب نے اغلاطِ مضمون، اغلاطِ بیان اور اغلاطِ املا کو ڈبل پنسل سے چیر کر رکھ دیا تھا! سطریں واغدار تھیں جہاں تہاں "بکواس، جہل مرکب، لغو" جیسے ریمارک علاوہ تھے۔

دبی زبان سے بولا، قاضی صاحب ان اوراق پر ریمارک یا نشانات نہ لگانے تھے۔ غالباً آپ نے ہدایت نامہ پر غور نہ کیا۔

میں نے دیکھا تھا۔ ان صاحب زادوں نے ایسی باتیں تحریر کی ہیں کہ ضبط مشکل تھا۔ نقش املا دیکھئے۔ عبارت دیکھئے۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ کوچہ و بازار میں بھی ایسی ناقص زبان مشاہدہ میں نہ آئے گی۔

بجا ہے قاضی صاحب! معیار دن بدن پست ہوتا جا رہا ہے لیکن۔۔۔ یہ کاپیاں پرائیوٹ اسٹوڈنٹ کی ہیں۔ ان بیچاروں کو ادھر ادھر سے ہی الٹے سیدھے مواد ملے

ہوں گے۔ اس بات کی انہیں . . .

قاضی صاحب نے قطع کلام کرتے ہوئے عامرانہ کہا، میں ان کو جانچنا تضیع اوقات سمجھتا ہوں۔ آپ یہ کاپیاں واپس لے جائیں۔ میں آپ کے رجسٹرار کو لکھ دیتا ہوں کہ مجھے معاوضہ نہ دیا جائے۔

——— اور قاضی صاحب نے سپردم بتو مایۂ خویش را پر عمل کیا۔ میں نے جلد از جلد پرنسپل فضل الرحمٰن کو S.O.S کیا اور حساب کم و بیش ان کے مساعی حسنہ سے رفع دفع ہو گیا ——— وائے بر تعلیم اور نظام تعلیم! یونیورسٹی میں وہ عزت و افتخار سے لائے گئے اور اسی آن بان سے لوٹ گئے۔ یہ واقعہ اکزامینیشن بورڈ سے باہر نہ گیا۔ دو چار افراد تک محدود رہا۔

مثالیں درجنوں ہیں، قاضی صاحب کو جھکانا آسان نہیں ———

یو جی سی دہلی کی اعانت سے علیگڑھ تاریخ ادب کا پروجکٹ عمل میں آیا۔ یہ زبان، ادب اور تاریخ کی ایک سہ جہتی اہم بالشان مہم تھی۔ بورڈ کے ایک ممبر قاضی صاحب بھی نامزد ہوئے۔ مشاورتی کمیٹی کی میٹنگ میں شرکت کی تاریخی ادوار کی تقسیم بندی گفتگو کا اساسی موضوع تھی۔ قاضی صاحب نے اپنی چیختی تلی رائے دی۔ ذہنوں کو متفق نہ پایا فوراً الگ ہو گئے۔

گجرال کمیشن پٹنہ آیا۔ قاضی صاحب کے نام دعوت نامہ گیا۔ حاضر نہ ہوئے اور نہ مفروضات پیش کیں ——— فیصلہ یہ تھا کہ کمیشن چہ معنی؟ مقدمہ اردو برسوں برس پہلے صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرشاد کے روبرو پیش کیا جا چکا ہے۔ اردو کی زبوں حالی حکومت سے پوشیدہ نہیں۔ اب تو اقدام و نفاذ کی ضرورت ہے ——— شام میں مالک رام صاحب کمیشن کے دوسرے اراکین کے ہمراہ ملنے آئے۔ قاضی صاحب نے اپنا نقطۂ نظر کھل کر کہہ دیا۔

بہار میں اردو اکادمی قائم ہوئی۔ فخرالدین علی احمد صاحب کے توسط سے تمری کے ڈی بروا صاحب، گورنر بہار، قاضی صاحب سے ذاتی طور پر واقف تھے۔ انہیں بحیثیت ادیب نامزد کیا۔ قاضی صاحب نے دو ایک میٹنگ میں شرکت کی۔ منصوبوں سے مطمئن ہوئے مگر کارگذاریوں سے غیر مطمئن۔ جانا موقوف کر دیا۔۔۔۔۔ چیئرمین اور گورنر دونوں حیثیتوں سے بروا صاحب نے شرکت کے لئے ذاتی خط لکھے۔ جواب میں استعفا نامہ بھیجدیا۔

محمد ذکی الحق

قاضی صاحب

اپنے نقوش پا سے زمانے کے واسطے
ترتیب دے رہا ہوں نصاب سفر کو میں

قاضی عبدالودود صاحب کی ادبی شخصیت اور مذکورہ شعر کی معنوی حقیقت ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہے۔ اس سے قاضی صاحب کے ادبی مرتبہ پر روشنی پڑتی ہے۔ قاضی صاحب کی شخصیت بہت ہی بلند و بالا ہے۔ لیکن میں نے قاضی صاحب کو جس طرح دیکھا ہے اسے لکھنے کی جرأت کر رہا ہوں۔ یہ اس لیے کہ دیکھ لینا، سن لینا اور معلوم کر لینا نسبتاً آسان ہے لیکن اسے قلمبند کرنا مشکل ہے اور اس فرض کو صحت کے ساتھ انجام دینا تو اور بھی مشکل ہے۔ بہر حال میری یہ کوشش ہے کہ دیکھنے اور لکھنے کی منزل اس طرح طے ہو کہ صداقت مجروح نہ ہو۔

نام عبدالودود ہے اور لفظ قاضی ایک ایسا سابقہ ہے جس سے خاندانی شوکت اور وجاہت عیاں ہے۔ ہندوستان میں برطانوی سامراجیت سے قبل، قاضی ایک شاہی منصب اور عہدہ تھا شریعت کی رو سے احکام نافذ کرنے اور مقدمات فیصل کرنے کی ذمہ داری قاضی کے فرائض منصبی میں داخل تھی۔ قاضی عبدالودود صاحب کے آباد

اجداد میں کئی بزرگ قاضی کے عہدے پر فائز تھے اور یہ سلسلہ کئی پشتوں تک چلا۔

میں نے ابھی کہا ہے کہ "قاضی" ایک ایسا سابقہ ہے جس سے خاندانی وجاہت اور شرافت ظاہر ہوتی ہے۔ لیکن لفظ قاضی جناب عبدالودود صاحب کے نام کا سابقہ بن کر نہ صرف ان کی خاندانی وجاہت اور شوکت کا غماز ہے بلکہ ان کی شخصیت کے باطنی کوائف کا راز داں بھی ہے۔ قاضی صاحب ایک منصف مزاج انسان ہیں، وہ جذبات کے دھارے پر بہ جانے والے انسان نہیں۔ وہ حق پسند ہیں اور دلائل و براہین کے بغیر کسی بات کو تسلیم نہیں کرتے، وہ زندگی کے تمام گوشوں میں حق اور صداقت کے متلاشی ہیں۔ قاضی صاحب اپنے رجحان طبع کے اعتبار سے غیر مقلد ہیں، اور عقلیت پسند ہیں۔ آپ کا شعور یورپ کے سائنٹفک ذہن و شعور سے متاثر ہے۔ آپ شہادت اور دلیل کی عظمت اور فوقیت کے دلدادہ ہیں۔ آپ علم و ادب کی دنیا میں بھی تقلید اور دباؤ کو مضر اور حق و صداقت کے منافی سمجھتے ہیں۔ قاضی صاحب کے خیال میں تقلید ایک طرح کی ذھنی غلامی ہے جو حصول صداقت میں معاون ہونے کے بجائے گمراہ کن ہے۔ قاضی صاحب کا یہ انداز فکر یورپ کے بعض سائنٹیفک نظریہ حیات اور افکار سے ہم آہنگ ہے

(۱) رچرڈ سیسل (۱۷۴۸ - ۱۸۱۰)

The first step to knowledge is to
know that we are ignorant

(۲) رچرڈ وہاٹلے (۱۷۸۷ء—۱۸۶۳ء)

The word knowledge, strictly employed, implies three things, viz truth, proof, and conviction.

(۳) رالف برٹن پیری (۱۸۷۶ء—۱۹۵۷ء)

Knowledge can be achieved only by minds which [illegible] in order that they may be faithful to evidence.

(۴) سپینوزا (۱۶۳۲ء—۱۶۷۷ء)

True virtue is life under the direction of reason.

قاضی صاحب کی عقلیت پسندی، مابعدالطبیعات کے ان تمام پہلوؤں کو جن کے مادی ثبوت فراہم نہیں تسلیم نہیں کرتی۔ کائنات کی تکوین اور تخلیق کے بارے میں قاضی صاحب جب بھی سوچتے ہیں تو خود کو مبہوت پاتے ہیں۔ وہ اس عالم میں خالق اکبر کے امکان کے منکر نہیں۔ قاضی صاحب اپنے بھائی قاضی محمد سعید صاحب کے تابوت کو اٹھتے دیکھ کر اور چہارم کے موقع پر کئی بار اس طرح روئے تھے کہ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ اور گریہ وزاری کی مدھم سسکتی آواز نے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔ چہارم کے موقع پر مجھے یاد ہے جسٹس خلیل احمد صاحب، قاضی صاحب کے قریب تھے، وہ خود آبدیدہ تھے اور انھیں برابر صبر کی تلقین فرما رہے تھے۔ قاضی صاحب نے بھائی کی موت

کو قریب سے دیکھا تھا اور اس کا ان پر کافی اثر بھی تھا، ان دنوں میں برابر قاضی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا، میں نے یہ محسوس کیا کہ قاضی صاحب اپنے بھائی کی دائمی مفارقت سے بہت متاثر ہیں، اور موت کے سامنے انسان کی بے بسی کا انھیں شدید احساس ہے، ایک بار قاضی صاحب نے فرمایا تھا۔ "موت لازماً کسی معلوم سبب کی محتاج نہیں ہے!" ان کا یہ احساس فلسفی کے احساس سے ہرگز کم نہ تھا، قاضی صاحب فلسفہ جبر Determinism کے طرفدار ہیں

انھوں نے ایک بار فرمایا تھا:-

"The things are in the saddle and ride mankind."

قاضی صاحب ماہرین نفسیات کے اس نظریہ کو تسلیم کرتے ہیں جس کی رو سے انسان اور اس کی شخصیت کے نقوش پانچ یا اس کے لگ بھگ کی عمر میں مکمل ہو جاتے ہیں۔ قاضی صاحب اپنے مذہبی عقائد کے اعتبار سے سرسید احمد خاں کے فلسفہ نیچریت سے متاثر ہیں۔ انھوں نے اس کا اعتراف بھی کیا ہے:-

۔ والد صاحب کی وفات کے چند سال بعد میں آزادانہ طور پر کتابوں کا مطالعہ کر سکتا تھا میں نے سید احمد خاں اور شبلی کے مذہبی تصانیف دیکھے اور اس سے صرف یہی نہیں کہ وہ عقائد جو کچھ ترکے میں ملے تھے باطل نظر آئے خود ان اصحاب

لہ[1] نقوش آپ بیتی نمبر صفحہ ۱۰۱۸

کے پیش کردہ دلائل کمزور نظر آتے تھے۔

قاضی صاحب کے والد محترم قاضی عبدالوحید صاحب کا انتقال ۱۳۲۶ھ میں ہوا۔ اس وقت قاضی صاحب کی عمر لگ بھگ ۹ سال تھی۔ میرا قیاس ہے کہ قاضی صاحب نے جب سید احمد خاں اور شبلی کے مضامین اور ان کی تصانیف کا مطالعہ کیا، اس وقت ان کی عمر ۱۵ سال کے قریب تھی۔ سید احمد خاں کے خطبات اور ان کی تفسیر نیچری عقائد سے بھرپور ہے۔ شبلی کی تصانیف میں الکلام پر سید احمد خاں کے دینی عقائد کی چھاپ نمایاں ہے۔ مولانا شبلی نے سیرت النبی کا تفصیلی خاکہ خود ہی ترتیب دیدیا تھا۔ مولانا سید سلیمان ندوی صاحب نے اسی خاکے کے مطابق اس کو مکمل کیا۔ اس کتاب میں معراج روحانی اور جسمانی کی بحث تو ملتی ہے لیکن محاکمہ نہیں ملتا۔ قیاس ہے کہ مولانا شبلی صرف روحانی معراج کے قائل تھے۔ اس سے شبلی کی عقلیت پسندی کے محدود گوشے پر روشنی پڑتی ہے۔ اس سے یہ قیاس کرنا صحیح نہیں کہ مولانا شبلی عقلیت پسند تھے۔ ان کی تحریر میں ایسی باتیں بھی ملتی ہیں جن کے اندر ان کی ناعقلیت پسندی نمایاں ہے۔ بہرحال قاضی صاحب ابھی نوعمر تھے، سید احمد خاں کے خطبات اور شبلی کی الکلام نے ان کے ذہن کو اس طرح جھنجھوڑا کہ وہ روایتی مسلک دینی سے بیزار ہوتے گئے۔

قاضی صاحب ۲۵ یا ۲۶ سال کی عمر میں یعنی ۱۹۲۳ء عیسوی میں انگلستان تشریف لے گئے اور وہاں مختلف علوم وفنون کی کتابیں مطالعہ میں رہیں یورپ کے سفر اور مطالعے نے ان کے اندر خود اعتمادی پیدا کی، آسمانی کتابوں پر سے ان کا اعتماد اور یقین اٹھ گیا، اور کلام ربانی مشکوک نظر

آئے۔ قاضی صاحب ۱۹۲۹ء عیسوی میں انگلستان سے واپس آئے اب وہ ایک مذہبی آدمی کے بجائے ایک بلند سیرت انسان اور اعلیٰ صفات کے حامل تھے۔ قاضی صاحب خدمت خلق کو انسان کا واحد نصب العین قرار دیتے ہیں۔ ادیان کا مقصد اور ان کی روح بھی خدمت خلق ہے۔

قاضی صاحب سے میں بہت قریب رہا ہوں۔ تقریباً ۲۵ سالوں سے میں قاضی صاحب کا نیازمند ہوں، اس طویل مدت میں بارہا مختلف اوقات میں شرف ملاقات حاصل کرتا رہا ہوں۔ میں جب بھی اور جس وقت بھی حاضر ہوا خلوص اور محبت کے ساتھ پیش آئے۔ قاضی صاحب ملاقات کے لئے پہلے سے وقت مقرر کر کے ملنے کی عادت کو پسند فرماتے ہیں۔ خود بھی اس کے عادی ہیں، اور دوسروں سے بھی یہی توقع رکھتے ہیں، وقت مقرر کر لینے کے بعد اس کی خلاف ورزی کرنے کی عادت کو پسند نہیں کرتے۔ قاضی صاحب کا خیال ہے کہ اگر اس کا موقع ہو تو پروگرام یعنی Appointment کو بذریعہ خط یا ٹیلیفون ملتوی کرنا یا رد کرنا ملنے والے کے فرائض میں داخل ہے۔ ناگزیر حالات میں اس کی فرضیت ختم ہو جاتی ہے، لیکن تہذیب کا تقاضا یہ بھی ہے کہ پھر جب بھی ملاقات ہو تو اس کی معذرت کرنی بھی ضروری ہے۔ میں نے اکثر اس طرح کی خلاف ورزیاں کی ہیں اور قاضی صاحب نے از راہ کرم برابر معاف بھی کیا ہے۔ آخر میں قاضی صاحب نے ازراہ کرم مجھے اجازت دے رکھی ہے کہ میں بغیر وقت مقرر کئے ہوئے بھی ان کی خدمت میں

حاضر ہو سکتا ہوں۔ اور تحقیقی امور میں ان کے مشورے حاصل کر سکتا ہوں۔

قاضی صاحب فطری طور پر مہمان نواز ہیں۔ ملک کے مشہور ادیبوں سے قاضی صاحب کے یہاں ملاقات ہوئی ہے۔ قاضی صاحب بہت ہی خندہ پیشانی سے عظیم آباد میں باہر سے آتے ہوئے ادیبوں کو بطور مہمان ٹھہرا لیتے ہیں۔ میں نے ڈاکٹر نظام الدین مرحوم پروفیسر و صدر شعبۂ فارسی، عثمانیہ یونیورسٹی، حیدر آباد دکن، سید مسعود حسن رضوی مرحوم صدر شعبہ اردو و فارسی لکھنؤ یونیورسٹی لکھنؤ، ڈاکٹر عبدالقادر سروری مرحوم، صدر شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی، حیدر آباد، ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی، صدر شعبہ اردو و پروفیسر شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی دہلی، عبیدالرحمٰن خاں شیروانی، ٹریزرر، علی گڑھ یونیورسٹی، علی گڑھ، ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی، پروفیسر و صدر شعبہ فارسی، عربی اور اردو، کلکتہ یونیورسٹی، کلکتہ، ڈاکٹر مختارالدین احمد آرزو، صدر شعبہ عربی، علی گڑھ یونیورسٹی علی گڑھ، ڈاکٹر محمد حسن، پروفیسر جواہر لال نہرو یونیورسٹی دہلی، کو قاضی صاحب کے یہاں مقیم دیکھا ہے۔ ان حضرات کے علاوہ مسٹر نورالدین احمد، بیرسٹر سپریم کورٹ دہلی، و میئر دہلی، عزت مآب مسٹر فخرالدین علی احمد صاحب بھی جب ان کا قیام آسام میں تھا، قاضی صاحب کے یہاں قیام پذیر ہوئے ہیں۔ آخرالذکر دونوں حضرات قاضی صاحب کے حلقۂ احباب میں ہیں۔ قاضی صاحب نے باہر سے آئے ہوئے بعض ادیبوں اور پروفیسروں کو چائے یا رات کے کھانے پر مدعو کیا ہے، پروفیسر احتشام حسین، ڈاکٹر نذیر احمد، ڈاکٹر امیر حسن عابدی، کے نام اہم ہیں۔ ایک بار ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب، گورنر صوبہ بہار کو بھی قاضی صاحب نے شب

کے کھانے پر مدعو کیا تھا۔ قاضی صاحب اس دن بہت خوش نظر آرہے تھے، ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے علاوہ تمام مہمانوں کی خاطر مدارات میں قاضی صاحب پیش پیش تھے۔

قاضی صاحب کے احباب اور ان کے نیاز مندوں کا حلقہ بہت وسیع ہے، وہ مخلص انسان ضرور ہیں لیکن کسی دوست کے لیے، کسی عزیز کے لیے یا خود اپنے لیے بے اصولی کو روا نہیں سمجھتے۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ ناجائز توقعات سے محروم رہتے ہیں، اور اس پہلو سے قاضی صاحب کی شخصیت زیادہ مفید اور سود مند نظر نہیں آتی ہے۔ قاضی صاحب مبالغے اور جھوٹ کو پسند نہیں کرتے، وہ غلط بیانی، مبالغہ اور جھوٹ کو ایک عظیم انسانی کمزوری سمجھتے ہیں، اسی باعث وہ غالب، محمد حسین آزاد، شاد عظیم آبادی اور سید احمد دہلوی (مولف فرہنگ آصفیہ) وغیرہ کی غلط بیانیوں کو گمراہ کن تصور کرتے ہیں۔ اور اسی لیے ان کی نشاندہی کو ضروری سمجھتے ہیں، اسی خیال کے پیش نظر انھوں نے ڈی لٹ اور پی ایچ ڈی کے چند مقالوں[1] پر طویل تبصرے لکھے۔ بعض لوگ ان کے اس انداز فکر اور طرز عمل کو پسند نہیں کرتے اور ان سے

---

[1] (الف) تبصرہ بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا (مقالہ تحقیقی برائے ڈی لٹ از ڈاکٹر اختر احمد اورینوی) لوائے ادب بمبئی نومبر ۵۸ء ۵ قسطوں میں۔

(ب) تبصرہ مرزا محمد علی فدوی کا عصر حیات، شاعری اور کلام (مقالہ تحقیقی برائے پی ایچ ڈی از ڈاکٹر محمد حسنین) ماہنامہ صنم پٹنہ ۱۹۵۹ء۔ بہار نمبر

(ج) تبصرہ مثنویات راسخ (مقالہ تحقیقی برائے پی ایچ ڈی از ڈاکٹر ممتاز احمد) ہماری زبان نومبر ۱۹۵۸ء۔

دوسرے بلند پایہ تعمیری ادبی کاموں کے خواہش مند نظر آتے ہیں ایسے لوگوں سے یہ سوال پوچھا جا سکتا ہے کہ کیا غلطیوں کی نشاندہی تعمیری کام نہیں ہے؟ بہرحال تحقیق کے میدان میں قاضی صاحب نے صدق وکذب کو پرکھنے کی اہمیت پر زور دیا ہے۔ اس میدان میں رعایت، مروت، اور چشم پوشی کو وہ گناہ کبیرہ سے کم نہیں سمجھتے۔ قاضی صاحب کی یہ صاف گوئی اور بیباکی بعض لوگوں کے لئے بارِ خاطر ہو جاتی ہے۔ قاضی صاحب "من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو" کے قائل نہیں۔ یہی سبب ہے کہ بعض لوگ کبیدہ خاطر ہو جاتے ہیں، اور تعلقات کی استواری اور اس کی گرفت ڈھیلی پڑ جاتی ہے اور اس کے نتیجے میں دوستی یا تعلقات بڑھتے نہیں کمزور ہو جاتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ قاضی صاحب کے تعلقات کا حلقہ وسیع ہے لیکن حلقۂ احباب محدود ہے۔

میں نے قاضی صاحب کو تم کر کے مخاطب کرنے والوں میں صرف دو تین آدمیوں کو دیکھا ہے ایک مسٹر حیدر امام بارایٹ لا، پٹنہ اور دوسرے مسٹر نورالدین بارایٹ لا، سپریم کورٹ دہلی۔ ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی مرحوم قاضی صاحب سے عمر میں تقریباً دو سال بڑے تھے۔ یہ دونوں بچپن میں ساتھ رہے تھے، قاضی صاحب کے والد قاضی عبدالوحید صاحب کے قائم کئے ہوئے مدرسہ میں ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی صاحب نے درسیات کی کتابیں پڑھی تھیں۔ ان دونوں میں بڑے مراسم اور روابط تھے۔ صدیقی صاحب قاضی صاحب کو تم ہی کہتے تھے۔ ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی صاحب کو حکومت بہار نے انگلستان جا کر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے ایک

معقول اسکالرشپ دی تھی اس لئے وہ قاضی صاحب سے تقریباً ایک سال قبل انگلستان گئے تھے۔ قاضی صاحب انگلستان تشریف لے گئے تو وہ ڈاکٹر زبیر صدیقی کے مہمان رہے اور انھیں کے مشورے سے پہلے مڈل ٹمپل میں پھر کیمبرج میں داخلہ لیا۔ قاضی صاحب کی تحریر سے یہ ثابت ہے کہ ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی ان کے دوست تھے۔ انھوں نے ڈاکٹر صاحب کی وفات پر اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے اس میں انہوں نے یہ لکھا ہے :

"محمد زبیر[۵] صدیقی میرے قدیم ترین دوست تھے۔ ان کے والد حکیم محمد اسحٰق اور میرے والد قاضی عبدالوحید میں گہرے دوستانہ تعلقات تھے۔ محمد زبیر صدیقی عمر میں مجھ سے برس چھ مہینے بڑے تھے ہم دونوں بچے ہی تھے کہ دوستی ہو گئی۔"

قاضی صاحب کو بھی مندرجہ بالا حضرات کو تم ہی کہہ کر خطاب کرتے دیکھا ہے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب اور قاضی صاحب کے درمیان دوستی تھی لیکن بے تکلفی نہ تھی۔ ذاکر صاحب "محبی" لکھا کرتے تھے مسٹر معین الواثق، بار ایٹ لا، وائس پرنسپل لا کالج (ریٹائرڈ) کیمبرج اور لندن میں قاضی صاحب کے ساتھ رہے اور بے تکلف بھی رہے۔ لیکن اب ان کو قاضی صاحب کے یہاں آتے جاتے بہت کم دیکھتے ہیں، مگر ان دونوں کے درمیان کوئی رنجش بھی نہیں ہے۔ محمود شیر صاحب، پٹنہ سیٹی یا عظیم آباد (شہر کا پرانا حصہ) میں قاضی صاحب کے ہم محلہ تھے اور ہم عمر بھی تھے۔ اس لئے ان سے

---

۵ ہفتہ وار "ادرنگ" پٹنہ۔ جلد ۲ شمارہ ۱۵-۱۶ مشترکہ۔ ص ۲۔

خوب تعلقات اور مراسم تھے۔ محمود کشیر و صاحب ترک موالات کی تحریک میں خوب پیش پیش تھے۔ قاضی صاحب بھی سیاسی تگ و دو میں ان کے ساتھ رہے۔ عزت مآب فخر الدین علی احمد صاحب اور قاضی صاحب کے درمیان تعلقات دوستانہ ہیں۔ عزت مآب فخر الدین علی احمد صاحب کے صدر جمہوریۂ ہند ہونے کے قبل قاضی صاحب جب بھی دہلی تشریف لے گئے جناب فخر الدین علی احمد صاحب ہی کے یہاں قیام فرمایا۔ شبستان دہلی میں صدر جمہوریہ کا ایک انٹرویو شائع ہوا ہے اس سے ظاہر ہے کہ قاضی صاحب نے پہلی بار انھیں پنڈت جواہر لعل نہرو سے ملایا تھا۔ پنڈت جی سے قاضی صاحب کی ملاقات شریمتی کملا نہرو کے واسطے سے ہوئی تھی۔ اس کی صورت یہ تھی۔ قاضی صاحب کیمبرج میں تھے، اکنومکس میں ٹرائپوس کر رہے تھے، تعلیم کا سلسلہ چل رہا تھا، امتحان کے مرحلے طے ہو رہے تھے لیکن اچانک بیمار ہو گئے۔ چھ ماہ لندن سینیٹوریم میں مقیم رہے پھر سوئزرلینڈ میں موتھانہ کے سیتا بلیمان اسٹفانو Catalinas Mont Slepanne میں پانچ چھ ماہ قیام کرنا پڑا۔ یہاں شریمتی کملا نہرو بھی بغرض علاج داخل ہوئیں۔ اس سینیٹوریم کے ایک ہی گوشے میں دونوں کے الگ الگ کمرے تھے۔ لیکن ڈائننگ روم اور بالکونی مشترک تھے طریقۂ علاج میں یہ لازمی تھا کہ صبح، دوپہر، اور شام یعنی تین وقت دو دو گھنٹے بالکونی میں بستر پر لازماً لیٹے رہیں۔ اس طرح چھ گھنٹے یومیہ ایک ہی بالکونی میں شریمتی کملا نہرو، اور قاضی صاحب لیٹے رہتے۔ پنڈت جواہر لعل نہرو برابر اپنی اہلیہ کی دیکھ بھال اور ملاقات کے

لیتے آتے رہتے تھے۔ قاضی صاحب سے ربط اور مراسم قائم ہوئے شریمتی
اندرا گاندھی کا سال ولادت ۱۹۱۷ء عیسوی ہے۔ اس لحاظ سے ان دنوں
ان کی عمر لگ بھگ آٹھ سال تھی۔ ان دنوں وہ سوئٹزرلینڈ ہی میں کسی
اسکول میں پڑھتی تھیں تعطیل اور فرصت کے موقع پر برابر سینیٹوریم
تشریف لاتیں۔ قاضی صاحب صحتیاب ہوکر کیمبرج واپس ہوئے اور وہاں
ان کی تعلیم کا سلسلہ دوبارہ شروع ہوگیا۔ قیام کیمبرج کے دوران میں
قاضی صاحب نے شریمتی کملا نہرو، پنڈت جواہر لال نہرو، اور شریمتی
اندرا گاندھی کو دن کے کھانے پر مدعو کیا۔ سب لوگ شریک دعوت
ہوئے۔ پنڈت موتی لعل نہرو کو بھی جو ان دنوں وہاں تھے، مدعو کیا گیا
تھا لیکن وہ کسی سبب سے شرکت نہیں کرسکے تھے۔ پنڈت جواہر لعل نہرو
نے شریمتی کملا نہرو اور شریمتی اندرا گاندھی کو کیمبرج کے اہم گوشے
دکھلائے تھے۔ خصوصی طور پر اپنا وہ کمرہ بھی دکھایا جس میں دوران تعلیم
میں وہ رہتے تھے۔ پنڈت جواہر لعل نہرو نے بچوں کے ساتھ کشتی
رانی Rowing بھی کی جو ان دنوں ان کا ایک محبوب مشغلہ
تھا۔ قاضی صاحب کی شریمتی کملا نہرو کے بھائی مسٹر کول سے بھی خوب ملاقات
تھی، مسٹر کول ایک زمانے میں پٹنہ کے کسی بینک میں کسی اعلیٰ عہدے
پر مامور تھے۔ پٹنہ میں "شانتی نکیتن" کی دوسری منزل پر سامنے والے
فلیٹ میں قاضی صاحب رہتے تھے اور ٹھیک اس کی پشت والے فلیٹ
میں مسٹر کول رہتے تھے۔ مسٹر کول خود بھی اور ان کے گھر کی تمام عورتیں بہت
ہی صاف ستھری اردو بولتی تھیں۔ مسٹر کول سے قاضی صاحب کے ایک اچھے

پڑوسی کے تعلقات تھے۔

ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو، ڈین فیکلٹی آف آرٹس، علی گڑھ یونیورسٹی علی گڑھ، قاضی صاحب سے نیاز مندانہ ملتے ہیں۔ انھوں نے قاضی صاحب کی شخصیت سے متعلق ایک مضمون بھی نقوش کے شخصیت نمبر کے لئے لکھا تھا جو تاخیر کے سبب شخصیت نمبر کے بعد کسی دوسرے شمارے میں شائع ہوا۔ قاضی صاحب کے بہت سے خطوط بھی ڈاکٹر آرزو کے پاس محفوظ ہیں۔ ڈاکٹر آرزو کو ان کی علمی اور تحقیقی سرگرمیوں کے سبب قاضی صاحب بہت عزیز رکھتے ہیں لیکن ان کی تحقیقی فروگزاشتوں کی نشاندہی سے غفلت نہیں برتا کرتے۔ بہار کے ادیبوں، شاعروں اور اہل علم حضرات سے ان کے تعلقات بڑے خوشگوار ہیں اور سبھی ان کا احترام کرتے ہیں۔ پروفیسر کلیم الدین احمد، پروفیسر سید حسن عسکری، پروفیسر سید حسن سرمد، پروفیسر عطاء الرحمٰن عطا کاکوی، ڈاکٹر محمد محسن، ڈاکٹر سید صدر الدین احمد فضا، جناب جمیل مظہری افسر الدولہ فیاض الدین حیدر، ڈاکٹر عابد رضا بیدار، ڈاکٹر محمد حسنین، جناب جوہر نظامی ڈاکٹر محمد صدیق، ڈاکٹر محمد نعیم، ڈاکٹر ممتاز احمد، ڈاکٹر علی حیدر نیر، جناب قیوم خضر مدیر اشارہ، ڈاکٹر سید ظہیر حسن، ڈاکٹر اطہر شیر، جناب سمیع حیدر وغیرہ کے قاضی صاحب سے اچھے مراسم ہیں۔ قاضی صاحب کو ذاتی طور پر کسی سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ وہ وعدہ خلافی، بدعہدی، غلط بیانی اور بیجا غرور ہمہ دانی سے خوش نہیں ہوتے بلکہ ان کی طبیعت کو انقباض ہوتا ہے اور اس پر بیباکی سے اظہار خیال فرماتے ہیں۔

قاضی عبدالودود صاحب ایک بلند پایہ محقق ہیں۔ تحقیق کے مختلف گوشے اور اس کے نشیب و فراز کی انھیں پوری واقفیت حاصل ہے۔ غزلیات

میرحسن کو ایڈٹ کرنے کے سلسلے میں آپ سے میں نے بہت سارے مشورے حاصل کئے اور آپ نے بڑی فراخدلی سے اپنا بہت سا را قیمتی وقت بھی عنایت کیا اور سود مند مشوروں سے مجھے نوازا بھی۔ قاضی صاحب محض حالات و واقعات کی چھان پھٹک کو تحقیق کا مدعا نہیں سمجھتے بلکہ الفاظ کی تحقیق کو بھی اہم تصور کرتے ہیں۔ آپ کو الفاظ کی تحقیق کی فکر ہمیشہ دامن گیر رہی ہے۔ غزلیات میرحسن کی ترتیب کے زمانے میں جب بھی بغرض مشورہ حاضر ہوا، صحت الفاظ کی طرف بھی توجہ فرماتے رہے۔ قاضی صاحب کا حافظہ بہت ہی مضبوط ہے۔ وہ تحقیقی امور پر بڑی محنت کرنے کے عادی ہیں۔ میرحسن نے ایک جگہ 'چاؤ چوز' کی ترکیب استعمال کی ہے۔ اس لفظ کو ادنیٰ تغیر کے ساتھ سودا نے 'چوز چاؤ' لکھا ہے۔ اور انشا نے 'چاہ چوج' استعمال کیا ہے۔ قاضی صاحب کی تحقیق کے مطابق یہ لفظ برج کا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ تمام کلاسیکی شعرا کے کلیات سے ایسے الفاظ کی فرہنگ تیار کی جائے جو خصوصی طور پر مخصوص معنی میں استعمال ہوئے ہیں اور ان کی تحقیق کی جائے۔ ہمارے کلاسیکی شعرا کے یہاں ایسے بے شمار الفاظ اور ترکیبیں ملتی ہیں، جن کا تعلق مخصوص رسم و رواج، عادات و خصائل، اور تہذیب و معاشرے سے ہے۔ ان کی صحیح نشاندہی ہونی چاہیے اور ان کے مخصوص معانی کی وضاحت ہونی چاہیے۔ میرحسن کی مثنویوں میں زیورات اور کھانوں کے نام ملتے ہیں، معلم اردو کا صرف یہ کہنا کہ ایک زیور کا نام ہے یا صرف یہ کہنا کہ کھانے کی ایک قسم کا نام ہے، کافی نہیں ہے۔ اس طرف تحقیقی کام کرنے والوں کو توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ فرہنگ غالب کی طرح، فرہنگ

سوداؔ، فرہنگ میرؔ، فرہنگ مصحفیؔ، فرہنگ نظیر اکبر آبادی اور فرہنگ میر حسن وغیرہ تیار کیے جائیں۔ یہ کام مشکل نہیں ہے لیکن محنت طلب ضرور ہے۔ اس طرح لغت نویسوں کو بھی مدد ملے گی۔ آج کل قاضی صاحب فرہنگ آصفیہ کی طرف متوجہ ہیں۔ صحت کی کمزوری کے باوجود، اغلاط فرہنگ آصفیہ کی نشاندہی میں مصروف ہیں۔ دیباچۂ فرہنگ میں سید احمد دہلوی نے غلط بیانی، اور بجائے تحمید مباہات کے غرۂ ہمہ دانی اور دوسروں کی تذلیل کا لب ولہجہ اختیار کیا ہے، قاضی صاحب کو تحریر کا یہ تیور پسند نہیں، وہ ان دنوں مؤلف فرہنگ آصفیہ کی قلعی کھولنے میں لگے ہوئے ہیں۔

قاضی صاحب کی شخصیت اور ان کی علمی ریاضت کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ ان کے مضامین بڑے قیمتی ہیں، ان کی افادیت سے کسی کو انکار نہیں۔ ان کا اسلوب تحریر تحقیق کے شایانِ شان ہے۔ تحقیق کی زبان الگ ہوتی ہے۔ تنقید کی زبان بھی مخصوص انداز کی ہوتی ہے، کلیم الدین احمد کی شگفتہ نثر اس کی عمدہ مثال ہے۔ انشائیے کا اپنا انداز ہے۔ قاضی صاحب اس فرق کو پوری طرح ملحوظ خاطر رکھنے پر مصر ہیں۔ قاضی صاحب اپنے تحقیقی مضامین کے اندر علامات مقرر کرتے ہیں، ان سے اختصار و ایجاز مد نظر ہوتا ہے علامتوں کے سبب مقالہ کبھی کبھی عام لوگوں کے لیے بوجھل ہو جاتا ہے۔ قاضی صاحب کے مضامین اور مقالے عام لوگوں کے لیے نہیں ہوتے، خواص ہی ان کے مضامین کو پڑھتے ہیں اور ان سے مستفید ہوتے ہیں۔ قاضی صاحب کی ادبی خدمات بحیثیت مجموعی بڑی گراں قدر ہیں۔ ان کے مخالف بھی جب ان کا نام آتا ہے یہ شعر پڑھتے ہیں:۔

خدا بھلا کرے اے شاد نکتہ چینوں کا
بتا دیا مجھے بچ بچ کے راستہ چلنا

قاضی صاحب ایک منفرد شخصیت کے مالک ہیں، ان کی شخصیت کا پرتو ان کے فن پر بھی صاف نمایاں ہے۔ قاضی صاحب کی شخصیت اور ان کے فن کی انفرادیت ایوان ادب میں ایک تابناک مشعل ہدایت کی حیثیت رکھتی ہے۔

قاضی صاحب کے ادبی مرتبہ کے بارے میں یہ رائے تنہا نہیں بلکہ چند ہم نوا اور بھی ہیں۔ ڈاکٹر محمد حسن لکھتے ہیں :۔

"پچھلے چند برسوں[1] میں بلاشبہ اردو تحقیق کا مذاق عام اور اس کا معیار زیادہ بلند ہوا ہے۔ اس کے لب و لہجے اور رنگ و آہنگ میں بھی تبدیلی آئی ہے اور اس کی اہمیت کا احساس اور عرفان بھی پیدا ہوا ہے۔ اس تبدیلی کا سہرا بڑی حد تک قاضی عبدالودود کے تحقیقی مضامین کے سر ہے جن کی سخت گرفت اور تیز ای لب و لہجے نے اچانک تحقیق کے میدان میں قدم رکھنے والوں میں نئی ذمہ داری اور زیادہ سخت ڈسپلن کا احساس پیدا کیا۔ قاضی عبدالودود نے اپنے مضامین میں صرف اعتراضات نہیں کئے بلکہ نکتہ چینی کے ساتھ ساتھ غلط بیانیوں یا نیم صداقتوں کے مقابلے میں نہایت عرق ریزی اور دیدہ وری سے صحیح حقائق کو پیش کر کے تحقیقی کام کی ایک نئی سطح پیش کی، ان کا معیار بلند اور مطالبے سخت ہیں لیکن وہ ان مطالبوں اور معیاروں کو پہلے خود اپنے لئے اختیار کرتے

---

[1] آج کل اردو تحقیق نمبر ۱۹۶۷ء ص ۲۴۰

ہیں، پھر ان کا تقاضہ دوسروں سے کرتے ہیں، اس کا نتیجہ صحت مند تحقیقی رجحان کی شکل میں سامنے آیا۔"

عندلیب شادانی صاحب نے ایک بار قاضی صاحب کو لکھا تھا۔

"قاضی صاحب! آج کل پی ایچ ڈی کا جو معیار ہے اس کے لحاظ سے کسی بڑے کارنامے کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ بنگال میں اردو بلاشبہ بہت وسیع موضوع ہے۔ لیکن میرے نزدیک پی ایچ ڈی کے تھیسس کے لیے اس جامعیت کی ضرورت نہیں جو آپ کے پیش نظر ہے، جامعیت کا جو معیار آپ کے ذہن میں ہے اس کے لیے تو ڈی لٹ سے بھی کوئی بڑی ڈگری ہونا چاہئے۔ بہر حال آپ کا مشورہ مفید اور مناسب ہے۔ حتی الوسع موضوع کو محدود اور مختصر کرنے کی کوشش کی جائے گی۔"[1]

قاضی صاحب کا معیار کافی بلند ہے۔ حضرت شادانی کے مذکورہ بالا خط سے صاف ظاہر ہے۔ قاضی صاحب کے معیار اور ان کی صلاحیتوں کے اکثر لوگ قائل ہیں۔ علی جواد زیدی لکھتے ہیں:۔

ولایت[2] سے بیرسٹری کی ڈگری اور مرض لائے، بیماری کی وجہ سے محنت ممنوع تھی باہر سفر وغیرہ پر بھی نہ جاتے تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ بیرسٹری کی ڈگری صرف زیب افسانہ رہ گئی لیکن کیمبرج کے علمی ماحول، فرانس کے علمی حلقوں سے تعارف اور گھر بیٹھے

---

[1] عندلیب شادانی (۳۱ نیل کھیت روڈ ڈھاکا ۲) نے ۲۷ مارچ ۱۹۶۱ کو خط لکھا تھا
[2] آج کل اردو تحقیق نمبر ص ۷۶

مطالعے کی سہولتوں نے انھیں کتابوں کے طلسم خانے میں لا کھڑا کیا یہ اردو کی خوش قسمتی تھی کہ کسی اور طرف جھکنے کے بجائے یہ اردو کی طرف جھک پڑے۔

قاضی صاحب کا مطالعہ صرف اردو تک محدود نہیں ہے، انھوں نے عربی، فارسی، فرانسیسی اور انگریزی کو بھی شرف مطالعہ بخشا ہے۔ لیکن حق یہ ہے کہ فارسی اور اردو ادب پر ان کے مطالعے کی وسعت کی تھاہ پانا مشکل ہے۔ اسی کے ساتھ تاریخ کے بھی بہت اچھے طالب علم ہیں، قانون کی تعلیم نے منطقی تجزیے کی قوتیں بھی ابھاری ہیں۔ اس پر ماشاءاللہ بعید آزاد خیال ہیں۔ یہ کسی بات کو بے دلیل قبول نہیں کرتے۔ اور خود جب لکھنے پر آتے ہیں تو مسئلہ کے تمام مالہٗ و ماعلیہ پر نظر رکھتے ہیں۔ فی الحقیقت ان کے نوشتہ مختصرات داشت ارت میں اور ان کے ذہن میں معلومات کا ایک سمندر موجزن ہے۔ بعض اوقات معلومات کی یہ فراوانی ان کی تخلیقات کے لیے سدِ راہ بن جاتی ہے۔ سب مواد کیسے سمیٹا جائے ....

ان کے مضامین نے موجودہ دور کے محققین کو راستہ دکھایا ہے بنیادی مواد فراہم کیا ہے بعض وفات کے تار و پود بکھرے ہیں۔ ....

غرض تحقیق کی اکثر وادیوں میں قاضی عبدالودود کے نقش قدم ملتے اور سمت و منزل کا پتہ دیتے ہیں۔"

اردو تحقیق پر قاضی صاحب کا جو احسان ہے وہ بھلایا نہ جائیگا

دیکھو تو دلفریبیٔ انداز نقش پا
موج خرام ناز بھی کیا گل کتر گئی

سید حسن

قاضی صاحب

جناب قاضی عبدالودود صاحب سے میری شناسائی تقریباً چالیس سال سے ہے۔ میں پہلی مرتبہ ان کی خدمت میں جناب شرف عالم آرزو جلیلی مرحوم کے ساتھ ۱۹۳۵ء میں حاضر ہوا جب جناب قاضی صاحب پرانا قدم کنواں محلے میں جناب حسن جان صاحب وکیل مرحوم کے مکان میں سکونت پذیر تھے اور رسالہ معیار ان کی مدیریت میں شائع ہوتا تھا۔ اس وقت مجھے یاد نہیں کہ اس پہلی ملاقات میں قاضی صاحب سے کیا باتیں ہوئیں۔ جب میں اسی سال میں رانچی چلا گیا اور وہاں اکاؤنٹنٹ جنرل بہار کے آفس میں ملازم ہو گیا تو وہاں سے آرزو جلیلی مرحوم سے میری مکاتبت کا سلسلہ جاری رہا۔ انھوں نے قاضی صاحب کی فرمائش پر ایک انگریزی مضمون مجھے اردو میں ترجمہ کے لئے بھیج دیا۔ یہ مضمون روسی مصنف چیخوف کے ناولوں سے متعلق تھا۔ رانچی میں میرے پاس انگریزی اردو لغت کی کوئی کتاب موجود نہ تھی اور نہ اس شہر میں کہیں دوسری جگہ ملنے کی امید تھی۔ جس طرح بن پڑا میں نے اس مضمون کا اردو ترجمہ کر کے آرزو جلیلی مرحوم کے پاس بھیج دیا۔ میرا ترجمہ قاضی صاحب کو پسند نہیں آیا۔ انھوں نے اس میں جا بجا اصلاح کر دی، بلکہ جملے کا جملہ بدل دیا، لیکن یہ مضمون معیار میں شائع نہ ہو سکا، کیوں کہ شاید اس کی اشاعت ہی بند ہو گئی تھی۔

اے جی آفس کی ملازمت ترک کر کے جب میں پٹنہ واپس آ گیا اور یہاں

فارسی اردو کے لکچرر کی حیثیت سے میری تقرری بی ان کالج میں ہوگئی تو پھر قاضی صاحب کی خدمت میں بار بار حاضر ہونے کے مواقع ملتے رہے۔

۱۹۴۰ء میں 'دائرہ ادب' قائم ہوا، اور 'معاصر' جاری کیا گیا، دائرہ کی میٹنگیں تقریباً ہر ماہ ہوا کرتی تھیں اور ان میں 'معاصر' کے لیے مضامین اور اس کے انتظامی امور کے متعلق سوچ بچار ہوتا تھا، قاضی صاحب بھی دائرہ کے جلسوں میں خصوصی مہمان کے طور پر شریک ہوتے اور اپنے مشوروں سے مستفید کرتے تھے، وہ اس کے لیے تحقیقی مضامین بھی لکھتے تھے۔ 'دائرہ ادب' اور 'معاصر' سے میری اور قاضی صاحب کی وابستگی کی وجہ سے مجھے ان کے نزدیک آجانے کا اور ان کی صحبت سے مستفید ہونے کا موقع ملتا رہا۔ دائرہ ادب کے جلسوں اور ان کے مکان پر کی صحبتوں میں ان کی گفتگو سے ان کی وسعت معلومات اور غیر معمولی قوت حافظہ پر ہمیں حیرت ہوتی تھی۔ ۱۹۵۵ء میں جب میں ایران جانے لگا تو قاضی صاحب نے فارسی کی کئی قدیم کتابوں کو وہاں تلاش اور حاصل کرنے کی فرمائش کی۔ ان میں ایک 'سرمہ سلیمانی' مولفہ تقی اوحدی صاحب تذکرہ عرفات العاشقین بھی تھی، یہ فارسی کی ایک قدیم فرہنگ ہے اور غالب نے اس سے استفادہ کیا ہے' اس کتاب کا ایک مخطوطہ مجھے تہران کے کتاب خانہ ملی ملک میں مل گیا، قاضی صاحب نے اس سے مجھے چند الفاظ کے متعلق نوٹ لینے کو کہا تھا، میں نے مطلوبہ نوٹ لے کر انھیں بھیج دیا۔

ایران سے واپسی پر جب میں 'پوسٹ گریجویٹ اسٹڈیز اینڈ ریسرچ ان پرشین اینڈ عربک' (وابستہ تعلقات و تحقیقات عربی و فارسی دانش گاہ ہُنرمند آف پوسٹ گریجویٹ اسٹڈیز اینڈ ریسرچ ان پرشین اینڈ عربک) پٹنہ میں بہار ایجوکیشنل سروس کے درجہ اول میں فارسی کا پروفیسر مقرر ہوا تو قاضی صاحب سے اور زیادہ قربت ہوئی کیونکہ وہ اس ادارے کی مجلس انتظامیہ اور مجلس عمومی کے رکن نامزد ہوئے تھے

اور ان سے اکثر صلاح و مشورہ کی ضرورت ہوتی تھی خصوصاً ادارے کے شعبہ نشر و اشاعت کے معاملات کے بارے میں، اس کے علاوہ کتاب خانۂ خدابخش میں بھی اکثر ان سے ملاقات اور علمی موضوعات پر گفتگو ہوا کرتی تھی، پھر جب میں اسی موسسہ کا ڈائرکٹر مقرر ہوا اور اسی زمانہ میں خدابخش لائبریری کو ایک قومی ادارے کا درجہ دے کر مرکزی حکومت نے اپنی نگرانی میں لے لیا تو قاضی صاحب کو اور زیادہ نزدیک سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا کیونکہ کتاب خانۂ مذکور کی جو مجلس منتظمہ تشکیل دی گئی اس میں حکومت بہار کی جانب سے پروفیسر سید حسن عسکری اور قاضی صاحب رکن نامزد کیے گیے اور یہ دونوں ہنوز اس مقام پر برقرار ہیں، ڈائرکٹر کی حیثیت سے مجھے لائبریری کی مجلس منتظمہ کا سکریٹری مقرر کیا گیا لائبریری کے انتظام کے لیے قواعد و ضوابط مرتب کرنے اور روزمرہ امور کی انجام دہی کے لیے ایک مجلس عاملہ بھی بنائی گئی جس میں قاضی صاحب بھی شامل کیے گئے، اس طرح مجھے ان کے ساتھ تقریباً ڈیڑھ برس کام کرنے کا موقع ملا، آخر میں ہم دونوں ایک اور ادارے میں اس کے اہم عہدہ داروں کی حیثیت سے شریک کار رہے ہیں، میرا مطلب انڈو ایران سوسائٹی کی پٹنہ شاخ سے ہے۔ آج سے کوئی دس سال پہلے ہندوستان میں حکومت ایران کے رایزنی فرہنگی مقیم دہلی جناب محمود تفضلی نے ایران و ہند کے درمیان روابط فرہنگی کو استوار کرنے اور ایران کے دانش و ہنر سے ہندوستان کے لوگوں کو آشنا کرنے کی غرض سے شہنشاہ آریامہر ایران، اور صدر جمہوریہ ہند کی اجازت و سرپرستی میں دہلی میں ایک ثقافتی ثقافتی انجمن بنام انڈو ایران سوسائٹی قائم کی اور اس کی شاخیں دائر کرنے کے واسطے علی گڑھ، کلکتہ، پٹنہ اور حیدرآباد کا دورہ کیا پٹنہ میں قاضی صاحب جیسے دلکش پر فارسی اساتذہ اور فارسی ادبیات سے دلچسپی

رکھنے والوں کا ایک مختصر سا جلسہ ہوا انجمن میں شاخ کی تشکیل ہوئی اور قاضی صاحب کو اس کا صدر اور مجھے سکریٹری نامزد کیا گیا۔ جب آقای محمود تفضلی ایران چلے گئے تو ان کی جگہ پر آقای ہاشم کاروش ایران کے کلچرل کاونسلر مقرر ہوئے۔ جب آقای ہاشم کاروش نے اپنا عہدہ سنبھالا تو انجمن ایران و ہند کی فعالیت میں اضافہ ہوا پٹنہ کی شاخ کی بھی سرگرمیاں تیز تر ہوگئیں۔ لیکن چند سال کے بعد شاخ کے کاموں میں تعطل پیدا ہو گیا۔ ادھر آقای کاروش کے دہلی سے چلے جانے کے بعد مرکز میں بھی سستی آگئی اور فعلاً یہ انجمن گویا مردہ ہو چکی ہے۔

اوپر کی سطروں میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ گزشتہ چالیس سال سے کسی نہ کسی حیثیت سے میں قاضی صاحب کی صحبت سے مستفید ہوتا رہا ہوں۔ اس طویل عرصے میں میں نے جتنا بھر ان کو دیکھا ہے، جو کچھ ان سے سنا ہے۔ ان کی جو تحریریں میں نے پڑھی ہیں، میرے اور ان کے مابین جو تعلقات قائم رہے اور اس سلسلے میں جو واقعات پیش آئے۔ ان سب کی روشنی میں ان کی شخصیت و سیرت کے متعلق میں نے اپنی ذاتی رائے قائم کی ہے، جسے میں آئندہ سطروں میں پیش کرنے جا رہا ہوں، لیکن اس سے پہلے میں یہ امر واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ قاضی صاحب اپنے علم و دانش اور تحقیقی کارناموں کی وجہ سے اردو دنیا کے لیے ایک عظیم شخصیت اور ہمارے صوبے کی ایک قابل فخر ہستی ہیں، ہم سب ان کا احترام کرتے اور اپنا بزرگ مانتے ہیں۔ میں نے ان کی صحبت میں بہت کچھ سیکھا ہے اور مجھے اس بات کا افتخار ہے کہ میرے غائبانے میں میرے بارے میں اچھا خیال ظاہر کرتے ہیں۔ میں ان کی وسعت مطالعہ، دقت نظر، ژرف نگاہی، تبحر علمی اور قوت حافظہ سے بہت متاثر ہوں، لہٰذا میرے بیانات سے یہ غلط فہمی کہیں پیدا ہونی چاہئے کہ میں ان

کی عظمت و دانشوری کا قائل نہیں ہوں۔

قاضی صاحب اردو کے چیرہ دست محقق ہیں، ان کے تحقیقی کارناموں سے تحقیق کی دنیا میں کام کرنے والوں کو روشنی ملی ہے، میرے خیال میں ان کی محققانہ سرگرمیوں کے بیشتر حصے کا محور غالب ہیں، غالب نے ماہر لسانیات اور محقق زبان ہونے کا دعوی کیا تھا۔ فرہنگ برہان قاطع پر اپنی زباندانی کے زعم میں اعتراضات ایراد کیے تھے اور اس کے مؤلف پر لعن وطعن کے تیر برسائے تھے اس سلسلے میں جو معرکہ ومشاجرہ برپا ہوا اس کی وجہ سے سوال وجواب کا ڈھیر سا لٹریچر پیدا ہوگیا۔ قاضی صاحب نے اس معرکے کا دلچسپی سے اور بنظر غائر مطالعہ کیا اور غالب کے ادعائے تحقیق کا بھرپور جائزہ لیا ہے، مسئلے کے مالہ، وماعلیہ پر پورے طور سے حاوی ہونے کے لیے انھوں نے اردو وفارسی کے کلاسیکی ادب کو کھنگالا ہے اور قدیم فرہنگوں کی بار بار ورق گردانی کی ہے، جس میں ان کی زندگی کا معتد بہ حصہ صرف ہوا ہے، غالب شناسی میں ان کا کوئی مقابلہ نہیں کرسکتا، غالب کے متعلق ان کی تحقیقات کے نتائج کو یکجا کر کے انھیں استفادۂ عام کی خاطر طبع کرانے کی اشد ضرورت کا احساس کر کے جناب ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم (سابق صدر جمہوریہ ہند) نے بہار میں اپنی گورنری کے زمانے میں قاضی صاحب کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ غالب کے نثری تالیفات کو اپنے مقدموں کے ساتھ ایڈٹ کریں، اور جناب کلیم الدین احمد صاحب کے تعاون سے جو اس زمانے میں بہار کے ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن تھے حکومت بہار کی جانب سے قاضی صاحب کی ایڈٹ کردہ کتابوں کو طبع کرانے کی غرض سے ایک رقم کثیر منظور کرادی، اور یہ طے پایا کہ یہ رقم بالاقساط دو دو کتابوں کے واسطے ملا کرے، چنانچہ ایک قسط کی رقم قاضی صاحب کے قائم کردہ ادارہ تحقیقات اردو پٹنہ کے حوالے کردی گئی، قاضی صاحب نے محنت کر کے

ایک جلد مرتب کی اور اسے طبع کرنے کے لیے مکتبہ جامعہ ملیہ کے سپرد کیا گیا، لیکن طباعت کے مرحلوں سے گزرنے میں اس قدر تاخیر ہوئی کہ قاضی صاحب کی ہمت جواب دے گئی اور وہ سارے کام سے بیزار سے ہو گئے، صرف قاطع برہان، طبع ہوئی وہ بھی کسی مقدمے کے بغیر، دوسری جلد بھی شاید مرتب ہوئی تھی، لیکن وہ طبع ہوئی یا نہیں مجھے معلوم نہیں، میں نے قاضی صاحب کی توجہ بار بار اس امر کی طرف دلائی کہ آپ نے غالب کے بارے میں حقیقت جاننے کے لیے ایک عمر صرف کر دی ہے، اگر آپ کی ساری تحریریں جمع کر کے طبع ہو جائیں تو تحقیق کے بحر ناپیدا کنار میں روشنی کا ایک یادگار منار قائم ہوگا، اور خدانخواستہ اگر تلف ہو گئیں تو اردو دنیا ایک عظیم سرمایہ سے محروم ہو جائے گی، قاضی صاحب کو میری عرضداشت کی معقولیت کا احساس تو ہوتا ہے لیکن اب وہ عمر کے اس مرحلے میں ہیں کہ وہ مسلسل اور سخت محنت کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ حیف و صد حیف کہ یہ اہم اور سود مند کام ہنوز انجام نہیں پا سکا ہے۔

قاضی صاحب نے اپنی تحقیقات کے ذریعے اردو ادبیات کی تاریخ کے بہت سے تاریک گوشوں پر روشنی ڈالی ہے۔ تذکرہ نگاروں، سوانح نویسوں اور ریسرچ اسکالروں کی بہت سی غلط بیانیوں اور غلط نتائج کی نشاندہی کر کے صحیح باتیں بتائی ہیں۔ لیکن ان کی تحریریں منتشر ہیں، بعض مضامین دوسرے اور تیسرے درجے کے رسالوں میں شائع ہوئے ہیں جن کو بہت کم لوگوں نے محفوظ رکھا ہے، کسی کو یاد نہیں کہ قاضی صاحب نے کن غلطیوں کی تصحیح کی ہے، اس معاملے کی طرف بھی میں نے قاضی صاحب کی توجہ مبذول کی اور درخواست کی کہ آپ اردو ادب کی ایک مستند اور صحیح تاریخ مرتب فرما دیں، ورنہ اردو کے طلبہ وہی رام بابو سکسینہ اور حسن عسکری کی تاریخ ادب اردو پڑھتے رہیں گے، آبحیات اور اسی قسم کی دوسری کتابوں کی مقبولیت باقی رہے گی، قاضی

صاحب نے میری بات پسند تو کی لیکن کہنے لگے اس کتاب کا وہ حصہ جو دکنی اردو سے متعلق ہے میں نہ لکھ سکوں گا۔ میں نے عرض کیا کہ اس حصے کو ڈاکٹر نذیر احمد مرتب کریں گے کیونکہ انھوں نے علی گڑھ تاریخ ادب اردو کے لیے آغاز میں کام کرتے ہوئے بڑی کوشش و کاوش سے یہ حصہ مرتب کیا تھا، افسوس کہ میری اس تجویز پر بھی عمل نہ ہو سکا۔

قاضی صاحب تحقیق کو سائنس کا درجہ دیتے ہیں، اور اسی سائنسی نقطۂ نظر سے اپنی تحقیقات میں رموز و علامات استعمال کرتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں ان علامات کی بھرمار رہتی ہے۔ بعض لوگوں کو اُن کی ایسی تحریروں سے بہت الجھن ہوتی ہے اور وہ ان کے پڑھنے سے قاصر رہتے ہیں، لیکن جن لوگوں کو اُن کی تحریروں سے استفادہ کرنا ہوتا ہے وہ محنت کر کے انھیں ضرور پڑھتے ہیں۔ قاضی صاحب تحقیقی مضامین میں عبارت آرائی کے سخت مخالف ہیں۔ حشو و زوائد کی تحقیق میں گنجائش نہیں ہے۔ علامتوں کا استعمال صفائی اور اختصار کے لیے ضروری خیال کرتے ہیں۔ ان کی تحریریں خواص کے لیے ہیں، عام قاری کے لیے نہیں۔

یہ تو سب جانتے ہیں کہ قاضی صاحب نے بعض تحقیقی مقالوں اور کتابوں پر سخت اعتراضات کیے ہیں، ان کتابوں میں ڈاکٹر عبدالحق مرحوم کی تالیفات، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کی 'لکھنؤ کا دبستان شاعری'، ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی کی 'دہلی کا دبستان شاعری'، ڈاکٹر اختر اورینوی کی 'بہار میں اردو ادب کا ارتقا' اور ڈاکٹر سید محمد حسنین کی "فردوسی، حیات اور شاعری" بھی شامل ہیں، ابتدا میں اعتراض کرنے اور غلطیوں کی نشاندہی کرنے میں قاضی صاحب کا لب و لہجہ قدرے تند و تلخ تھا۔ چند سال پہلے ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی نے سرور کی تذکرہ عمدہ منتخبہ ایڈٹ کر کے دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کی طرف سے شائع کی، قاضی صاحب نے اس ایڈیشن کی فروگذاشتوں اور غلطیوں کی ایک

لمبی فہرست مرتب کی۔ یہ مضمون کسی رسالے میں شائع نہیں ہوا بلکہ ان کے مجموعہ مضامین "اشتر و سوزن" میں شامل ہے۔ ایک دن جب کہ انھوں نے مظفر پور کے ڈاکٹر مظفر حمیدی کو چائے پر مدعو کیا تھا اور مجھے بھی اس میں شریک کیا تھا، قاضی صاحب نے ڈاکٹر فاروقی کی خامیوں اور کوتاہیوں کا ذکر کیا۔

قاضی صاحب تحقیقی کام میں بے راہ روی وبد عنوانی، بے پروائی و غلط نگاری برداشت نہیں کر سکتے، وہ بے پروا محقق کی سختی سے تنقید کرتے ہیں اور اس معاملے میں وہ سب کے ساتھ یکساں سلوک کرتے ہیں۔ موافق ہو یا مخالف ان کی نگاہ میں شخص کوئی چیز نہیں، اصل میں اس کا کارنامہ ہے۔ تقریباً پندرہ سال پہلے وہ لاہور تشریف لے گئے تھے، وہاں ڈاکٹر وحید قریشی سے ان کی شناسائی ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب اس وقت میر حسن کے متعلق تحقیقی کام کر رہے تھے، قاضی صاحب کی شناسائی سے فائدہ اٹھا کر انھوں نے جب اپنا مقالہ ڈی لٹ کے لیے پنجاب یونیورسٹی میں داخل کیا تو اس کا ایک اگزامنر قاضی صاحب کو بھی مقرر کرا دیا، چنانچہ جب وہ مقالہ قاضی صاحب کے پاس آزمائش کے لیے پہنچا تو قاضی صاحب نے اس میں بہت سی خامیاں دیکھیں، مایوس ہو کر اسے رکھ چھوڑا، اور کئی مہینوں تک اس پر کوئی کارروائی نہیں کی۔ ایک دن انھوں نے مجھ سے اس کے بارے میں تذکرہ کیا اور اسے واپس کر دینے کا ارادہ ظاہر کیا، میں نے عرض کیا کہ اگر واپس کر دینے کا خیال تھا تو فوراً واپس کر دینا بہتر تھا، اب جبکہ اتنی تاخیر ہو گئی ہے تو قرین مصلحت یہ ہے کہ آپ اس پر رپورٹ لکھ دیں، چنانچہ انھوں نے اس مقالے کی کمزوریوں اور غلطیوں کی ایک طویل فہرست تیار کی اور یونیورسٹی کو یہ لکھ کر بھیج دی کہ پہلے ان غلطیوں کی اصلاح کر لی جائے تب ڈگری دینے کی سفارش کی جائے گی، یونیورسٹی نے قاضی صاحب کے بدلے ایک دوسرا اگزامنر مقرر کر دیا اور ڈاکٹر وحید قریشی کو ڈی لٹ

کی ڈگری مل گئی۔ چند سال ہوئے بھوپال سے امام بخش صہبائی کے متعلق ایک مقالہ بغرضِ آزمائش ان کے پاس آیا تھا، ظاہر ہے کہ ایک بحرِ زخار کے سامنے ایک جوئے کم آب کا کیا مقابلہ ہو سکتا تھا۔ انھوں نے اس کے نقائص کی ایک لمبی فہرست تیار کر کے یونیورسیٹی کو بھیج دی، نتیجہ معلوم، گزشتہ سال لکھنؤ یونیورسیٹی نے عرفی شیرازی کے بارے میں ایک ضخیم تھیسس کا قاضی صاحب کو اکزامنر مقرر کیا۔ انھوں نے اس خیال سے کہ مقالہ نگار کے ساتھ انصاف کیا جائے اس مقالے کو محنت اور دقت نظر سے مطالعہ کیا اور اس کے خامیوں کی فہرست تیار کر کے یونیورسیٹی کو بھیج دی اور یہ لکھ دیا کہ اگر غلطیاں درست کر لی جائیں گی تو ڈگری دینے کی سفارش کی جا سکتی ہے، مقالہ نگار نے قاضی صاحب کی ہدایتوں کے مطابق اپنی تھیسس میں اصلاح کر لی، جس کے بعد قاضی صاحب نے اسے ڈگری کے لیے منظور کرنے کی سفارش کر دی۔ غالباً یہ تنہا مثال ہے کہ انھوں نے کسی مقالے کو ڈگری کے لیے منظور کیا۔

قاضی صاحب کے زیرِ مطالعہ صرف اردو و فارسی کی کتابیں نہیں رہتیں، وہ کثرت سے انگریزی کتابیں پڑھتے رہتے ہیں، اس کام کے لیے انھیں فرصت و فراغت بھی میسر ہے، اُن کے سامنے "چہ خورد بامداد فرزندم" کا سوال کبھی نہیں آیا، مالی اعتبار سے ان کا گھرانہ خوشحال و دولت مند رہا ہے، موروثی جائداد کا انتظام و انصرام قاضی صاحب کے چھوٹے بھائی قاضی محمد سعید (مرحوم) کے سپرد تھا، جن کی وفات سے قاضی صاحب کو بہت صدمہ اور نقصان عظیم ہوا ہے۔ اب تمام معاملات کے نگراں قاضی صاحب کے فرزند قاضی محمد مسعود ہیں، ان کے پاس اب بھی لکھنے پڑھنے کے لیے خاصی مہلت ہے مالبتہ صحت کی کمزوری کے باعث اب انھوں نے خدابخش لائبریری جانا اور وہاں بیٹھ کر کتابیں پڑھنا تقریباً ترک کر دیا ہے۔ ان کے مکان میں ذاتی کتابیں بھی کثیر تعداد

یہاں ہیں، جس کمرے میں قاضی صاحب رہتے ہیں کتابیں بکھری ہوتی ہیں، ان کی مسہری پر سرہانے اور پائینتی میں کتابیں پڑی ہوئی رہتی ہیں، میزوں پر بھی کتابیں بے ترتیبی سے ڈھیر ہیں، ان کو ترتیب سے سجا کر رکھنا ایک مشکل کام ہے جسے نہ تو قاضی صاحب خود انجام دے سکتے ہیں اور نہ کوئی دوسرا شخص اس کا اہل ہو سکتا ہے، کسی خاص کتاب کو بروقت ڈھونڈ کر نکالنا قاضی صاحب کے بس کی بات نہیں، میرے خیال میں یہ حال ہر اس شخص کا ہے جس کے پاس کتابوں کی کثرت ہے اور جو کثرت سے مطالعہ کرتا ہے اور کہنسالی کی وجہ سے کتابوں کو ترتیب سے رکھنے کے محنت طلب کام کے لائق نہیں رہا ہے۔

کتابوں کے علاوہ قاضی صاحب کے کمرے میں بہت سے کاغذات بھی منتشر حالت میں ہیں جن میں وہ اہم یادداشتیں بھی ہیں جو قاضی صاحب نے اپنے مطالعات کے دوران میں قلمبند کیے ہیں، اگر ان یادداشتوں کو مرتب کیا جائے تو "یادداشتہای قزوینی" کی طرح ان سے کئی جلدیں تیار ہو سکتی ہیں، قاضی صاحب نے کئی مرتبہ انھیں مرتب کرنے کا ارادہ کیا، اور اس کام کے لیے ایک دو دفعہ آدمی بھی مقرر کیا، لیکن کوئی آدمی ان کے مزاج اور ہدایت کے مطابق کام نہ کر سکا اور یہ کام مکمل نہ ہو سکا، ان کے پاس خطوں کا بھی ایک بڑا ذخیرہ ہے، یہ بھی بہت اہم اور قیمتی چیز ہے جس کی ترتیب و اشاعت سے بڑے اہم معلومات حاصل ہو سکتے ہیں۔

قاضی صاحب بہت ہی خوش اخلاق اور مہمان نواز ہیں، ان کی ملاقات کو جو بھی جاتا ہے اس سے خندہ پیشانی اور بلا تکلف ملتے ہیں، چائے ناشتہ سے خاطر کرتے ہیں، دوست ہو یا مخالف، چھوٹا ہو یا بڑا سب کے ساتھ اخلاق کا برتاؤ کرتے ہیں، پٹنہ سے باہر کا کوئی ریسرچ اسکالر، ادیب، یونیورسٹی کا ٹیچر، پٹنہ اپنے کام سے آتا ہے قاضی صاحب اور کلیم الدین احمد صاحب سے ملاقات کی کوشش کرتا ہے،

کلیم الدین احمد صاحب صدر شہر سے خاصے فاصلے پر رہتے ہیں اس لیے ان کے یہاں تک پہنچنے کا موقع سب کو نہیں ملتا ہے، البتہ قاضی صاحب کے یہاں چونکہ مرکز شہر میں ان کا مکان ہے سب کی رسائی ہو جاتی ہے، بیرونی مہمان کو قاضی صاحب چائے کھانے پر ضرور مدعو کرتے ہیں، اور اس کے ساتھ چند اور لوگوں کو بھی شریک کر لیتے ہیں، ان ملاقاتوں میں قاضی صاحب خوب گفتگو کرتے ہیں، اس معاملے میں وہ کلیم الدین احمد صاحب کے بالکل برعکس ہیں، کلیم صاحب سے ملنے والا باتیں کرتا ہے اور وہ خود بیشتر خاموش رہتے ہیں؛ قاضی صاحب کے یہاں ملنے والا زیادہ تر چپ رہتا ہے اور قاضی صاحب مسلسل گفتگو کرتے ہیں، چند سال پہلے تک قاضی صاحب کے یہاں لمبی لمبی نشستیں ہوتی تھیں، جن میں ہر قسم کے موضوع کے متعلق اُن کے خیالات سننے کا موقع ملتا تھا، کبھی کبھی تو نشست گیارہ بجے رات تک طول کھینچ جاتی تھی اور بات ختم ہونے کو نہیں آتی تھی۔ آج کل لوگ قاضی صاحب کی صحت کا خیال کر کے ان کو زیادہ زحمت دینا گوارا نہیں کرتے، اور صحبت کو مختصر کر دیتے ہیں، قاضی صاحب کی باتیں بہت دلچسپ ہوتی ہیں، اُن میں مزاح کی چاشنی بھی ہوتی ہے، جن لوگوں کو ان بالمشافہ گفتگو کرنے کا موقع نہیں ملا ہے وہ ان کی تحریروں سے یہ گمان کرتے ہوں گے کہ قاضی صاحب کی باتیں بھی ان کے مضامین کی طرح خشک ہوں گی۔ بات ایسی نہیں ہے، یہ ضرور ہے کہ جب کوئی علمی یا تحقیقی موضوع ہوتا ہے تو وہ بڑی سنجیدگی سے گفتگو کرتے ہیں، لیکن عام قسم کی گفتگو کو وہ خوش طبعی و ہلکے مزاح سے دلچسپ بنا دیتے ہیں۔ قاضی صاحب کی باتیں چٹپٹے دار ہوتی ہیں۔ ہر بولنے والا ان کے سامنے چپ رہتا ہے۔ البتہ پٹنہ میں دو شخص ہیں جن کی طرز گفتگو سے قاضی صاحب بھی مات ہو جاتے ہیں۔ ایک تو پروفیسر سید حسن عسکری جن کی گفتگو میں غیر ضروری انحراف اور تفصیلات ہوتی ہیں، وہ

باتیں کرنے میں بار بار اپنے اصل موضوع سے ہٹ کر جزوی باتیں داخل کر دیتے ہیں۔ دوسرے جناب شاہ جعفر حسین جو کثیر المطالعہ ہونے کی وجہ سے معلومات سے بھرے ہوئے ہیں۔ اُن کی گفتگو عالمانہ اور مسلسل ہوتی ہے، قاضی صاحب کی گفتگو کا ایک خاص پہلو یہ ہے کہ جس شخص سے ان کا اختلاف ہے اس کی تحریروں کے عیوب و نقائص کو بار بار مختلف موقعوں پر بیان کرتے ہیں، جو شخص انھیں ایک بار سن چکا ہے وہ ایسی گفتگو سے اکتاہٹ محسوس کرتا ہے، لیکن میرا خیال ہے کہ قاضی صاحب کا مقصد کسی کو بور کرنا نہیں ہوتا ان کا مقصد دوسروں کو قائل کرنا نہیں بلکہ خود آپ کو اپنے خیالات اور رائے میں مستحکم کرنا ہوتا ہے، شاید وہ یہ بھی توقع رکھتے ہیں کہ اگر سامع ان کے کسی اعتراض کی تردید کر دے تو وہ اپنی رائے بدل لیں گے۔

قاضی صاحب کسی کی تعریف و توصیف کرنے میں خود بڑے محتاط ہیں اور دوسروں کو بھی ہدایت کرتے ہیں کہ وہ تعریف کرنے میں احتیاط سے کام لیں اور مبالغے سے تو بالکل ہی احتراز کریں۔ تحقیق یا تنقید میں صفتوں کو بہت سمجھ بوجھ کر استعمال کرنا چاہئے کسی کی قصیدہ خوانی کے تو وہ سب سے مخالف ہیں' ایک مرتبہ جب کہ میں ہنوز ان کے خیالات سے واقف نہیں ہوا تھا ان کے سامنے ایک صاحب کی تعریف میں کسی قدر مبالغے سے کام لیا تھا، واقعہ یہ تھا کہ اس زمانے میں مولوی ریاست علی ندوی جو عرصے تک دار المصنفین اعظم گڑھ میں رہ کر کئی کتابیں تالیف کر چکے تھے پھر گیا میں کئی سال تک رسالہ ندیم کی مدیریت کے فرائض بھی انجام دے چکے تھے مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ کے پرنسپل مقرر ہو کر پٹنہ آ گئے تھے، ان کو میں نے دائرۂ ادب کے ایک جلسے میں اس خیال سے مدعو کیا تھا کہ وہ مدرسہ کے پرنسپل کی حیثیت سے پٹنہ کے علمی حلقے میں شامل ہیں اور ایک مصنف و مؤلف کی حیثیت سے بھی جانے پہچانے ہوئے ہیں۔ میں نے اپنے رپورٹ میں ان کی تعریف و

توصیف میں چند کلمے لکھ دیے تھے، جلسہ کے اختتام کے بعد قاضی صاحب نے مجھ سے شکایت کی اور اس قسم کی قصیدہ خوانی سے پرہیز کرنے کی فہمائش کی۔ وہ ہر شخص کو اس کے اصلی مقام پر رکھنا پسند کرتے ہیں اور اس سے تجاوز کرنا پسند نہیں کرتے۔

قاضی صاحب شعر و سخن کی مجلسوں میں شاذ و نادر ہی شرکت کرتے ہیں، البتہ کبھی کبھی دائرہ ادب کے جلسوں میں شعر خوانی کا دور بھی چل جاتا ہے۔ ایسے موقع پر قاضی صاحب اور کلیم صاحب دونوں ہی خاموش رہتے ہیں کسی کا کلام پسند آئے تب بھی داد نہیں دیتے، بہت ہوا تو سر کو ہلکی سی جنبش دے دیتے ہیں، ایک مرتبہ دہلی سے غلام ربانی تاباں صاحب مکتبہ جامعہ ملیہ کے کام سے پٹنہ آئے تھے۔ کلیم صاحب کی ملاقات کو گئے تو انھوں نے شام کو انھیں چائے پر مدعو کر لیا اور چند اور لوگوں کو بھی شریک کیا۔ قاضی صاحب بھی موجود تھے دس بارہ آدمیوں کی نشست تھی۔ جناب بہار الدین کلیم (مؤلف گلستان ہزار رنگ) بھی اس صحبت میں موجود تھے، ان کے ایک پہلو میں کلیم الدین احمد صاحب اور دوسرے پہلو میں قاضی صاحب تشریف رکھتے تھے، جب شعر خوانی شروع ہوئی تو بہار الدین صاحب سے بھی شعر پڑھنے کی فرمائش کی گئی۔ انھوں نے ایک غزل شروع کی، ایک شعر کے بعد بولے "شعر سنانے کو جی کیا خاک بڑھے، میرے ایک پہلو میں کلیم صاحب ہیں اور دوسرے میں قاضی صاحب، انھوں نے داد دینے کے لیے زبان بھی نہیں ہلائی۔"

قاضی صاحب کی صحبت میں عرصہ دراز تک رہنے اور ان کی خدمت میں بار بار حاضر ہونے کی وجہ سے میں ان سے تھوڑا بے تکلف اور قدرے گستاخ ہو گیا ہوں، اس وجہ سے ان سے کبھی کبھی اختلاف بھی پیدا ہو گیا ہے، بعض مرتبہ ان سے ناراض ہو کر بہت دنوں تک ان کے یہاں آنا جانا بھی ترک کر دیا ہے، لیکن یہ ان کی بزرگی اور

عظمت کی دلیل ہے کہ انھوں نے نہ صرف مجھے معاف کر دیا ہے بلکہ منا بھی لیا ہے۔ ایک بار انڈو ایران سوسائٹی کے بارے میں میرا ان کا سخت اختلاف ہو گیا، مرکزی انجمن نے پٹنہ کی شاخ کے اخراجات کے لیے ایک رقم منظور کر کے مجھے بھیج دی تھی۔ اس انجمن کا مقصد ہندوستان اور ایران کے درمیان کلچرل تعلقات کو فروغ دینا ہے۔ اس غرض سے ایک فنڈ ثقافتی سرگرمیوں میں خرچ کرنے کے لیے ہے۔ پٹنہ شاخ کو بھی یہ رقم اسی مقصد کے لیے ملی تھی، کہ اس سے جلسوں کا انتظام کیا جائے، مہمانوں کے لیے چائے ناشتہ پر خرچ کیا جائے۔ قاضی صاحب نے ان چیزوں کو ناپسند کیا، وہ اس فنڈ سے بہار کے شعرائے فارسی کے کلام کا ایک انتخاب مرتب اور شائع کرنے کے حق میں تھے، ممبروں کو قاضی صاحب کی اس تجویز سے دلچسپی نہیں تھی۔ قاضی صاحب کے اصرار اور ممبروں کی خواہش سے میں نے مرکز کو مطلع کیا اور اس سے رائے طلب کی، مرکز نے ہم لوگوں کی رائے سے اتفاق کیا اور کتاب مرتب کرنے اور چھپوانے کے لیے الگ فنڈ طلب کرنے کا مشورہ دیا، قاضی صاحب کو یہ بات ناگوار گزری، اور اختلاف شدید تر ہو گیا جس کی وجہ سے انجمن کی سرگرمیاں سست ہو گئیں۔ بعد میں میں نے قاضی صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر ان کو منا لیا اور یہ عرض کیا کہ آپ میرے بزرگ ہیں آپ کا میرا کوئی جھگڑا نہیں ہو سکتا، انھوں نے میرے احساسات کی قدر کی اور دل صاف کر لیا۔

قاضی صاحب کے تحقیقی کارناموں کا ایک افسوسناک پہلو یہ ہے کہ ان کا کوئی کام پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکا۔ غالب کی تالیفات کو ایڈٹ کرنے کا معاملہ ہو یا داستانوں کے جمع کرنے و ترتیب دینے کا کام ہو، کسی کام کے انجام تک پہنچنے کی امید نہیں۔ بات یہ ہے کہ ان کا معیار اتنا بلند ہے کہ وہ خود اپنے کام سے کبھی بھی مطمئن نہیں ہوتے جو

کتابیں انھوں نے مرتب کر کے طبع کرائی ہیں وہ بھی ان کے لیے اطمینان بخش نہیں ہیں، تذکرہ امین اللہ طوفان یا عیارستان، دونوں ہی میں بہت سی اصلاحیں کر دی ہیں، اشتر و سوزن، میں نہ معلوم کیا نقص رہ گیا کہ چھپنے کے بعد وہ گوشے میں ڈال دی گئی، اور اسے باہر کی ہوا بھی نہیں لگنے پائی۔ وہ دوسرے محققوں سے بھی اسی معیار کی توقع رکھتے ہیں، جس تک خود ان کے لیے بھی کبھی پہنچنا دشوار ہوتا ہے، میں نے اس معاملے میں بھی کئی دفعہ گفتگو کی ہے کہ آپ کو جو فراغت حاصل ہے وہ ہم میں سے بہتوں کو نصیب نہیں، ہم جن حالات اور مالی مشکلات میں رہ کر کام کرتے ہیں ان کا آپ کو اندازہ نہیں ہو سکتا۔ قاضی صاحب کبھی میرے ہم خیال بھی ہو جاتے ہیں پھر جب معیار تحقیق کی بات آجاتی ہے تو میری بات بے اثر ہو جاتی ہے۔

قاضی صاحب اللہ، رسول، قرآن، حدیث، معجزہ، کشف اور کرامات کے قائل نہیں ہیں اور وہ اس کا اعلانیہ طور پر اعتراف کرتے ہیں کہ وہ اس لحاظ سے مسلمان نہیں ہیں، لیکن چونکہ مسلمان خاندان میں پیدا ہوئے اور مسلمانی ماحول میں پرورش پائی ہے وہ مسلمانوں کے مسائل و حالات سے ہمدردی رکھتے ہیں، مسلمانوں پر اگر کوئی آفت نازل ہوتی ہے تو وہ اس سے متاثر ہوتے ہیں، میرا خیال ہے کہ قاضی صاحب کی مذہب سے یہ بیزاری ایک نفسیاتی ردعمل ہے، ان کے والد ماجد کٹر حنفی مسلمان تھے، انھوں نے قاضی صاحب کو دینی تعلیم دلائی تھی اور قرآن حفظ کرایا تھا، شبلی اور ان کے رفقا کے مخالف تھے۔ ندوۃ العلما سے سخت اختلاف رکھتے اور اس کی ضد میں ندوہ، قائم کیا تھا، ایک مذہبی رسالہ تحفہ حنفیہ بھی شائع کرتے تھے، اسی کا عکس العمل تھا کہ قاضی صاحب دین و مذہب سے بیزار ہو گئے ہیں، لیکن مذہب کے بارے میں گفتگو کرنے میں اس بات کا خیال رکھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ کسی کی دل آزاری نہ ہو، میں نے بھی کبھی ان

سے مذہبی بحث نہیں کی کیونکہ اس قسم کی بحثوں سے جذبات کے مجروح ہونے کا اندیشہ رہتا ہے۔ البتہ ایک بار قاضی صاحب نے اثنائے گفتگو میں یہ کہا کہ اگرچہ میں مذہب پر اعتقاد نہیں رکھتا اور آفرینش کائنات کا جو فلسفہ مذہبوں نے پیش کیا ہے اس کو نہیں مانتا لیکن اس بات پر حیرت ضرور ہے کہ اتنی وسیع دنیا نظم و ضبط کے ساتھ کیونکر وجود میں آگئی؟ میں نے دبی زبان سے کہا کہ آپ ابھی عالم حیرت میں ہیں، اس سے آگے کی منزل عالم معرفت ہے۔

سطور مزبور میں قاضی صاحب کی شخصیت و سیرت کے بارے میں جو کچھ میں نے تحریر کیا ہے یہ میری اپنی رائے ہے۔ بہت ممکن ہے کہ اس سے لوگ اتفاق نہ کریں۔ دراصل قاضی صاحب ایک دیو قامت محقق اور دانشور ہیں، ان کو اپنے قد کے حساب سے ناپنے میں غلطی کا بہت امکان ہے۔

سید محمد صدر الدین فضا

قاضی صاحب جیسا میں انہیں دیکھ سکا

ناطقہ سر بگریباں ہے انھیں کیا کہیے :. خامہ انگشت بدنداں ہے کہ کیا کیا لکھئے

قاضی صاحب کو میں نے بہت نزدیک سے کم ہی دیکھا ہے، مگر جو کچھ بھی دیکھا ہے اس سے ان کی دبیز شخصیت سامنے آجاتی ہے، اور زیادہ نزدیک سے تو انہیں صرف ان کے گھر والوں نے یا گنتی کے چند ہم عمر احباب ہی نے دیکھا ہوگا، میں پہلی بار پروفیسر شرف عالم آرزو جلیسلی کے ساتھ ان کے در دولت پر حاضر ہوا تھا، میں پٹنہ کالج کا طالب العلم تھا ان دنوں رسالہ معیار ان کی ادارت میں نکلنا شروع ہوا تھا۔ یہ ایک اعلیٰ معیار کا ادبی رسالہ تھا جو بہار کی سنگلاخ زمین میں پنپ نہ سکا اور ان کی علالت کے باعث بند ہو گیا۔ اس ملاقات کی ایک دھندلی سی یاد مرے دماغ میں ہے میں نہیں کہہ سکتا کہ ان سے شرف تخاطب ہوا تو کیا گفتگو ہوئی۔ اس کے بعد میں ان کے مکان پر کئی بار گیا مگر ان کے قبلہ محترم جناب شاہ رشید اللہ (مرحوم و مغفور) سے نیاز حاصل کرنے ـــــ اپنی تعلیمی زندگی ختم کرنے کے بعد جب میں پٹنہ کالج میں لیکچرار کی حیثیت سے آیا تو کبھی کبھی شرف باریابی کو حاضر ہوتا رہا، ان کی طبعی سادگی اور صدق گوئی سے میری ہمت بڑھتی گئی اور میں بار بار ملاقات کو جاتا رہا جب میں ڈی لٹ کی ڈگری حاصل کرنے کے لئے کسی مضمون یا کسی کتاب کی تلاش میں تھا کہ اسے ترتیب دے ڈالوں، جناب محترم ہی کے مشورے سے مثنوی گوہر جوہری کا انتخاب کیا۔ میں نے کام شروع کر دیا اور اپنی ضرورت کے تحت بار بار جانے لگا، خبر ملتے ہی جس

حال میں ہوتے نیچے چلے آتے اور بڑی خندہ پیشانی سے ملتے اور جب تک ضرورت پڑتی بیٹھے رہتے اور بڑی محبت اور لگن سے میرے شکوک رفع کرتے رہتے، کام کی باتیں ہوتیں اور وہ اپنی تحقیقات کا دریا بہاتے رہتے۔ یہ روزمرہ کا دستور تھا، قاضی صاحب تحقیق میں خون جگر کی نمود سے کام لیتے ہیں اور متون کی تصحیح پر بڑا زور دیتے ہیں، ہر نشست میں میں نے یہ محسوس کیا کہ میں بہت کچھ لے کر جا رہا ہوں۔ اس کتاب کا متن نہایت شکستہ خط میں تھا پھر بھی قاضی صاحب غور و فکر کے بعد صحیح لفظ کی تعین کر دیتے۔

متن کی تصحیح کے علاوہ شعرا کے حالات کی ترتیب میں بھی مجھے اپنی تحقیق سے مستفید ہونے کا موقع عطا کرتے رہے۔ خصوصاً اشرف علی خاں فغاں، خواجہ امین الدین، شاہ رکن الدین عشق، شاہ کمال علی اور شاہ سعد اللہ عشق کے حالات کی ترتیب میں اپنی گراں بہا تحقیقات سے مجھے مالا مال کیا۔ بارہ ماسے کے سلسلے میں انھوں نے ایک نوٹ بک دی جس میں ۱۲۹ اشعار افضل کی بکٹ کہانی کے تھے۔ میں نے ان سب کو اپنے دیباچے میں داخل کر لیا۔ ایک روز انھوں نے مجھے جوہری کی ایک غزل دکھلائی۔ غور کرنے پر معلوم ہوا کہ اس غزل کا ایک مصرع جوہری کا ہے اور ایک مصرع تاباں کا اس طرح یہ غزل مشترکہ ملکیت ٹھہری۔

قاضی صاحب نے عربی باضابطہ پڑھی، صرف، نحو اور منطق پر خاص توجہ رہی، صرف میں فصول اکبری تک اور نحو میں شرح جامی پڑھی، عربی متن صحیح پڑھ لیا کرتے تھے میرے خیال میں انھیں عربی سے اب بھی شغف ہے، کافیہ کا ابتدائی جملہ الکلمہ لفظ وضع بمعنی مختلف ہنوز یاد ہے، فارسی گھر پر پڑھی، اور اسکول میں بھی مگر فارسی کی ایسی رچی ہوئی صلاحیت اسکول اور کالج کی فارسی سے نہیں آئی یہ تو صرف ان کا اپنا مطالعہ اور پرانے انداز تعلیم کا اثر ہی ہوگا، کہتے ہیں کہ ایک بار دو کے امتحان میں انھیں بیتال

نمبر آئے اور ان ایک دوست ہم سبق پروفیسر نجم الہدیٰ صاحب کو بھی۔ تیسرا نمبر آئے تھے، پروفیسر نجم الہدیٰ مجوزہ خاکسار کے استاد تھے اور میری بحالی پہلے پہل پٹنہ کالج میں انہیں کی خالی کردہ جگہ پر ہوئی تھی۔ انگریزی میں جناب قاضی صاحب کا مطالعہ خاصا وسیع ہے۔ فرانسیسی زبان بخوبی جانتے ہیں جرمن بھی جانتے ہیں مگر مشق نہ ہونے کی وجہ سے اس زبان پر اب ان کا اعتماد نہ رہا' (شاید یہ ان کا انکسار ہے)

قاضی صاحب بہار میں کسی خاص دبستان فکر کے قائل نہیں وہ کہتے ہیں کہ بہاری شعرا اور دہلوی و لکھنوی شعرا کی زبان اور بیان میں کوئی فرق نہیں، شہری علاقوں میں زبان وہی رہی جو دہلی اور لکھنؤ کی تھی ہاں قصباتی شاعروں کی زبان قصباتی رہی، بہار کے شعرا کے یہاں صوفیانہ خیالات کثرت کے ساتھ پائے جاتے ہیں مگر صرف اس خصوصیت پر دبستان کی تشکیل منحصر نہیں، میر، اور غالب اکبرآباد میں پیدا ہوئے مگر دہلوی کہلائے مصحفی دہلی سے باہر پیدا ہوئے مگر دہلوی کہلائے اس لئے جائے پیدائش یا جائے موت سے کسی کا منسوب ہونا امر دیگر ہے میرے خیال میں یہ ایک نزاعی مسئلہ ہے اور اس پر ٹھنڈے دل سے غور کرنے کی ضرورت ہے آج تک بہار کا کوئی شاعر دہلوی نہ کہلایا دہلی اور لکھنؤ کے باکمالوں نے ان کی طرف عنان توجہ منعطف نہ کی۔

قاضی صاحب کا پہلا مضمون شاید آگرہ احوال، آگرہ اخبار میں شائع ہوا یہ اخبار ان کے والد ماجد علیہ الرحمۃ کے یہاں آیا کرتا تھا مضمون نویسی کا شوق برابر بڑھتا ہی گیا اور رفتہ رفتہ یہ شوق تحقیق کی طرف لے گیا، وہ تحقیق کے ہوتے گئے اور اب تحقیق ان کی قلمرو میں ہے تحقیق و تنقید میں فرق ہے مگر بہت باریک ایک دوسرے کی ضد نہیں بلکہ تتمہ و تکملہ ہے، تحقیق متون کی پرکھ کا نام ہے تنقید زبان و بیان صفات و معنویت کی جانچ کا نام ہے۔ تحقیق کو ag (ہے) سے تعلق ہے اور تنقید کو anagma (کیا

ہونا چاہئے سے تعلق ہے قاضی صاحب دونوں کو ہی وجدانی سمجھتے ہیں اس لئے ان کے نزدیک اس کا معیار متعین کرنا دشوار ہے ایک ہی واقعہ کو چار آدمی بیان کرتے ہیں تو بیان میں اختلاف ہو جاتا ہے، اس لئے واقعات کے بیان میں انتہائی دیانت سے کام لینا چاہئے، اسی طرح اگر ایک آدمی تین مصنفوں پر تنقید کرے تو بھی فرق کا ہونا ناگزیر ہو جاتا ہے، کسی دوست پر تنقید کرتے وقت لہجہ ذرا نرم ہو جاتا ہے، اور کسی دشمن پر تنقید کرتے وقت لہجہ تند و تلخ ہو جاتا ہے اور مصنف نہ اس کا دوست ہے نہ دشمن تو لہجہ بے باک ہو سکتا ہے اور جنبہ داری یا نفرت سے الگ۔ قاضی صاحب اپنی تحقیق میں اسی طرح کا سلوک روا رکھتے ہیں۔ وہ دو اور دو چار کی طرح دو ٹوک بیان پسند کرتے ہیں نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پروا، نہ ملامت کا خوف ان کا انداز خالص سائنسی ہے مگر سپاٹ پن کا جو انداز انھوں نے اپنایا ہے، میں دبی زبان سے کہوں کہ یہ انداز پڑھنے والوں کو مضمحل کر دیتا ہے تحقیق کا فن بذات خود خشک ہے اور خشونت رکھتا ہے اس لئے مزید خشک بنانے سے قارئین اکتاہٹ محسوس کرتے ہیں بالخصوص میرے جیسے قاری کو، یہ انداز کتنوں کو پسند نہیں مگر ان کی پسند یا ناپسند سے کیا ہوتا ہے آج قاضی صاحب ملک اردو کے فرماں روا محقق ہیں بڑے بے لاگ لکھنے والے اور بے باک اظہار خیال کرنے والے، اسی لئے طلبہ تو خیر ان سے ڈرتے ہی ہیں اگر کسی کو معلوم ہو جائے کہ اس کا مقالہ قاضی صاحب کے یہاں بغرض امتحان گیا ہے تو پھر اس کی آدھی روح فنا ہو جاتی ہے۔

ڈاکٹر عبدالحق محقق مشہور رہے مگر انھوں نے تحقیق کا حق کما حقہ ادا نہیں کیا، اس لئے جس جگہ کاوش کی ضرورت ہے، اس سے وہ دامن بچاتے رہے قاضی صاحب نے تحقیق میں جس جگہ کاوش کی ضرورت ہے اس سے کام لیا، کتنے ہی دور رس نکتے پیدا کئے، کتنے ہی نزاعی امور کو اپنی تحقیق کی مدد سے حل کر دیا، اور اردو تحقیق کو ایک نیا انداز عطا کر کے

اس کا دامن وسیع اور ہمہ گیر کر دیا، اور آج اردو تحقیق ان کی بدولت دنیا کی ہر زبان کے آگے سر اونچا کر سکتی ہے۔ بیسویں صدی ہی بت شکنی کا دور ہے اور بڑے بڑے روایتی بت شکست و ریخت کا شکار ہو رہے ہیں، اس صوبہ بہار نے بھی دو ادبی بت شکن پیدا کیے ایک تحقیق کے میدان میں دوسرے تنقید کے میدان میں، ایک کی بت شکنی مان لی گئی اور ایک کی بت شکنی کو منوانا پڑا۔ ابھی میں نے کہا ہے کہ تحقیق اور تنقید ایک دوسرے کا تتمہ اور تکملہ ہے، اب اگر میں یہ کہوں کہ قاضی عبدالودود اور کلیم الدین احمد ایک دوسرے کا تتمہ اور تکملہ ہیں تو آپ کے خفا ہونے کی کوئی بات نہیں، محقق کی بات بغیر نقد و انتقاد کے مکمل نہیں ہوتی اس لیے قاضی صاحب کے یہاں ناقدانہ بصیرت اپنی ساری وسعتوں کے ساتھ پائی جاتی ہے، اور تنقید کے لئے تحقیق بنیادی اہمیت رکھتی ہے اس لئے کلیم الدین احمد کے یہاں ناقدانہ شعور کے ساتھ تحقیقی کاوشیں بھی ملتی ہیں، محقق کے لئے ہمہ دانی کا خبط اس کو غلط راہ پر لگا دیتا ہے اور تنقید نگار کے لئے ہمہ دانی کا شوق اس کو برباد کر دیتا ہے، قاضی صاحب کو نہ ہمہ دانی کا خبط ہے اور نہ ہمہ دانی کا شوق مگر اس کو کیا کیجیے کہ خود ہمہ دانی ان کو چھوڑتی نہیں، جس مضمون پر گفتگو کر لیجئے اور جس اشکال کا ذکر کیجیے ایک تحقیقی جواب آپ کے سامنے آجاتا ہے، وہ ایک سخت گیر محقق ہیں اور بے لاگ ناقد اس میں وہ کسی کی غلطی معاف نہیں کرتے،

قاضی صاحب کو اپنی تعریف پسند نہیں آتی، کہتے ہیں کہ میں اپنی تعریف کی کوئی نوٹس نہیں لیتا، ان کے پیش نظر شاید فقرہ سعدی کا یہ جملہ ہو "احمق را ستائش خود خوش می آید، چوں لاشہ کہ در کعبش دمی فربہ نماید" یہ بھی مزید خوبی ہے کہ اپنے کام کے سلسلے میں کبھی انھوں نے تعلّی سے کام نہ لیا، بیان واقعہ کا نام تعلّی نہیں، ان کے سامنے شاید یہ فقرہ ہو

"Don't express your opinion about your own works"

انکسار ان کی فطرت میں نہیں، اور تعلی ان کا شعار نہیں، یہ ہے ان کی شخصیت کا تجزیہ :-
ایک بار کا ذکر خود قاضی صاحب کر رہے تھے کہ علیگڈھ یونیورسٹی نے انھیں توسیعی لکچر دینے کے لئے بلایا، وہاں ان کو متعارف کرنے کا کام شوکت سبزواری کو سپرد ہوا جنھوں نے ان کی دل کھول کر مدح سرائی کی، مگر ادھر سے ایک معنی خیز جواب ملا کہ دنیا بہت وسیع ہے اس میں ایک فرد کی کیا حقیقت ہے، یہ محض ایک اکائی ہے، اور بس، یہ شوکت سبزواری وہی ہیں جنھوں نے قاضی صاحب کے ایک مضمون "غالب بحیثیت محقق" پر اعتراضات کئے تھے، جن کا مفصل جواب دیا جاچکا تھا۔ جواب اس طرح کا تشریحی انداز لئے ہوئے تھا کہ مضمون ۵۰ صفحے سے بڑھ کر ۲۰۰ صفحات پر مشتمل ہو گیا۔ قاضی صاحب کی تحقیق اردو زبان میں حرف آخر کا حکم رکھتی ہے گرچہ وہ خود اسے حرف آخر نہیں مانتے یہ ان کا انکسار نہیں، بلکہ ادبی دیانت اور صداقت ہے۔ بعض انکسار فخر و افتخار کے لئے بھی ہوتا ہے ایک انھوں نے انکسار اور تعلی کے درمیان ایک راہ نکالی۔

قاضی صاحب کی شخصیت میں ایک عجیب کشش ہے جو دور رہنے اور نزدیک آنے کے ملے جلے جذبے سے بنی ہے، ان سے ملئے تو ملتے رہنے کی خواہش دل میں گھر کر جاتی ہے۔ ان کے بے ریا و بے نمائش طریقہ بود و باش کا ہر ذی فہم پر اثر پڑتا ہے، انگریزی لباس اور وضع قطع کے باوجود ایک درویشانہ انداز ہے جو دلوں کو مسحور کر لیتا ہے، انگریزی لباس میں ملبوس ایک سادھو کہہ ڈالئے تو شاید غلط نہ ہو، ان کا خلوص ان کے گفتار و کردار سے چھن چھن کر باہر آتا رہتا ہے، مجھے ان کے بے ریا خلوص نے بہت متاثر کیا، برابر ہی میرے ساتھ ان کا برتاؤ نرم رہا، یہ بات نہیں مجھ سے ان سے کسی امر میں اختلاف نہ ہوا یا میری ہر چیز انھیں برابر پسند آئی، یا میں نے کوئی غلطی کی تو انھوں نے مجھے ٹوکا نہیں۔ سب ہوا اختلاف بھی ہوا، میری جو چیز انھیں پسند نہ آئی اس کا برملا اظہار بھی کیا، میری غلطی پر مجھے ٹوک بھی دیا،

مگر یہ سب کچھ اس خلوص و محبت، دیانت و حیا سے ہوا کہ ساری باتیں آئی گئی ہو گئیں، نہ میرے جواب کا ان کے دل پر اثر رہا اور ان کے اعتراض سے میں بوجھل ہوا۔ بڑے آدمیوں کا یہ شعار ہے کہ وہ دوسروں کی بات ٹال جائیں مگر ان کی بات کوئی نہیں ٹال سکتا۔

وینکرون شیئاً علی الناس قولھم .. ولا ینکرون القول عین نقول

گر قاضی صاحب کا یہ شیوہ ہے کہ وہ دوسروں کی بات ٹالتے تو ہیں، مگر یہ امید نہیں رکھتے کہ ان کی بات ٹالی نہ جائے گی۔ یہ عظمت کردار کی دلیل ہے یہ ان کے خلوص کا ہی نتیجہ ہے کہ بعض خوش بختوں کے لئے اونچی اونچی سفارشیں کرنے میں مسرت محسوس کرتے ہیں، ان کی سفارشوں کا وزن بھی ہوتا ہے۔ یہ سب کچھ ہے مگر ان کی گھریلو زندگی ذرا اداس اداس ہے، وہ تو یوں کہیے کہ انھوں نے کتب بینی میں اپنے کو اس طرح محو کر دیا کہ اپنی ساری اداسی اور نا آسودگی کو فراموش کر دیا، مگر کبھی کبھی اس کا شدید احساس ان کو بھی ہوتا ہے، ان کے دو بھائی ہمیشہ کے لئے انھیں داغ مفارقت دے گئے گھر میں اہلیہ محترمہ ہیں اور ایک فرزند ارجمند عزیز قاضی مسعود، جو بی اے کے دنوں تک میرے شاگرد رہے ہیں اور آج تک استاذ کی عزت و توقیر میں کمی نہیں کرتے ہیں۔ اہلیہ محترمہ کی صحت بھی کوئی ایسی اچھی نہیں رہتی۔ مجھے قاضی صاحب کا یہ کہنا اکثر یاد آتا ہے "میری زندگی دوسروں پر ہے، یا نوکروں پر یا احباب پر" مگر زندگی کی اس اداسی اور ویرانی کو دور کرنے کی طرف کسی نے کوئی مثبت قدم نہیں اٹھایا، کاش قاضی صاحب اور ان کی بیگم کی یہ تنہائی ختم ہو جاتی۔

قاضی صاحب نے اپنی عمر تحقیق و تفتیش نقد و تبصرہ ہی میں گذاری اور گذار رہے ہیں۔ مگر نام و نمود کی فکر کبھی نہ ہوئی، مضامین لکھتے رہے، شائع ہوتے رہے مگر اپنے مضامین کو یکجا سمیٹنے کی خواہش یا کوشش کبھی نہ کی۔ کلیم الدین احمد کی تحریک پر بہار اردو اکادمی نے یہ کام اپنے ذمہ لیا ہے۔

عابد رضا بیدار

کچھ قاضی صاحب کے بارے میں

ایک شہر میں تین بت شکن

دنیا میں بعض عجیب دلچسپ پراسرار باتیں ہیں جن پر غور نہ کیجیے تو کوئی اہمیت نہیں، اور غور کرنے لگیے تو اسرار در اسرار! ـــــ یہ کچھ تو ہے کہ ناموں کا اثر بعض افراد کی زندگی میں ایسا بے پناہ ہو کہ وہ بنیادی حیثیت اختیار کر لے۔ کلیم نام کے ساتھ ادبی تنقید کا جہاں تک تعلق ہے کلیم الدین احمد سے بہتر ایک کلیم سربکف والا انداز چھا جائے، عسکری نام کے ساتھ قرون اولی کے ایک اچھے لشکری کی مہم آزمائی اور اس کی فتح کے لیے بے خوف لڑائی کی صفات تاریخی تحقیق کے میدان میں حاوی صفات بن جائیں ـــــ اور قاضی نام کے ساتھ منصف مزاجی اور حق پسندی ادبی تحقیق میں اتنی در آئیں کہ لوگ مصلحت و مصالحت کا نام تک بھول جائیں ـــــ اور تینوں اپنے ناموں کی مناسبت سے اپنے اپنے میدانوں میں بت شکنی کر کے ایسے اعلیٰ معیار قائم کر جائیں جن کی تقلید کرنا بھی دشوار معلوم ہو!

کسی ربع صدی میں کسی ایک شہر میں بیک وقت ادبی تنقید، تاریخ و تہذیب اور ادبی تحقیق کے تین متفرق تصنیفی میدانوں میں اتنے معتبر اسکالر جمع نہیں ہوئے ہوں گے جنھوں نے الگ الگ میدان تک و تاز ہوتے ہوئے

مجھی بالکسی قسم کے طے شدہ پروگرام کے بت شکنی کو قدر مشترک کے طور سے ایسی شان کے ساتھ اپنایا ہو جیسے ہندوستان کے ایک شہر پٹنہ میں پچھلی ربع صدی میں ـــــ زیادہ صحت درکار ہو تو دس پندرہ سال کم کر لیجئے۔ تین سرچشمہائے فیضان یکجا ہو گئے ہیں، جن میں سے محترم ترین کا ذکر خیر معاصر کا حصہ سعادت قرار پایا ہے۔

(۱)

منفی تنقید پہ مستقل کتاب کوئی نہیں

منفی تنقید کے سوا قاضی صاحب نے کیا کیا ہے؟ ایک کئی بڑے معروف محققوں نے مجھ سے متعدد موقعوں پر یہ جوابیہ سوال کیا ہے! دوسروں پر تنقید اور نکتہ چینی صحیح، برمحل اور بجا ـــــ سوال آگے بڑھا ہے ـــــ لیکن انھوں نے خود کوئی مستقل تصنیف کی؟

مستقل تصنیف کبھی کتاب کی شکل میں ہوتی ہے کبھی اشخاص کی شکل میں۔ جمال الدین افغانی نے دو تین چھوٹے چھوٹے رسالوں کے سوا قاضی صاحب کے معیار کی طرح ۶ مہینے ایک رسالہ نکالا تھا۔ بس، اتنا ہی اس کا تصنیفی کام ہے لیکن کوئی ٹھکانہ ہے اس کے کام کا! ـــــ ایک تنہا ذات نے مشرق میں بیداری کی ایک لہر دوڑا دی۔ ایران کے انقلاب میں اس کا ہاتھ، مصر کی پہلی آزادی خواہ تحریک میں اس کا سایہ، مہدی سوڈان کے وہ ساتھ، ہندوستان کے آزادی خواہوں اور انقلابیوں میں وہ شامل۔ انگریز اور سامراجی اس کے نام سے کانپتے تھے۔ اس نے بھی انگریزوں پر منفی تنقید کی بوچھار کر رکھی تھی۔ اس کی بھی مستقل تصانیف نہ ہونے کے برابر ہیں۔ پھر بھی شکر گزار مصر و ایران نے کبھی افغانی سے یہ سوال نہیں پوچھا جو قاضی صاحب سے پوچھا گیا۔ اس

کی تصانیف لوگوں پر روزِ روشن کی طرح عیاں تھیں کہ جس حصۂ زمین میں چند سال رک گیا، نئے جمال الدین افغانی پیدا کر دیئے۔ اور آج تک وفات کے اسّی سال گزر جانے کے بعد بھی فیضان کا سلسلہ جاری ہے۔

خالص ریسرچ کے میدان میں بھی مغرب میں جو ایسے معاملات میں ہمارا معیار قرار پاتا ہے، بڑے محققوں کی کوئی کتابیں نہیں گنتا۔ ان کے ریسرچ پیپر دیکھے جاتے ہیں، اور ان کی بھی تعداد نہیں، اہمیت مدِنظر ہوتی ہے۔

کام انعام ہے، نہ کہ انعام کام قاضی صاحب نے پچھلے ۲۵۔ ۳۰ سال میں ادبی تحقیق کے میدان میں آزمودہ کاروں اور نو آزمودہ دونوں کی جس طرح تربیت کی ہے، اس کی مثال اردو کیا، عربی فارسی میں بھی مشکل سے ملے گی۔ اپنی نجات کے لئے ہر شخص قدرتی طور سے کوشش کرتا ہی ہے۔ دوسروں کی نجات کے لئے ذہن کو تپانا اور جلانا پیغمبری کا کام ہے۔ اپنے آپ مصنف تو میں آپ بھی بن ہی جاتے ہیں۔ دوسروں کو صحیح، تحقیقی راہ پر لگانا اور ریزہ ریزہ پوری عمارت بناتے جانا ــــــ اس قدر خاموشی کے ساتھ کہ یہ اعتراض ہونے لگے کہ یہ ریزے ہیں، عمارت کا کریڈٹ ہم انھیں نہیں دے سکتے ــــــ یہ صرف ایسا شخص کر سکتا ہے جو کام کو انعام سمجھتا ہے، انعام کو کام نہیں۔

دوم درجہ کی چیز کی گنجائش نہیں کبھی وہ دوسرے درجے کی کسی چیز پر قانع نہیں ہوتے۔ آم اور آلوچے سے لے کر شعر و فلسفہ تک، فرد اور سماج تک! یہی وجہ ہے کہ ایک دو کے سوا (اور وہ بھی ایک حد تک!) نہ کوئی شخص ان کی نظر

میں بچا ہے نہ کوئی معاشرہ۔ ایک عام شکایت ہے کہ صاحب، قاضی صاحب کو تو کوئی مضمون (کتاب) پسند ہی نہیں آتا۔ فوراً نکتہ چینی شروع کر دیتے ہیں۔ اب یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ محقق کی پسند اور خیرات کا معیار، دونوں اصرار کریں کہ قاضی صاحب بھی اسے اپنائیں۔

قاضی صاحب کو کتنوں نے سمجھا ہے

اردو کی ادبی تحقیق جو گھٹنوں چل رہی تھی، قاضی صاحب نے اسے پاؤں چلنا سکھایا۔ لیکن اردو تحقیق کا مزاج، چہل سال عمرِ عزیز گزرنے کے بعد بھی حالِ طفلی سے نہیں بدلا ہے۔ محقق ـــــ جن میں قدیم و جدید دونوں شامل ہیں ـــــ قاضی صاحب کا احترام کرتے ہیں بلکہ ڈرتے ہیں لیکن قاضی صاحب نے کیا لکھا ہے۔ میں شرط لگانے کے لئے تیار ہوں کہ ان کے لکھے ہوئے کا صرف بیس فی صدی ادبی تحقیق کا کام کرنے والے اردو کے جن مصنفوں نے بالاستیعاب پڑھا ہے، ان کی تعداد میرے ہاتھ دو انگلیوں کے پوروں پر پوری نہیں ہوتی۔ جیرؔ نے قاضی صاحب کے سلسلے میں ایک مصرع لکھا ہے؛ بھاری پتھر تھا چوم کر چھوڑا۔

اردو زبان و ادب کا ہر سنجیدہ طالب علم قاضی صاحب کا ادب و احترام کرتا ہے۔ ڈرتا بھی ہے لیکن بس! وہ انہیں پڑھتا نہیں ہے، اِلّا ماشاء اللہ! ہم لوگ یوں بھی پرستش ضرور کر سکتے ہیں مگر معاملات میں دخل اندازی نہ خدا کی گوارا کریں گے نہ رسول کی۔ قرآن مجید رحل کی زینت ہو سکتا ہے۔ طاقوں اور الماریوں میں سج سکتا ہے۔ کبھی کبھی تبرکاً بغیر سمجھے پڑھا بھی جا سکتا ہے، لیکن اسے ہدایت حاصل کرنے کے لیے پڑھنا، سمجھنا، عمل کرنا ـــــ اس کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔

میں نے اردو کے چوٹی کے محققوں کو اس بات پر جھنجھلاتے دیکھا ہے کہ ر = نسخۂ رامپور، ق = نسخۂ انجمن ترقی اردو، خ = نسخۂ خدا بخش کا فارمولا

مضمون کے شروع میں دے کر متن میں لکھا جا رہا ہے کہ ؟ ق کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ اور
نخ اور ر کے مشمولات میں جہاں تک قصائد کا تعلق ہے کچھ فرق پایا جاتا ہے،
وغیرہ۔ نتیجہ یہ کہ یہ چوٹی کے محققین بھی اس مضمون کے سوا جس میں خود ان پر تنقید
ہوتی ہے۔ بقیہ مضامین بمشکل پڑھ پاتے ہیں۔

طریق کار: دواوین، اخبار و رسائل پر مضامین قاضی صاحب کے پچاس فیصدی مضامین وہ ہیں جن میں کسی شاعر کے کمیاب یا نایاب قلمی (کبھی کبھی مطبوعہ) دیوان یا کسی قدیم اخبار یا رسالہ کے فائل کا تفصیلی تعارف مقصود ہے۔ اس میں محض چار چھ سطروں کا نثری تعارف کرا کے باقی صرف یہ ہوتا کہ انتخاب کلام (مندرجات) دے دیا جاتا ہے۔ پڑھنے والے (اور ان میں اچھے اچھے پڑھنے والے شامل ہیں!) اس انتخاب والے حصہ کو قطعاً نہیں پڑھتے اور از خود ایک آسان فیصلہ کر لیتے ہیں کہ کسی دیوان یا رسالے سے یہ یا اس جیسا انتخاب تو ہم بھی کر سکتے تھے۔ حالانکہ اس انتخاب کے کام میں کتنی محنت اور وقت صرف ہوا! وران گنت خزف ریزوں میں سے صرف موتی (اور سارے کے سارے موتی!) نکال کے دوسروں کو مہیا کر دینے والے نے کتنا بڑا کام کر دیا، یہ اس انتخاب کو بالاستیعاب پڑھنے کے بعد ہی پتا چل سکتا تھا۔

طریق کار: غالب غالب قاضی صاحب کا پہلا عشق ہیں۔ غالب کی یاد میں ایک بین الاقوامی سمینار صدی جشن کے موقع پر ہوا جس میں خطبۂ صدارت قاضی صاحب نے پڑھا۔ میں اس جلسہ میں شریک تھا اور اپنی آنکھوں دیکھی کانوں سنی بات ہے۔ اردو

کے چوٹی کے ادیبوں کے اس منتخب روزگار مجمع میں ایسا کوئی بھی نہ تھا جس نے ناک بھوں نہ چڑھائی ہو یا زیر لب اور سیمینار کے بعد با آواز برملا نہ مانا ہو۔ واہ صاحب! یہ کیا بات ہوئی کہ غالب سیمینار میں غالب کی برائی ہو رہی ہے۔ اسے کم علم، دروغ گو، خوشامدی، فریب کار، بدمعاملہ، نافہم یا کج فہم اور دنیا دار ثابت کیا جا رہا ہے۔ پھر اس کے پاس کیا بچا ہے۔ قاضی صاحب کو اس سے غرض نہیں کہ کچھ بچا ہے یا نہیں۔ غالب سیمینار میں غالب پر تحقیق کا ایک معیار پیش کرنا تھا۔ یہ بتانا تھا کہ غالب بحیثیت انسان اور بحیثیت اسکالر تحقیق کی روشنی میں کوئی درجہ نہیں رکھتے اور اس سب کے باوجود ــــ ــــ غالب کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کرنا تھا کہ اصولی طور سے ایک گھٹیا اسکالر یا ایک گھٹیا انسان ہونے کے باوجود اس کی عظمت کو اردو کا کوئی شاعر نہیں پہنچ پاتا۔ سننے یا پڑھنے والے ایسے موقع پر ذہنی تہی مائگی کے سبب یا بدنیتی سے پہلی ہی منزل پر رہ جاتے ہیں، اگلی کا موقع ہی نہیں آپاتا۔

غالب پر جس گہرائی اور گیرائی کے ساتھ قاضی صاحب نے کام کا پلان بنایا (جہان غالب جس کا ایک ہلکا سا نمونہ ہے) اور اس کی زندگی اور فن کے ایک ایک گوشہ کا احاطہ کیا، کسی شاعر پر اعلیٰ تحقیقی کام سرانجام دینے کے لیے کسی بھی زبان کے محقق کے لیے ایک نمونہ

۱۔ مولانا ابوالکلام آزاد پر قاضی صاحب کی بے محابا تنقید پڑھ کے اور سن کے ندوہ کے ایک معروف اہل قلم جو اچھے خاصے متکلم بھی ہیں، فلسفہ کے استاد رہ چکے ہیں۔ عالمی فلسفہ ادبیات کا گہرا مطالعہ ہے، بڑی دلسوزی سے قاضی صاحب سے کہنے لگے کہ کم سے کم اس امر کی خاطر ہی ان کی کمزوریوں پر نہ لکھئے کہ جب اتنے بڑے بڑے ستون گر جائیں گے تو پھر ہمارے پاس بچے گا کیا؟ ہم کریں ہی کم مایہ بلکہ فرومایہ ہوتے جا رہے ہیں، پھر اغیار کی نظر میں جو بھرم ہے پھر تو وہ بھی نہ رہے گا۔ قاضی صاحب نے دیر ایک تیکھی نظر ڈالی پھر کیا یک خیال آگیا کہ ان کے یہاں جہاں تک مجھے ہیں، خاموش ہو کے رہ گئے۔ بعد میں کہنے لگے کہ کتنے اچھے اچھے پڑھے لکھے لوگ بھی مصلحت و مصالحت سے تحقیقی کام کو غلط موڑ دیتے رہتے ہیں۔ یا اس خاص سلسلے میں وہ جامعہ کے لوگوں سے بھی خاصے شاکی رہے۔

قائم ہو چکا ہے :۔

سودا، انشا، مصحفی | غالب کے بعد سب سے زیادہ توجہ سے سودا، انشا اور مصحفی پر کام کیا ہے، اس شغف کے ساتھ کہ متعدد بار ذکر ہوا ہے کہ ان تینوں پر ایک ایک مستقل کتاب لکھنے کا ارادہ ہے جس میں نصف سے زیادہ حصہ تو گویا شائع ہو ہی چکا ہے۔

رسالہ معیار | ادبی رسالہ کس معیار کے ساتھ نکالا جائے، ایک ماہنامہ معیار نکال کے ایک شوق پورا کرنے کے ساتھ ساتھ ضمناً ایک معیار بھی دیدیا۔

آوارہ گرد اشعار | ایک دلچسپ سلسلہ آوارہ گرد اشعار کی تلاش و تعیین ملکیت کا تھا، اس کی متعدد قسطیں جا بجا نکلتی رہیں اور حق بحقدار پہنچتا رہا۔

کہاں کہاں لکھا ہے | شاعروں میں شاد عارفی اور محققوں میں قاضی صاحب، کوئی رسالہ والا فرمائش کرے تو (صحت اگر ٹھیک ٹھاک ہے) پھر اسے رد کرنے کا سوال نہیں اٹھتا۔ نیا چراغ (لکھنؤ)، ساز و آہنگ (دہلی)، بہار کی خبریں، مطالعہ وغیرہ — بجھ کے دو تین نمبر ہی مشکل سے نکلے۔ کچھ ایسے جن کے نام سے اردو داں عام طور سے قطعاً ناواقف مگر قاضی صاحب کا مضمون اس میں مل جائے گا۔ غنیمت ہے کہ مضامین کا تین چوتھائی حصہ معاصر، اردو ادب، نوائے ادب، ہماری زبان، آجکل، اور تحریک میں محفوظ ہے۔

کیا کیا لکھا ہے | صحت متن اور اصول تحقیق پر دو بنیادی اہمیت کے مقالے تحریک اور آج کل میں محفوظ ہیں۔ ادبی تحقیق: عملی تنقید کے بنیادی مقالے ہماری زبان اور نوائے ادب میں اس نہج سے آگئے ہیں کہ پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری کے لئے جو مقالے مختلف جامعات میں منظور ہو کے شائع ہوئے۔ قاضی صاحب نے ان پر تنقید کی ہے۔ اسی ذیل میں ان کا وہ طویل مقالہ بھی آجاتا ہے جو میر: حیات اور شاعری، پر لکھا گیا ہے۔ ان تنقیدی مقالوں سے قاضی صاحب کا طریق کار سمجھ میں آجاتا ہے۔ جو وہ تحقیق کے سلسلے میں دوسروں سے توقع رکھتے ہیں، پسند کرتے ہیں۔

لغت کے سلسلے میں ان کا خیال ہے کہ ابھی اردو کا جامع لغت لکھنے کا وقت نہیں آیا تا آنکہ غیر مطبوعہ متون مدوّن ہو کے شائع نہ ہو جائیں۔ اپنے متعدد مضامین میں، جن میں بعض غیر مطبوعہ متون کا تفصیلی تعارف کرایا ہے، ان میں یہ خاص خیال رکھا ہے کہ جتنے نئے لغات یا رائج لغات کے غیر معروف اسناد یا نئے معانی ہاتھ آجائیں، سب کے سب درج کر دیئے جائیں۔ ان دنوں مصحفی کے دیوان ہشتم کی تدوین اسی خیال کے پیش نظر ہو رہی ہے کہ اس میں نئے لغات کا بے اندازہ ذخیرہ موجود ہے جو یکجا ہو کے پیش کیا گیا تو لغت نگاروں کا ایک اہم ماخذ ہو جائے گا۔

تدوین کا اہم نمونہ دیوان جوشش (اور ایک حد تک قطعات دلدار) میں ملتا ہے جو تیس پینتیس سال قبل شائع ہوا تھا۔

فارسی تحقیق | اکثر اردو والے قاضی صاحب کو صرف اردو کے بڑے محقق کی حیثیت سے ہی جانتے ہیں۔ اردو میں ان کا جو درجہ ہے، اس سے کسے انکار ہے۔ لیکن

فارسی زبان اور ادبیات پر بھی (فارسی کے اس قدر مطالعہ کی روشنی میں) ان کا جتنا وقیع کام ہے ـــــ اور جیسی نظر ہے ـــــ وہ کسی بھی لحاظ سے اردو کام سے کم رتبہ نہیں ہے۔ اور ہمارے محققوں میں ایسا تو کوئی بھی نہیں ہے (ایران میں بھی خال ہی خال ہوگا) جو عہد اسلامی کی فارسی زبان و ادب پر ایسی نظر رکھنے کے ساتھ پہلوی اور پرانی فارسی (اوستا، ہخامنشین) پر بھی محققانہ نظر رکھتا ہو۔ غالب اور اس سے بھی بڑھ کے دساتیر کا جعل ثابت کرنے کے لئے انھوں نے عمر عزیز کے پینتالیس پچاس سال گزرنے کے بعد اس میں مہارت حاصل کی یہ بھی قابل ذکر بات ہے۔

غالب شاد، ابوالکلام

غالب، شاد اور ابوالکلام آزاد، وہ تین موضوع ہیں جن پر بات چھڑ جائے تو پھر رشید وہ کہیں اور سنا کرے کوئی! غالب کا معاملہ دوسرا ہے۔ وہ تو ان کا محبوب ترین شاعر ہے۔ اس کا ایک ایک لفظ انھوں نے بالاستیعاب کئی کئی بار پڑھا ہے۔ اردو کلام قریب قریب سارا کا سارا از بر تھا۔ جس کا بڑا حصہ آج بھی یاد ہے۔ باقی رہے شاد اور ابوالکلام تو (غالب کی مانند شاد کو شاعر کی حیثیت سے پسند کرنے کے باوجود) ان دونوں نے اپنے بارے میں غلط بیانی اور مبالغہ سے اس قدر کام لیا ہے اور اپنی عظمت کا سکہ ابھارنے کی ایسی بے جا کوششیں کی ہیں جن سے ایسی طبیعتوں میں جیسی قاضی صاحب کی ہے، ایک شدید ردعمل ہوا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ یہ دونوں ان کے لئے الجھی کا سا درجہ اختیار کر گئے ہیں۔ غالب پر تو ان کے قلم کی بہترین کاوشیں شائع ہو چکی ہیں، البتہ شاد پر (شاد کی کہانی۔ شاد اور حیدرآباد وغیرہ) چند مضامین ہیں۔ ابوالکلام آزاد کے بارے میں چار چھ متفرق مضامین شائع ہوئے ہیں لیکن ان شائع شدہ مضامین کی ضخامت سے چار پانچ گنا زیادہ مواد ان دونوں کے بارے

ہیں ان سے گفتگو کے درمیان چند گھنٹوں میں جمع کیا جاسکتا ہے۔ بس ان کا ذکر چھڑ جاتا ہے!

(۲)

ڈاکٹر صاحب نورالدین صاحب ۔ انصاف ہوگا تو پھر انصاف ہی ہوگا | ڈاکٹر صاحب

ہمعصروں میں، واجد علی خاں کیمبرج کے ساتھیوں میں، مسٹر نورالدین احمد اور مسٹر فخرالدین علی احمد بے تکلف قریب ترین دوستوں میں اور مولانا محمد علی بزرگوں میں، وہ لوگ ہیں جن کا ذکر قاضی صاحب بڑی محبت سے کرتے ہیں۔ اور میرا اندازہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو تو شاید وہ محبت سے آگے احترام کا درجہ دے دیتے ہیں ـــــ اور نورالدین صاحب وہ تنہا شخص ہیں نے دیکھا جو قاضی صاحب کو ان کے منہ پر بڑے پیار سے کتنی ہی صفات سے متصف کرتے ہوتے تھے جن میں سے کوئی ایک صفت کسی دوسرے کی زبان پر آجاتی تو قاضی صاحب ازالہ حیثیت عرفی کا دعویٰ کر دیتے مگر یہاں سنتے رہتے اور مسکراتے رہتے۔ دونوں دوست ایک دوسرے کو ٹوٹ کے پیار کرتے تھے اور کتنا طویل المدت رشتہ تھا یہ! کالج کا ساتھ عمر بھر کا ساتھ ہو گیا تھا۔ یوں کہنے کو کیمبرج کے دوستوں میں ڈاکٹر نظام الدین (حیدرآباد) بھی تھے۔ فیض (بمبئی) بھی۔ کرنل زیدی بھی، عمر حیات ملک بھی، واجد تخشو بھی، لیکن پرانی دہلی کے بیرسٹر نورالدین احمد سے جیسی کا بھی۔ اس کے آس پاس کچھ پہنچ جاتے ہیں تو بس فخرالدین علی احمد۔ لیکن پھر بھی کتنا بڑا فرق رہ جاتا ہے۔ "تم" سے "تم" کے رشتہ میں اور "تم" سے "آپ" کے رشتہ میں!

میں کچھ آگے نکل گیا۔ کہنا یہ تھا کہ اپنے اس جگری دوست کے بارے میں بھی جب

بے لاگ جائزہ اور رائے کی بات نکلی تو ان کی زبان سے ایسی باتیں بھی نکلیں جو
نورالدین کا انتہائی سخت ناقد ہی کہہ سکتا تھا یہی حال ذاکر صاحب کے سلسلے میں رہا ہے۔
ذاکر صاحب اپنی ملاقاتوں کا ذکر بہت مزے سے کرتے ہیں۔ اور ان سے گفتگو کی جزئیات
تک یاد ہیں۔ برلن میں پہلی ملاقات سے لے کر گورنر بہار تک اور پھر صدر جمہوریہ تک ب——
—— ذاکر صاحب میں ایک کشش تھی۔ بڑے کلچرڈ آدمی تھے۔ بہت اچھے Conversationalist
تھے مسلمانوں کے لیے بڑا درد تھا ان کے دل میں۔ جب بھی ذکر چھڑ جاتے،
یہ اور بہت سی اسی قسم کی باتیں جن سے ذاکر صاحب ایک پیاری قابلِ احترام شخصیت بن
کے ابھرتے ہیں، ان کی زبان پر جاری رہتی ہیں۔ ذاکر صاحب شاید وہ تنہا شخص ہیں جن کے
مشورہ کو من وعن قبول کرتے رہے۔ ایک سخت تنقیدی (بلکہ معاندانہ!) مضمون شمار
کی کہانی پر تبصرہ کا آغاز ایسے مداحانہ انداز پر کیا جو بقیہ پورے مضمون سے بالکل الگ
برعکس ہے۔ (اور اس ذیل میں ذاکر صاحب کا طریق کار بھی بتانے لگے کہ کسی نے پوچھا،
کیا مولانا آزاد فرنچ سے واقف تھے ذاکر صاحب نے جواب "نہیں" سے شروع نہیں کیا۔
کہنے لگے۔ جی ہاں، مولانا ترجموں کے ذریعہ فرنچ سے خاصہ واقف تھے")۔ اس
سب کے باوجود ذاکر صاحب علی گڑھ کے سوال پر خاموش کیوں رہے، جین منیا سے
ملنے گئے تو پیر کیوں چھوئے، نمسکار کرنے کے لیے اپنا وقار چھوڑ کے ہاتھ کیوں
جوڑنے لگے تھے، سنسکرت آمیز ہندی میں کیوں تقریر —— اور اس قسم کے معلوم
عوام اعتراضات میں نہ صرف دوسروں کے ساتھ ہیں بلکہ کچھ زیادہ سختی کے ساتھ تنقید
کرتے ہیں۔

منصف مزاجی جب اس انتہا کو پہنچ جائے تو دیہ جاتا ہے کہ پھر زبان اور قلم دونوں
اپنے بس میں نہیں رہتے۔ ایسا لگتا ہے جیسے انصاف پسندی کے فرشتے نے اپنے شہپر پھیلا کر اس۔

قلم دونوں کو ان کے مالک کے قبضے سے الگ کھینچ کے اپنی تحویل میں لے لیا ہے۔

ایک راز بڑی بے بسی سے کہنے لگے "کبھی کبھی تو اپنی اس عادت سے بڑی تکلیف محسوس ہوتی ہے مگر ایسی بری عادت پڑ چکی ہے کہ زبان سے ایسی باتیں نکل ہی جاتی ہیں سننے والے اس شخص سے جا کے کہتے ہیں۔ جاننے والا ہوتا ہے اور اسے دکھ ہوتا ہے تو اس سے مجھے بھی تکلیف ہوتی ہے مگر کیا کروں"

والد، تنہا استثنا

اپنے والد کے سوا کسی بڑی سے بڑی شخصیت کو ان کی تنقید کی زد سے باہر نہیں پایا۔ لیکن تنقید میں نہ تضحیک نہ استہزا نہ دلآزاری بلکہ صرف بیان واقعہ!

مرعوب ہونا سیکھا ہی نہیں

مرعوب ہونا انھوں نے شاید کبھی جانا ہی نہیں۔ محمد علی، راجن بابو، جواہر لال نہرو جیسے اکابر سیاست کی ہم نشینی، فخرالدین علی احمد اور ڈاکٹر ذاکر حسین جیسے مشاہیر کے ساتھ برابر کی دوستی، عبدالحق، عندلیب شادانی۔ زبیر صدیقی، عبدالستار صدیقی، اکرام، حمید احمد خاں اور ان گنت مشاہیر ادب کے ساتھ برابر کا اٹھنا بیٹھنا (جو مشاہیر ہیں ان کا تو ذکر ہی کیا اور ان میں سے کون ہے جو نہیں جانتا، محترم نہیں سمجھتا!) پھر یورپ میں چھ سات سال قیام۔ کیمبرج میں اعلیٰ تعلیم، اس سے قبل علی گڑھ میں ابتدائی تعلیم ـــــــ اس علی گڑھ میں جو خود کیمبرج اور آکسفورڈ کا نمونہ بن رہا تھا اور اس سے بھی قبل، بالکل بچپن میں باپ کا سایہ سر سے اٹھ جانے کے بعد بڑا بیٹا ہونے کے ناتے گھر کا مطلق العنان ہو کے ابھرنا، اور گھر بھی وہ جو پٹنہ کے چوٹی کے کھاتے پیتے رئیس گھرانوں میں سے ایک ہو ـــــــ پھر مرعوب ہونے کا خانہ ہی

خدایا مجھے سکت دے | خدایا مجھے سکت دے کہ اپنے آپ کو دیکھ سکوں، ایسا جیسا کہ میں ہوں۔ بات چیت کے درمیان بودلیر کا یہ قول قاضی صاحب اکثر دہراتے ہیں۔ اور حیرت ناک حد تک اپنی حدود، وسعت، صلاحیت، خوبیوں اور خامیوں سے واقف ہیں۔ اس درجہ سختی سے جیسے وہ کوئی دوسرا شخص ہوں جس کے بارے میں آگہی کی ذمہ داری ان پر آ گئی ہو!

ان کے بارے میں مبالغہ آرائیاں | ان کے بارے میں عام سمجھنے والے کہہ سکتے ہیں (اور آئندہ تو جانے کیا کچھ نہ کہا جائے) کہ وہ اردو فارسی کے علاوہ ہندی، عربی، جرمن، لاطینی پر بھی پوری دسترس رکھتے ہیں۔ یہ زبانیں انھوں نے پڑھی ضرور تھیں لیکن زبانوں کا معاملہ یہ ہے کہ مزاولت کے بنا کام نہیں چلتا اور ان سے ملئے تو مولانا آزاد کی طرح جرمن یا لاطینی کی کتاب لے کے نہیں بیٹھ جائیں گے بلکہ بڑی صراحت کے ساتھ آپ کے ذہن نشین کر دیں گے کہ عربی بہت کچھ بھول گیا۔ لاطینی اب اتنی کم جانتا ہوں کہ نہ جاننے کے برابر ہے۔ جرمن بہت کچھ بھول گیا مگر لاطینی کی طرح نہیں۔ ہندی اب بالکل نہیں پڑھ سکتا، پہلوی رسم الخط بھی بھول گیا۔

آدمی کا مطالعہ: میری ہوبی | وہ کہتے ہیں، آدمی کو سمجھنا میری ہوبی رہی ہے اور اس کے نتیجے میں اگرچہ میں شناس اور اعمال کا بڑا سخت ناقد رہا ہوں۔ لیکن دل کی طبعی نرمی نے ایک دن ان سے نہ معلوم کس موڈ میں یہ اعتراف بھی کرا لیا کہ کسی کے بارے

میں ایسی بات کہہ کر دکھ ہوتا ہے جس سے اسے تکلیف پہنچے۔ چاہے وہ بات سچ ہی کیوں نہ ہو، خصوصاً کسی ایک شخص کے بارے میں جس سے کوئی علاقہ ہو! یہ الگ بات ہے کہ سچ کہنے سے پھر بھی باز نہیں رہ سکتے۔

سچ کی حجیت حجیت ہمیشہ سچ کی ہوتی ہے۔ لڑکپن اور نوجوانی میں اس مقولے پر اس قدر اعتقاد تھا کہ اپنے پیڈ پر انھیں معنی کا لاطینی جملہ چھپوا لیا تھا۔ اب وہ ایک عرصے سے اس قول پر اعتقاد کھو چکے ہیں۔

دل گداختہ تور، انداز اور اطوار اس قدر کڑے کہ ان کی طبیعت میں نرمی یا گداز ہونے کا شائبہ گمان تک نہیں ہوتا۔ پھر کیسے یقین ہوگا کہ مثلاً بنگلہ دیش تحریک کے زمانے میں کسی ستم رسیدہ کی داستان کے دو جملوں کے بعد تیسرا جملہ سننا ان کے لیے محال ہو جاتا تھا اور دل کی حالت لمحے بھر میں غیر ہو جاتی تھی۔ اور پھر تو رفتہ رفتہ ایسا ہو گیا تھا کہ محض اس ذکر پر بھی ان کا دل بھر آتا تھا۔

بناوٹ سے نفرت بناوٹ اور بننے والے شخص کو پسند ہی نہیں کرتے۔ یہ ناپسندیدگی نفرت اور حقارت کی منزل تک پہنچ جاتی ہے۔ مولانا ابوالکلام کو ناپسند کرنے اور ذاکر صاحب کو پسند کرنے کی ایک بنیاد یہ بھی ہے۔

اچھے شخص کا اچھا فنکار ہونا لازمی نہیں اچھے شاعر کے لیے رشید احمد صدیقی کے برعکس قطعی ضروری نہیں سمجھتے کہ وہ اچھا آدمی بھی ہو۔ خسرو، غالب اور اقبال

تینوں کے سلسلے میں اپنے اس نظریہ کا اطلاق پوری وضاحت کے ساتھ کرتے ہیں۔ اور خسرو کی دربارداری، غالب کی ناراست گفتاری، اقبال کی خوشامد اور اخلاقی کمزوریاں وجسم ڈھکے چھپاتے ہیں، تاویلیں کرتے ہیں۔ قاضی صاحب انہیں، جیسے کہ وہ ہیں، اسی صورت میں دیکھتے ہیں اور پیش کردیتے ہیں۔ خسرو قطعی صوفی آدمی نہیں تھے۔ بلکہ خاصے دنیادار تھے۔ غالب موقع ومصلحت شناس، جھوٹے، بددیانت، مالی معاملات میں کمزور طبیعت، خود غرض، کنبہ پرور، اور مجموعی طور سے خاصے احمق آدمی تھے۔ علمی اعتبار سے خاصے کورے تھے، اتنے کہ تاریخ کو اساطیر سے ممیز نہیں کرسکتے تھے۔ لغت کے میدان میں دخل ضرور دے بیٹھے حالانکہ وہ اس فن سے نابلد تھے۔ اقبال معمولی عہدے کی امید پر ارباب اقتدار کی تعریفوں میں زمین کو آسمان کہہ سکتے تھے۔ گھریلو زندگی میں وہ اچھے شوہر، اچھے باپ، اور اچھے دوست شاید نہیں ہوتے۔ کلام میں مربوط فکر یا کوئی واضح فلسفہ ان کے یہاں دور دور نہیں ملتا۔

یہ یا اس قسم کی باتیں خسرو، غالب اور اقبال کے بارے میں کہہ دینے کے بعد کوئی توقع نہیں رکھتا کہ صحرا میں نخلستان بھی آئے گا۔ لیکن جب قاضی صاحب انھیں لوگوں کے بارے میں کہنے لگتے ہیں کہ

——— مگر خسرو کی شاعرانہ عظمت کو ماننا پڑتا ہے۔
——— مگر ان امور سے غالب کی شعری عظمت پر کوئی حرف نہیں آتا۔
——— مگر اقبال کی شاعری میں جو شعری کاشش ہے وہ اپنی جگہ پر ہے

تو وہ جو صرف سیاہی یا صرف سپیدی کے قائل ہیں، یہ سب کچھ ان کی ذہنی گرفت میں آتے آتے پھسل جاتا ہے۔

خالی برتن اور استناد حدیث

اردو کے ایک معروف محاورے کے مطابق وہ دیگ کا ایک چاول دیکھ کر پوری دیگ پر حکم لگا سکتے ہیں۔ بادی النظر میں ایسا کرنا انصاف سے بعید معلوم ہوتا ہے لیکن عملاً اس طرح جس نتیجہ پر وہ پہنچتے ہیں وہ صحیح ہی ہوتا ہے (اور گفتگو میں وہ اگرچہ اس ایک چاول ہی کا ذکر بھلے ہی کریں لیکن لکھتے وقت جب تک پوری دیگ کو اچھی طرح نہیں کھنگال لیں گے، ان کے قلم سے کچھ نہیں نکلے گا)

ایک مشہور عاشق رسولؐ کا واقعہ تاریخوں میں محفوظ ہے کہ ایک حدیث کے استناد کے خیال میں رواۃ میں کسی ایک راوی کے بارے میں انہیں پتا چلا کہ وہ زندہ ہیں اور کسی دور دراز علاقہ میں مقیم ہیں۔ سفر کی چند در چند صعوبتیں اٹھا کے وہ جب ان تک پہنچے تو دیکھا، گھوڑے کو بلا رہے ہیں اور دانہ کا برتن کھنکھناتے جاتے ہیں جس کی آواز پر گھوڑا پیچھے آتا جاتا ہے۔ برتن اس زاویہ سے رکھا تھا کہ گھوڑے کی نظر نہ پڑ سکے۔ لیکن استناد حدیث کے متلاشی نے دیکھ لیا کہ برتن خالی ہے۔ صرف گھوڑے کو دھوکا دیا جا رہا ہے کہ وہ اس میں چارا سمجھ کے کھنچا چلا آئے چنانچہ وہ اسی طرح پیچھے پیچھے چلا آ رہا تھا۔ وہ عاشق رسولؐ جو میلوں پا پیادہ سفر کر کے اس محترم راوی سے ملنے گیا تھا، خاموشی کے ساتھ الٹے پاؤں واپس پھر گیا۔ سبب پوچھنے والے کو اس نے جو جواب دیا وہ وہی ہے جو قاضی صاحب بطور اصول جا بجا برتتے ہیں۔ اس نے کہا تھا "جو شخص بے زبان جانور کو اس طرح دھوکے سے بلا سکتا ہے، اس کی روایت پر کیسے اعتبار کیا جا سکتا ہے۔

ہمارے متعدد معروف محققوں کی اس قسم کی کوئی ایک ا . . بات جس کی طرف میری آپ کی نظر بھی نہ جائے، ان کے ذہن میں محفوظ ہے اور جب وہ اسے سامنے لاتے ہیں تو ہم

محققوں کے ذہن کی بنیادی کمزوری بھی یا کچھ بھی کا اندازہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ تحقیق یوں بھی حق ادا کرنا، حق کو سامنے لانا، حق اور صرف حق کہنا ہے۔ تحقیق میں مصلحت اور مصلحت کھانے نہیں ہوتے اور کتنے ہیں جو اس کڑے معیار پر پورے اترتے ہیں۔

قلبِ او مومن، دماغش کافر است

ولفریڈ اسکیون بلنٹ جو ایک عرصے تک فرانس میں انگلستان کا سفیر رہا اور پھر سرکاری بندشوں سے اکتا کے یہ بوجھ سر سے اتار کے آزادی خواہوں کی حمایت میں جس سرفروشی کے ساتھ وہ میدان میں اترا اور آخیر تک جما رہا اور مہدی سوڈانی، مفتی محمد عبدہ، اور جمال الدین افغانی کے ساتھ جس طرح دوستی نباہی، وہ سب کچھ تاریخ عالم کا ایک تابناک باب بن چکا ہے۔ فیوچر آف اسلام اسی بلنٹ کی کتاب ہے جس کا ترجمہ مستقبل اسلام کے نام سے ہو چکا ہے اور اکبر الٰہ آبادی کا نام بھی اس ترجمے کے ساتھ وابستہ ہے کہ اسے خود اردو میں ایک پائندہ مقام دلا چکا ہے۔ ان حضرت بلنٹ نے بجز متعدد کتابوں کے متعدد ڈائریاں بھی لکھی ہیں۔ ان میں کسی جگہ خدا کے بارے میں بھی دو تین صفحوں میں لکھتے چلے گئے ہیں۔ اس میں لکھا ہے کہ میں خدا کو مانتا ہی نہیں۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ کائنات میں ایک نظم اور نظام ہے بس سسٹم اور آرڈر اور یہ وہی آرڈر مجھے مجبور کرتا ہے کہ کسی کو میں اسے ضرور مانوں۔ میں نے جب بلنٹ کا یہ اندراج پڑھا تو خوشی ہوئی۔ بلنٹ مجھے پسند تھا۔ اس لیے یہ جی نہیں چاہتا تھا کہ وہ کسی بھی ہٹ دھرمی اختیار کرے۔ اس کا اتنا لکھنا میرے لیے کافی تھا۔ نہیں سے شبہ کے اس نے ہاں لکھ دیا تھا، گو بلنٹ ماڈرن اور سائنٹیفک تھا۔ برٹرنڈ رسل کی خود نوشت میں بھی اس معاملے میں عجیب تر یہ ہے کہ ہر قسم کا انداز ملتا ہے۔ ہزار داستان کے شہزادے کی مانند جب انسان کبھی

میں نکلا تو بالآخر یہیں پر آ کے دم لیا تھا کہ کچھ تو ہے۔ عہد قدیم میں اس قسم کی ایک مثال، بڑے بزرگوں میں شاید تنہا مثال، گیا کے گوتم کے یہاں ملتی ہے۔ جو اس عظیم درخت کی چھاؤں میں نور برتر کی تلاش میں جم کے بیٹھا تو اسے پا کے ہی اٹھا۔ "ہمیں بتاؤ وہ کیا ہے؟" دنیا کے بازاری حقیقت اعلیٰ کو بھی کوئی ایسی لین دین کی چیز سمجھ بیٹھے تھے جسے کوئی پا کے ایسی ہی آسانی سے مٹھی بھر بھر کے دوسرے کے دماغ کی جھولی میں ڈال سکتا ہے۔ وہ اس کا کیا جواب دیتا۔ لوگ اور جھنجھلائے۔ "تم بتاتے کیوں نہیں؟ بولتے کیوں نہیں؟ تمہارے پاس علم ہے۔ تم نے زندگی اس کی تلاش میں تج دی ہے۔ ہمیں راستہ دکھاؤ گوتم ہمیں راستہ دکھاؤ! بتاؤ کیا اس دنیا کا کوئی خالق، مالک، پروردگار کوئی ہے، تو کون ہے، کیا ہے، کہاں ہے (اور کیوں ہے)۔ لوگ چیختے رہے۔ اور کپل وستو کا شہزادہ اپنے نحیف بدن کو بمشکل سنبھالے بوڑھے برگد کی چھاؤں میں بیٹھا دور خلاؤں میں تکتا رہا، تکتا رہا۔ لوگ چیختے رہے اور وہ بس خاموشی سے تکتا رہا۔ تھک تھک کے لوگ ایک کے بعد ایک واپس ہونے لگے کچھ سمجھ کے کچھ بے سمجھے بوجھے! اور گوتم کی خاموشی میں سے ایک نغمہ نکل کے شتلانے لگا!

اگر نہ سہل ہوں تجھ پر زمیں کے ہنگامے
بری ہے مستی اندیشہ ہائے افلاکی

پانے والے رمز کو پا سے گئے!

قاضی صاحب بڑی صفائی سے (اور قدرے جھنجھلاہٹ کے ساتھ!) پہلی ہی ملاقات میں آپ پر یہ واضح کر سکتے ہیں کہ "میں مذہبی آدمی نہیں ہوں"۔ لیکن ایسا وہ کیوں کہتے ہیں اور مذہب بیزاری ان کے اندر کیسے آئی۔ اس کے دو بنیادی اسباب ہیں جو مختلف موقعوں پر باتوں باتوں میں مجھ پر واضح ہوئے۔ ایک تو وہ بنیادی طور سے امن پسند

آدمی ہیں اور خون خرابہ، جنگ وجدل، جھگڑے فساد سے سخت نفرت ہے اور مذہب کے نام پر جس قدر خون خرابہ ہوا ہے، وہ سب کو معلوم ہے۔ دوسرے مذہب کو لبادہ کے طور سے اوڑھنے والے لوگ بالعموم مذہب کو جس قدر بدنام کرنے کا باعث بنے ہیں، وہ ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ ہے۔ تاریخ کا مطالعہ ایک طرف اور ستر اسی سال کی متنوع زندگی میں مذہب کو مال تجارت بنانے والے افراد کا ذاتی تجربہ دوسری طرف۔ یہ دونوں چیزیں مل کر کافی تھیں کہ کسی بھی منصف مزاج، حق پسند شخص کو اس مذہب سے دور لے جائیں؛ وہ دور ضرور ہوئے لیکن صرف اس مذہب سے جس کا اوپر بیان ہوا۔ ورنہ مذہب اگر مذہبی اقدار کا نام ہے، منصف مزاجی اور حق پسندی جس کے بنیادی پتھر ہیں تو ان کا جیسا مذہبی مجھے میرے زمانے میں تو نظر آیا نہیں۔ "سچ اور سچ کے سوا کچھ بھی نہیں" ——— یہ الفاظ کہہ دینا جتنا آسان ہے، ان کا پالن دشوار گزار مرحلہ، دشوار ہی نہیں ناممکن کی سرحدوں کو چھوتا ہے، اس ناممکن کو ہر وقت ممکن میں ڈھلتے دیکھنے کے بعد کون ایسے شخص کو مذہبی یا لامذہبی کی درجہ بندیوں میں قید کرے گا!

اقبال نے اپنی ذاتی ڈائری میں ایک جگہ لکھا ہے۔

"میرے اکثر احباب مجھ سے پوچھ بیٹھتے ہیں، "کیا تم خدا کے وجود میں عقیدہ رکھتے ہو؟" اور میں سوچنے لگتا ہوں کہ مجھے بھی اس کا حق پہنچتا ہے کہ ان لوگوں کو جواب دینے سے پہلے جو الفاظ یہ استعمال کرتے ہیں ان کے معانی ان سے پوچھ لوں۔ میرے ان دوستوں کو اس بات کی وضاحت کرنی ہوگی کہ عقیدہ سے ان کی کیا مراد ہے۔ وجود سے وہ کیا مطلب لیتے ہیں اور خدا کو کن معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔ خاص کر آخری دو کے بارے میں ضرور پوچھنا چاہوں گا، اگر وہ اپنے

سوال کے جواب پر مصر ہوں۔ مجھے اقرار ہے کہ میں ان اصطلاحوں کو نہیں سمجھ پایا ہوں۔ اور جب کبھی میں ان لوگوں سے جرح کرتا ہوں تو پتا چلتا ہے کہ وہ بھی میری طرح ناواقف محض ہیں۔"

اگر قاضی صاحب قانون داں نہ ہوتے۔ دو اور دو کو سپاٹ طریقے سے چار کہنے کے عادی نہ ہوتے اور حق پسندی انھیں مجبور نہ کرتی کہ عام آدمی کو اس کی زبان میں جواب دے کر رخصت کردیں تو ان کا فلسفیانہ جواب بھی یہی ہوتا جو اقبال نے دیا۔

عالمی انسان

عالمی انسان کا تصور ہمارے عہد کے متعدد مفکروں نے پیش کیا ہے، رسل کی مانند ایک آدھ 'دیوانے' نے اس پر عمل پیرا ہو کے نمونہ دینے کی کوشش بھی کی ہے۔ میں کبھی کبھی اس بات پر مسرور سے آگے اپنے کو مغرور سا محسوس کرنے لگتا ہوں کہ اپنے عہد کے ایک عالمی انسان کو میں نے بھی اتنا قریب سے دیکھا ہے! سنا ہے"

قاضی صاحب جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں، خدا کو بھی مانتے ہیں تو اسی آفاقی نظر سے۔ بطور ایک سسٹم کے، ایک آرڈر کے! نظم و ضابطہ جو پوری کائنات میں جاری و ساری ہے، کائنات جو ایک ہے، نظام شمسی جس کا ایک معمولی حصہ ہے، جس میں نظام شمسی کا ایک ادنیٰ حصہ ہماری زمین ہے، قوم پرستی اور قومیت کے سخت دشمن ہیں اور اسی آفاقی نظر کے تحت، جانوروں کی طرح لڑتی ہوئی قوموں کی نجات صرف اس میں دیکھتے ہیں کہ ایک عالمی ریاست، ورلڈ اسٹیٹ، قائم ہو اور سارے ممالک اس ایک ریاست کے علاقائی صوبے ہوں اور بس! ملنے جلنے میں، تحسین و تقریر میں، معاملات میں، سب جگہ یہ آفاقی نقطۂ نظر قائم رہتا ہے۔ شیعہ، سنی، ہندو مسلمان

ہندی، ایرانی، امریکی، انگلستانی سب یکساں۔ فوقیت صرف اس کی ہے کہ کون کتنا عقلیت پسند، راست گو، صاحب علم اور صاف ذہن کا مالک ہے۔

محمد منصور عالم

شاد عظیم آبادی اور قاضی عبدالودود

قاضی عبدالودود نے شاد عظیم آبادی پر بہت کچھ لکھا ہے۔ سبھوں کو یکجا کیا جائے تو ایک کتاب ہو جائے گی۔ اس مقالے میں شاد کے بعض بیانات سے متعلق قاضی صاحب کی توضیحات و تحقیقات پیش کی گئی ہیں اور ان کے دو تبصروں (تبصرۂ شاد کی کہانی شاد کی زبانی: اشتر و سوزن اور تبصرۂ تذکرۃ الاسلاف، سہ ماہی نوائے ادب، بمبئی، جنوری ۱۹۶۳ء) سے قطع نظر کیا گیا ہے۔

۱

قاضی عبدالودود سے متعلق شاد کے بیانات "ڈاکو نامہ" سے نقل کیے جاتے ہیں:۔

"... سب سے زیادہ قابل بیان یہ بات ہے کہ جب میاں قیس[۱] کسی جگہ نوکر نہ تھے تو میرے ہی غریب خانہ پر شب و روز رہتے تھے[۲]... ان سے

ع۱۔ قیس کا پورا نام سید معین الدین احمد رضوی تھا۔ قیس تخلص کرتے تھے۔ شاد کے شاگرد تھے۔ انہوں نے گلشن حیات ایک کتاب بھی لکھی ہے، جس میں شاد کی مختصر سوانح عمری اور ان کے ۴۲ تلامذہ کا ذکر ہے۔ شاد نے "ڈاکو نامہ" میں ان پر سرقے کا الزام لگایا ہے اور ان کی مذمت کی ہے "ڈاکو نامہ" سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاد ان کی حرکتوں سے نالاں تھے۔

ع۲۔ قاضی عبدالودود کا بیان ہے کہ قیس انہیں کے یہاں رہتے تھے، لیکن عادت اچھی نہ تھی۔ قاضی صاحب نے مجھ سے کہا کہ ان کی کچھ کتابیں غائب ہو گئی تھیں۔ انہیں قیس پر شبہ ہوا۔ لیکن کچھ نہ بولے۔ ایک روز ایک خط سپرد ڈاک کرنے کو دیا اور چھپ کر دیکھنے لگے۔ دیکھا کہ قیس جیسے ہی گھر سے نکلے، خط پڑھنا شروع کیا۔ قاضی صاحب کو تکلیف ہوئی۔ انہوں نے قیس کو کہا، اپنا انتظام اب دوسری جگہ کرو۔

قاضی عبدالودود صاحب نے ذکر کیا کہ اگر حضرت شاد راضی ہوں تو ان کے کلام میں سے ہم ایک دس جزو کا دیوان غزلیات اپنے خرچ سے چھپوا دے سکتے ہیں۔ چنانچہ وہ[1] اور مولوی سید محمود شبیر[2] صاحب میرے گھر تشریف لائے اور مجھ سے بیان کیا کہ ان کا ایسا قصد ہے۔ دونوں صاحبوں کے جد بزرگوار میرے قدیم مخدوم تھے۔ کیوں کر ہو سکتا تھا، میں کوئی عذر کرتا۔ مگر میں نے یہ عذر کیا کہ میری جتنی غزلیں ہیں، بجز دو تین مجلد کے سب متفرق اور بے ترتیب الگ الگ پرچوں پر ہیں جن کو دوبارہ اصلاح دے کر مرتب کر لینا بہت ضروری ہے۔ ورنہ سینکڑوں غلطیاں رہ جائیں گی۔

اکثر مسودوں پر کسی شعر پر ص کسی پر ن کسی پر ق لکھ لکھ (کذا) دیا ہے تاکہ صاف کرنے کے وقت اس کو بدلتا جاؤں۔ میاں قیس اس کے ذمہ دار ہوئے کہ ہم اس کام کو سرانجام کریں گے۔ اور جتنی غزلیں بے ترتیب

---

[1] "وہ" سے مراد کون، قیس یا قاضی صاحب؟ — میں نے قاضی صاحب سے پوچھا، مولوی سید محمود شبیر کے ساتھ آپ گئے تھے؟ انہوں نے جواب دیا، "نہیں"۔

[2] سید محمود شبیر قاضی صاحب کے دوست تھے۔ میں نے قاضی صاحب سے سید محمود شبیر کے والد کا نام پوچھا۔ انہوں نے کہا، سید احمد شبیر اور سید محمد شبیر دو بھائی تھے۔ سید محمود شبیر انھیں میں سے کسی کے لڑکے تھے۔ میں نے اطہر شبیر صاحب سے بھی رجوع کیا۔ انہوں نے ان کے والد کا نام سید احمد شبیر بتایا۔ سید محمود شبیر ان دنوں کراچی میں ہیں اور وکالت کرتے ہیں۔ کبھی وہ افسانے بھی لکھتے تھے۔ ان کا افسانہ "پٹنہ کا یکہ" ندیم، گیا میں چھپا تھا۔

ہیں ان کو ترتیب وار لکھ کر آپ سے اصلاح لے کر قاضی صاحب کے حوالے کریں گے
تاکہ اس میں سے وہ دس جزو منتخب کرلیں۔ میں نے خوش ہو کر بہت سی دعائیں
کو دی اور یہ نہ جانا کہ اس پردے کے اندر قیس صاحب کو کیا منظور ہے۔ چنانچہ کپڑے
کا ایک بڑا موٹھ لے کر میری جتنی غزلیں یا مجلد جتنی سب کی ایک جگہ باندھا۔
یہاں تک کہ میرے پاس ایک شعر بھی نہ چھوڑا۔ اور اٹھا لے گئے مگر قاضی صاحب
نے یہ چالاکی کی کہ اس موٹھ کو لے کر اپنے کنے (کذا) بند کر دیا۔۔۔ ہم یہ
سمجھتے رہے کہ جیسا وعدہ کیا گیا ہے وہ لکھتے اور ترتیب دیتے ہوں گے۔۔۔
مدت بعد ہم کو معلوم ہوا کہ قاضی صاحب نے اس قول و قرار کو کہ میاں قیس
لکھیں اور ہم سے دکھائیں اور پھر کاپی لکھی جائے قائم نہ رکھا ہے اور اس
طرح ہر ایک پرچہ نکال کر کاتب کے حوالے کیا ہے اور کاپیاں برابر لکھی جارہی
ہیں۔ ہم نے سر پیٹ لیا۔ اور کہا کہ خود کردہ را علاجے نیست۔ بڑی بڑی
خرابی کے بعد کچھ کاپیاں صاف کی ہوئی میرے پاس لائی گئیں لیکن تماشا
یہ ہے کہ چونکہ اکثر غزلیں مکرر الگ الگ لکھی ہوئی تھیں اور جو نشانات شعروں
کے بدلنے کے لئے ہم نے جس جس پر دیے دیے (کذا) دیئے تھے وہ
مسو(دہ) کاپی کے ساتھ میرے پاس نہ آیا۔ بلکہ الگ ایک مجلد پر وہی غزلیں
وہ بھی بڑی بڑی خرابی سے میرے پاس لائی گئیں۔ لہذا میں کاپی کی تصحیح سے
باز رہا۔ اور بڑی سختی کے ساتھ وہ کاپیاں مجھ سے لے لی گئیں۔۔۔ قاضی
صاحب نے انہیں کاپیوں کو علی گڑھ بھیج کر قریب قریب نو جزو کے چھپوائے
تھے کہ میں نے بہت منت اور آرزو سے ان کو لکھا کہ جس قدر روپیہ آپ کا
اس چھپوانے (کذا) میں خرچ ہوا ہے، وہ مجھ سے واپس لے لیجیے۔ اور چھپے

فرمے اور کاپیاں لکھی گئی ہیں، میرے حوالے کیجیے۔ اور واضح رہے کہ جب قاضی صاحب نے مجھ سے دیوان چھپوانے کی غرض پیش کی ہے (کذا) تو کئی دفعہ یہ کہا تھا کہ ہم کو غرض اس کے نفع سے نہیں ہے۔ جو کچھ بعد خرچ کے بچے گا، سب آپ کا ہے۔ غرض، میرے اس لکھنے پر قاضی صاحب نے ایک ایسا جواب میرے پاس لکھ کر بھیجا کہ میں اس کی اداکاری (کذا) کا متحمل نہ ہو سکا بلکہ میں اس تدبیر میں تھا کہ جتنے روپے ہوں واپس بھیج کر فرمے اور کاپیاں جلوا دوں۔ اس بیچ میں وہ بقیہ دیوان بھی دس جزو کا بنام کلامِ شاد چھپا کچھ کر چھپا ہے، آپ حضرات اس سے اچھی طرح واقف ہیں۔ لیکن چونکہ ملک بھر کو میرے کلام سے دلچسپی تھی، ہاتھوں ہاتھ بکنا شروع ہوا۔ پچاس نسخے تو خود قاضی صاحب اپنے ساتھ ولایت لے گئے۔ بقیہ اپنے بھائیوں کے سپرد کر گئے۔ میرے خیال میں اس دس جزو کے چھاپنے میں بہ ہمہ جہت دو ڈھائی سو روپے خرچ ہوئے ہوں گے لیکن باوجود مختلف قیمت رکھنے کے یعنی موقع پا کر چار روپیہ و تین روپیہ اور ڈھائی روپیہ سے کم تو یہ دیوان فروخت نہ ہوا۔ اگر اس پانچ سو جلد کی قیمت دو ہی دو روپے رکھے جاتے تو منہا کر کے چھ سات سو روپے نفع کے ہوتے ۔۔۔۔ غرض جب قاضی صاحب کا کام پورا ہو گیا تو معلوم ہوا کہ بقیہ جو کلام ان کے پاس بے چھپا رہ گیا ہے وہ اپنے ہمراہ ولایت لے جا رہے ہیں۔ میرے ہاتھ کے طوطے اڑ گئے اور مجبوراً ہی کو قاضی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس وقت دل میں یہ ٹھنی ہوئی تھی کہ بقیہ کلام قاضی صاحب نے میرے حوالے نہ کیا تو انہیں کے سامنے اپنے پیٹ میں چھری مار کر وہیں مر رہوں گا۔ بارے بڑی بڑی

مشکل و منت و آرزو سے وہ تھوڑی سی بچی ہوئی غزلیں اندر سے باہر لائی گئیں۔ اور میرے حوالے کی گئیں۔ اور بقیہ کی نسبت یہ کہا گیا۔ (کہ) میاں قیس برابر مجھ سے (قاضی عبدالودود صاحب سے) مانگ مانگ کر لے گئے۔ بایں ہمہ جو کچھ میرے دل پر گزری اور گزر رہی ہے اس کو میں ہی جانتا ہوں ..... نفع تو نفع ہے، اس دیوان کا غلط سلط ایک نسخہ بھی میرے پاس نہ بھیجا گیا۔ چونکہ مجھ کو اس کے دیکھنے کی ضرورت تھی۔ دو روپے خرچ کر کے مول لیا اور جو کچھ بچی ہوئی غزلیں ہاتھ لگیں یا اس دیوان پر اصلاح دے کر ٹھہریں ان کو اپنے پاس محفوظ کر دیا تاکہ وقت پر کام آوے۔"

مذکورہ بیانات کی تحقیق صحت کے لیے میں نے قاضی صاحب سے رجوع کیا۔ میرے سوالات کے جواب میں انہوں نے جو کچھ کہا وہ درج ذیل ہے[1]:

(۱) کلام شاد کی اشاعت کا خیال آپ کو کیوں کر ہوا ـــــ؟

میں شاد کی غزل گوئی کا مداح تھا۔ انہوں نے اپنا کلام چھپوانا شروع کیا تھا لیکن کسی وجہ سے سلسلہ رک گیا۔ مجھے افسوس ہوا، میں نے سوچا، کلام شاد کا ایک انتخاب شائع ہونا چاہیے۔ اس کا ذکر میں نے قیس سے کیا اور کہا کہ شاد راضی ہوں تو میں اپنے خرچ سے چھپوا سکتا ہوں۔ دوسرے یا تیسرے دن قیس ملنے آئے اور کہا کہ استاد راضی ہیں۔

(۲) شاد کا کلام آپ کو کس طرح حاصل ہوا ـــــ؟

میں نے پہلی بار جب قیس سے کلام شاد کی اشاعت کا ذکر کیا تو انہوں نے یہ بات شاد سے عرض کی۔ قیس شاد کی رضامندی کی اطلاع دینے آئے

---

[1] قاضی صاحب کے جوابات حتی الامکان انھیں کی زبان میں پیش کیے گئے ہیں۔

اور اپنے ساتھ کلام شاد کے کئی مجلد اجزا جو ایک ہی دیوان کے کئی
نسخے (قلمی) تھے گٹھری میں باندھ کر لیتے آئے۔

(۳) شاد کا بیان ہے کہ بالآخر یہ قرار پائی تھی کہ قیس غزلوں کو ترتیب دیں، شاد
ان کی نظر ثانی اور اصلاح کریں اور تمام غیر اولوں کا انتخاب کریں۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔
بغیر شاد کی نظر ثانی اور اصلاح کے غزلیں کاتب کے حوالے کر دی گئیں۔ کیا یہ
صحیح ہے؟

نہیں، یہ غلط ہے۔ طے یہ ہوا تھا کہ کلام کا انتخاب شاد خود کریں۔
اور انہوں نے کیا۔

(۴) شاد کہتے ہیں کہ تمام غزلیں جو متفرق یا مجلد تھیں، قیس لے آئے اور ان کے پاس
ایک شعر بھی نہ چھوڑا تو شاد نے انتخاب کیسے کیا؟

قیس نے شاد کے پاس کچھ چھوڑا یا نہیں اس کا مجھے علم نہیں، مگر جو کلام
میرے پاس آیا اس کا وہ حصہ جو صاف تھا میں نے انھیں بھیج دیا۔ کتابت
ہی کی غزلوں سے شروع کی گئی۔ شاد اشعار منتخب کر کے بھیجتے اور وہ
کاتب کے حوالے کر دیئے جاتے۔

(۵) کاپیوں کی تصحیح کس نے کی؟

چند کاپیوں کی تصحیح شاد نے کی لیکن انھیں تصحیح کا سلیقہ معلوم نہ تھا۔
کاپیاں بالکل خراب ہو جاتی تھیں۔

(۶) شاد نے کلام کی اشاعت پر آمادگی ظاہر کی تو پھر خفا کیوں ہوئے؟
شاد غالباً اس خیال میں تھے کہ ان کا پورا دیوان شائع ہو۔ میں نے دیکھا
کہ شاید ہی کوئی غزل کا کوئی شعر متروک کیا ہو ورنہ وہ ہر غزل اور ہر

شعر منتخب کر لیتے تھے اور میں ایسا نہ چاہتا تھا۔ میں نے کل دس جو د
کا ایک انتخاب شائع کرنے کی بات کی تھی۔ پھر دوسری وجہ بھی ہوئی۔
کاپیاں جو تصحیح کے لیے ان کے پاس جاتی تھیں، بالکل برباد ہو جاتی تھیں
منشی علی حسن کاتب کلام شاد تھے انہوں نے شکایت کی کہ کاپیوں
کو دوبارہ لکھنا پڑتا ہے۔ میں نے دیکھا شکایت بجا تھی، اس لیے
کاپیاں بھیجنا بند کر دیا۔ شاد خفا ہو گئے اور کہا کہ میرا کلام ہرگز نہ شائع کیجئے

(۷) لیکن شاد کے انکار کے باوجود آپنے کلام شاد شائع کیا ـــــ ؟

ہاں، بات یہ ہے کہ میں ان لوگوں میں نہیں ہوں جو قول و قرار کو فراموش
کر جاتے ہیں۔ شاد نے رنجش میں ایسا کہا۔ میں خاموش رہا۔ ان کے
شاگرد شائق ایک روز ملنے آئے۔ انہوں نے کہا، استاد کی باتوں کا
خیال نہ کیجیے۔ آپ اپنا کام جاری رکھئے۔ پھر ایک روز بیتاب (تلمیذ
شاد) ملے۔ انہوں نے بھی یہی بات کہی۔ پھر یہ بھی غور کیجیے کہ کتنا
کچھ کام ہو گیا تھا۔ کیسے چھوڑ دیا جاتا۔

(۸) شاد نے لکھا ہے کہ انھوں نے گزارش کی کلام چھپوانے میں جو خرچ ہوا ہے، وہ لے
لیجیے اور کاپیاں اور فرمے واپس کر دیجیے۔ تو آپنے کیا کہا ـــ ؟

میں نے شاد کو دو سو یا ڈھائی سو کا حساب دیا۔ انہوں نے ہمایوں مرزا
کو خط لکھا کہ اتنے روپے بھیجیے۔ انھوں نے روپے بھیج دیے۔ لیکن وہ
پیسے نہ مجھے ملے نہ ہمایوں مرزا کو واپس کیے گئے۔ مجھ سے شاد نے کہا کہ
استخارہ واجب ہو گیا۔ کلام چھپوا دیجئے اور ہمایوں مرزا کو لکھا کہ روپے
میرے پاس محفوظ ہیں۔

(۹) کلام شاد کی اشاعت میں کتنی لاگت آئی ہوگی ۔۔۔؟

تین ساڑھے تین سو کے قریب۔

(۱۰) تعداد اشاعت کیا تھی ۔۔۔؟

کل پانچ سو ۔

(۱۱) تو اچھا منافع ہوا ہوگا ۔۔۔؟

یہ تو دیکھنے کی چیز ہے۔ کلام شاد دو قسم کا چھپا تھا۔ قسم اول ۲۰۰۔ اس کی قیمت ڈھائی روپے رکھی گئی تھی، اور قسم دوم ۳۰۰، فی نسخہ دو روپے۔ یعنی گیارہ سو کی چیز تھی۔ اس میں سے لاگت کے تین سو نکال دیجیے۔ اب اگر ایک نسخہ بھی کسی کو تحفتہً دیا جاتا تو بیشک منافع تھا۔ مگر تحفتہً دینے کے بعد کل ۱۳۷ نسخے بچے۔ اس وقت سر فخر الدین .. روزیر تعلیم تھے۔ ان کی عنایت سے حکومت نے ایک سو نسخے خریدے جن سے کل ۱۷۰ روپے موصول ہوئے۔ بقیہ ۳۷ نسخے لکھنؤ کی ایک بک ایجنسی کے مالک ظفر الملک[۱] علوی کو دیئے گئے۔ لیکن ان سے رقم وصول نہ ہو سکی۔

(۱۲) لکھنؤ کی اس بک ایجنسی کی کوئی رسید وغیرہ تو ہوگی ۔۔۔؟

نہیں۔ مقدمہ تھوڑے ہی کرنا تھا؟ انہیں کئی خطوط لکھے گئے۔ لیکن جواب نہ آیا۔

(۱۳) شاد کہتے ہیں کہ ان کو ایک نسخہ بھی نہیں دیا گیا اور آپ اپنے ساتھ پچاس نسخے ولایت لے گئے ۔۔۔؟

۱۔ ظفر الملک علوی اڈیٹر "الناظر" لکھنؤ تھے۔ انہوں نے کلام شاد پر "الناظر" کے اگست ۱۹۲۷ء کے شمارہ میں "چند اعتراضات" بھی کیے تھے۔ (بحوالہ "ندیم" گیا، دسمبر ۱۹۴۰ء)

بالکل غلط۔ میرے ولایت جانے کے وقت تک کلام شاد چھپا بھی نہ تھا۔ ساتھ لے جانے کا سوال کہاں ہوتا ہے۔ البتہ قاضی سعید نے پندرہ یا بیس نسخے میرے پاس بھیجے تھے جو دوستوں کو تحفۃً دیے گئے۔

(۱۴) آپ ولایت کب گئے تھے ۔۔۔؟

مارچ ۱۹۲۳ء میں۔ کلام شاد اس کے بعد شائع ہوا۔

(۱۵) شاد کو ایک بھی نسخہ کیوں نہ دیا گیا ۔۔۔؟

میں تو یہاں تھا ہی نہیں۔ مجھے کیا علم ہے۔ کلام شاد کے ذمہ دار قاضی سعید تھے۔

(۱۶) کلام شاد کی اشاعت کے لیے انتخاب کے بعد جو غیر مطبوعہ کلام بچا ۔۔۔ وہ کیا ہوا ۔۔۔؟

وہ سب شاد کو واپس کر دیا گیا تھا۔

(۲)

شاد عظیم آبادی حیدرآباد جانے کے بہت متمنی تھے۔ مقصد یہ تھا کہ وہاں جا کر مجالس پڑھیں اور روشناس خواص و عوام ہوں۔ ان کے شعری کمالات کے اہلِ حیدرآباد معترف ہو جائیں اور عزت و شہرت کی راہیں کھلیں۔

قاضی عبدالودود نے "شاد عظیم آبادی اور حیدرآباد" کے عنوان سے ایک مضمون تحریر کیا تھا۔ وہ ماہنامہ 'تحریک' دہلی کے شمارہ مارچ ۱۹۶۴ء میں شائع ہوا۔ اس مضمون میں انہوں نے "مکتوبات شاد" سے اہم خطوط پیش کیے۔

مضمون کی ابتدا تمہید ذیل سے ہوتی ہے:

عا۔ قاضی عبدالودود کے منجھلے بھائی (مرحوم ۔ وفات ۱۰ر نومبر ۱۹۶۸ء)

"شاد عظیم آبادی (متوفی ۱۹۲۷ء) ۱۸۹۶ء سے ۱۹۲۶ء تک کوشاں رہے کہ حیدرآباد جانے کی صورت نکلے لیکن اس میں کامیابی نہ ہوئی۔ وہ سر علی امام کے بہت شاکی ہیں کہ انہوں نے شاد کی التجا کے بغیر ان سے وعدہ کیا کہ وہ انہیں (یہ اس زمانے کی بات ہے جب وہ صدر اعظم ہو کر حیدرآباد جا رہے تھے) "شاہی طریقے" سے حیدرآباد بلائیں گے۔ لیکن بہرام الدولہ نے بلایا بھی تو انہوں نے ہمایوں مرزا مرحوم کے ذریعے شاد کو وہاں جانے سے روکا۔ شاد کا خیال تھا کہ وہ اس موقع پر وہاں چلے جاتے تو اپنی جگہ بنا لیتے۔ اس سلسلے میں کوئی فیصلہ کن بات اسی وقت کہی جا سکتی ہے۔ جب وہ خطوط جو سر علی امام نے شاد کو لکھے تھے اور جن کی تعداد کہیں ۲۵ اور کہیں ۵۰ سے بھی زیادہ بتائی گئی ہے، چھپوا دیے جائیں۔ ان کے نہ شائع ہونے پر بھی یہ ظاہر ہے کہ سر علی امام کی کوئی ذاتی مصلحت" ان کے وہاں نہ جانے میں نہیں ہو سکتی۔ عماد الملک، ہمایوں مرزا، راس مسعود، علی حیدر طباطبائی، ڈاکٹر محمود کے خطوط بنام شاد اور شاد کے خطوط ان اصحاب کے نام شائع ہوں تو شاد نے حیدرآباد جانے کے لیے جو کوششیں کی تھیں، ان کی صحیح اور مکمل تصویر سامنے آ جائے۔ ذیل میں مکتوبات شاد عظیم آبادی (طبع ۱۹۳۹ء) کے اقتباسات درج کیے جاتے ہیں۔ اس مجموعے کے خطوط باستثنائے بعض ہمایوں مرزا مرحوم کے نام سے ہیں اور یہ شاد کے استاد فریاد کے بیٹے تھے۔" (ص ۵)

قاضی صاحب نے اس مضمون میں حیدرآباد جانے سے متعلق شاد کے تمام خطوط مع جمع کر دیے ہیں۔ ان کے مندرجات کی صحت سے بحث نہیں کی ہے۔ لیکن مدعا یہ ہے کہ ان خطوط کی

روشنی میں ناظرین خود دیکھیں کہ شاد کی شخصیت کیا تھی۔

ان خطوط سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاد نے حیدرآباد جانے کا مصمم ارادہ کر لیا تھا۔ وہ جس عزت شہرت اور مالی منفعت کے خواہاں تھے وہ پٹنہ میں غالباً ممکن نہ تھی یہاں اگر تھے تو دشمنوں کے اعتراضات تھے۔ فن کی بے قدری تھی شاعری کی بے عزتی تھی شاد کے شکوے تھے۔ ایپنچ کا زور تھا شاد اس ماحول سے کیسے مسرور و مطمئن رہتے انہوں نے دیکھا کہ انیس کے مداحوں نے انہیں پٹنہ بلایا اور کافی عزت افزائی کی اسی بنا پر وہ حیدرآباد بھی بلائے گئے۔ داغ، باوجود جہالت اور محدود غزلگوئی کے مقام بلند تک پہنچے مگر شاد کے حال پر کسی نے نگاہ نہ کی۔ پھر جذبہ رشک و رقابت کیوں خوش رہتا!؟

شاد کو اپنے اہل و عیال کی بڑی فکر تھی۔ وہ اپنے پوتوں کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا چاہتے تھے (خط مورخہ ۲۸ دسمبر ۱۹۲۱ء اور ۱۳ اپریل ۱۹۲۲ء) کچھ نہیں تو کم از کم سو دو سو کا "ماہانہ" ہی مقرر ہو جاتا! (خط مورخہ ۳ ستمبر ۱۹۲۲ء) لیکن انہیں ناکامی ہوئی۔ جن حضرات با وقار سے ان کی امیدیں وابستہ تھیں، وہ بھی معاون ثابت نہ ہوئے۔ سر علی امام صدر اعظم حیدرآباد تھے۔ انہوں نے وعدے کیے تھے لیکن وہ بھی وفا نہ کر سکے۔ ہمایوں مرزا شاد کے استاد کے بیٹے تھے۔ ان سے شاد نے نہ جانے کتنی بار گزارش کی ہوگی لیکن انہوں نے بھی کوئی نتیجہ خیز کوشش نہ کی۔ نظام حیدرآباد کلکتہ تشریف لائے تو شاد ملنے گئے مگر ملنے نہیں دیا گیا (خط مورخہ ۷ نومبر ۱۹۱۵ء)۔ ان سب باتوں کا ان پر گہرا اثر ہوا۔ وہ ذہنی اذیتوں کے شکار ہو گئے اور اپنی خواہش کی تکمیل کے لیے نوع بہ نوع ذرائع استعمال کرنے لگے۔

شاد نے اپنی بساط بھر پوری کوشش کی اور طویل مدت تک کوشش کی۔

ہمایوں مرزا کو بار بار خط لکھا۔ ان کی اہلیہ کو "سرتاج خاتونانِ ہند" (خط مورخہ ۲۲؍ جنوری ۱۹۲۳ء) کے خطاب سے نوازا۔ سر علی امام کی خوب تعریف کی (خط مورخہ ۴؍ اگست ۱۹۲۲ء)۔ نظام حیدرآباد سے ملنے کلکتہ گئے (خط مورخہ ۷؍ نومبر ۱۹۰۳ء۔ ملاقات بھی نہ ہو سکی)۔ انگریزوں سے ملے۔ سفارشی خطوط لیے (۸؍ ذی الحجہ ۱۳۲۲ھ کا خط) مدحیہ اشعار کہے مثنوی لکھی (خط مورخہ ۱۹؍ مارچ ۱۹۲۰ء اور ۱۴؍ ستمبر ۱۹۲۲ء)۔ عمدہ مخمل پر قطعات زر دوزی اور جواہرات کے حروف میں کڑھوائے (خط مورخہ ۱۰؍ جنوری ۱۹۱۰ء) حتیٰ کہ اپنے اعزہ درویش ناس کو چندہ کرنے کی ترغیب دی (خط مورخہ ۱۲؍ جنوری ۱۹۰۶ء) پھر بھی ان کی امید بر نہ آئی۔ نتیجتہً وہ اپنے احباب و اقارب کے بھی ثنا کی ہو گئے کہ ان کے لیے کچھ نہیں کرتے۔

یہ امر باعث حیرت ضرور ہے کہ شاد جیسا بلند پایہ شاعر جسے خان بہادر کا خطاب مل چکا ہو، جو پورے ہندوستان میں شہرت رکھتا ہو وہ حیدرآباد جانے کے لیے یوں تڑپے؟ — آخر وجہ کیا تھی — ؟ قاضی عبدالودود نے لکھا ہے کہ:

"عماد الملک، ہمایوں مرزا، راس مسعود، علی حیدر طباطبائی، ڈاکٹر محمود کے خطوط بنام شاد اور شاد کے خطوط ان اصحاب کے نام شائع ہوں تو شاد نے حیدرآباد جانے کے لیے جو کوششیں کی تھیں، ان کی صحیح اور مکمل تصویر سامنے آ جائے۔"

یہ تو ٹھیک ہے لیکن عماد الملک وغیرہ کے خطوط بنام شاد ہوں یا نہ ہوں، شاد کے خطوط کی یکجائی سے شاد کی شخصیت کی وہی تصویر سامنے آتی ہے جو قاضی عبدالودود کے اس مضمون کا مقصد ہے۔

(۴)

شاد عظیم آبادی نے اپنے استاد کی سوانح عمری "حیات فریاد" میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ان کا سلسلۂ تلمذ خواجہ میر درد سے ملتا ہے (ص ۱۵۵ تا ص ۱۶۸۔ مطبع معارف، اعظم گڑھ)۔ اسی کی بنیاد پر عبدالحمید حمید عظیم آبادی نے جولائی اگست ۱۹۲۳ء کے "ندیم" گیا (بہار نمبر) میں شاد کا شجرۂ تلمذ اس طرح دیا ہے۔

خواجہ میر درد

میر حسن دہلوی | سید شاہ وارث علی اشکی عظیم آبادی | مرزا محمد جان طپش دہلوی

سید شاہ الفت حسین فریاد عظیم آبادی

(خان بہادر) سید علی محمد شاد عظیم آبادی (ص ۲۵۹)

شاد لکھتے ہیں:

"ہمارے حضرت (یعنی فریاد) فرماتے تھے کہ ماموں[1] جان (یعنی شاہ وارث علی اشکی اور شاہ جمال حسین جمال) کو دہلی جا کر مشاعروں کی شرکت کا شوق

---

[1] شاد کے دو ماموں تھے حقیقی نواب جلال الدین حسین خاں اور علاتی تفضل حسین خاں مشہور بہ ببو خاں (شاد کی کہانی شاد کی زبانی ص ۱۷ نسخہ انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ)

"حیات فریاد" کے مطابق شاہ جمال حسین شاہ الفت حسین فریاد کے حقیقی ماموں تھے اور شاہ وارث علی اشکی جد مادری فریاد میر کلب علی کے بڑے بھائی شاہ کمال علی کے بیٹے تھے۔ لیکن قاضی عبدالودود اپنے مضمون "درد و شاد" موشوعہ تحریک دہلی اگست ۱۹۶۳ء میں لکھتے ہیں کہ اشکی شاہ کلب علی کے بیٹے تھے اور شاہ جمال حسین بھانجے تھے۔

نواب مرزا جنگلی ہی نے دلوایا اور فرمایا کہ آپ کا خانوادہ تو فقیروں کا ہے۔ بہتر تو یہ ہے کہ آپ لوگ دہلی جاکر حضرت خواجہ میر درد سے تلمذ اختیار کریں کہ وہ بھی مرتاض اہلِ دل فقیر ہیں۔ ان دونوں حضرات کے دہلی جانے اور خواجہ میر درد صاحب سے تلمذ کی کیفیت جہاں تک استاد مرحوم سے سن کر مجھ کو یاد رہ گئی ہے [2] بیان کروں گا۔"

(حیاتِ فریاد ص۱۵۷)

اور تفصیل سے اشکی اور رجال کے سفرِ دہلی، قیام، درد سے ملاقات ان کی شفقت و تواضع اور کلام پر اصلاح کا حال لکھا ہے۔ تمام جزوی تفاصیل سے قطع نظر درد کے "فیضِ اصلاح" سے اشکی اور رجال کے کامیاب ہونے سے متعلق قاضی صاحب کی تحقیقی بحث پیش کی جائے گی۔

شاد کے بیان کے مطابق:

(۱) اشکی اور رجال جب درد کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنی غرض بیان کی تو درد نے فرمایا کہ "فقیر تو شعر و سخن سے نابلد ہے"۔ میر تقی میر اور مرزا رفیع سودا استادانِ ریختہ ہیں۔ ان سے رجوع کیجیے۔ لیکن جب اشکی نے یہ شعر پڑھا ؎

ہر گھڑی آنسو بہاتا ہوں خود آہ سرد ہوں
ناز ہے اس پر کہ اشکی خاک پائے درد ہوں۔

---

[1] مرزا جنگلی کے بارے میں شاد نے "حیات فریاد" میں لکھا ہے کہ ان کا خطاب امیر الممالک تھا اور یہ آصف الدولہ کے سوتیلے بھائیوں میں تھے۔ وہ شاعر بھی تھے اور جہاں مشاعرے کرتے۔ قاضی صاحب کی تحقیق ہے کہ مرزا جنگلی کا خطاب امیر الممالک تھا اور نہ ان کے شاعر ہونے کا ثبوت موجود ہے۔

[2] حیاتِ فریاد کی ترتیب سے "چالیس بیتالیس برس" پہلے شاد نے تلمذ کی تفصیل سنی تھی۔

تو درد نے تعریف کرتے ہوئے مصرعہ ثانی پر یوں اصلاح دی :

"کیوں نہ میں اکثر کراہوں مبتلائے درد ہوں"

پھر جمال نے کہا ؎

محزوں ہوں سر سے پاؤں تلک کیوں نہ زرد ہوں
صد شکر اے جمال کہ میں اہل درد ہوں

تو درد نے مصرعہ ثانی اس طرح بنا دیا :

سجدے کر و جمال کہ ہمدرد درد ہوں

(۲) اشکی اور جمال نے درد سے گذارش کی کہ روزانہ ایک وقت حاضر خدمت ہوں گے۔ درد نے کہا کہ ان مجلسوں میں ضرور شریک ہوئیے جن میں میں اپنے والد کے کلام کے "فوائد" بیان کرتا ہوں۔

(۳) اشکی اور جمال چھ سات ماہ تک دلی میں مقیم رہے اور سینکڑوں غزلوں پر اصلاح لی۔ کئی عرسوں میں بھی شریک ہوئے۔

قاضی عبدالودود اپنے مضمون "درد اور شاد" (مطبوعہ ماہنامہ تحریک دہلی میں سالہ انتخاب نمبر اگست ۱۹۷۳ء۔ ص ۱۲۵ تا ص ۱۳۱) میں شاد کے مذکورہ بالا سلسلۂ تلمذ کے متعلق لکھتے ہیں :

"درد، اشکی و جمال حسین کے متعلق شاد کے بیشتر بیانات شایانِ پذیرائی نہیں۔ ..... سفر دہلی محض خیالی ہے ..... سارا قصہ اس لیے گڑھا گیا ہے کہ فریاد کو ایک شاندار پس منظر ملے اور خود شاد کا سلسلۂ تلمذ درد تک پہنچایا جائے!

عله: سبب اختراع یہ کہ فریاد کو اردو میں زیادہ دخل نہ تھا۔ شاد اپنا سلسلۂ شاعری اردو کے ایک بڑے شاعر تک پہنچانا چاہتے تھے۔ ان کے عہد میں استادی شاگردی کا معاملہ بڑی اہمیت رکھتا تھا" (قاضی عبدالودود۔ مضمون بالا)

درد کے متعلق کل وہ باتیں جو شاد نے لکھی ہیں اور جن کی معتبر ذرائع سے

تصدیق نہیں ہوتی، اختراعی ہیں۔"

انہوں نے اپنے خیال کی تصدیق میں جو ثبوت اور دلائل پیش کئے ہیں، وہ یہ ہیں:
(۱) "شاد کی نوائے وطن (۱۸۸۴ء) کے موضوع کا ولی، آبرو، سودا، میر مصحفی،
جرأت، ناسخ و آتش سے کچھ سروکار نہیں، لیکن نمونہ کلام اس کتاب میں موجود ہے
یہی کیفیت دبیر و انیس کی ہے۔ جن کے ساتھ مزید عنایت یہ کی ہے کہ ان کے
تراجم بھی دیئے ہیں لیکن تقریباً ۲۰۰ صفحوں کی کتاب میں باوجود اس کے کہ شاد
اس امر پر فخر کرتے ہیں کہ میرا سلسلہ درد سے ملتا ہے، ان کا نام و کلام ڈھونڈنے
سے بھی نہ ملے گا ..... نوائے وطن میں معمولی معمولی لوگوں کا ذکر ہے۔ اس کی کیا
وجہ ہے کہ اس "یکتائے روزگار" شخص (یعنی درد) کے حال سے یہ کتاب خالی ہے"
(۲) شاد جنوری ۱۹۲۳ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں کہ شاہ جمال حسین درد سے
ملنے دہلی گئے اور اپنی اردو غزلیں سنائیں۔ خواجہ صاحب نے جو کچھ فرمایا وہ میری
کتاب فکر بلیغ میں ہے (مکتوبات شاد ص ۱۴۶) قاضی صاحب لکھتے ہیں کہ فکر
بلیغ میں اس کا ذکر نہیں (شاد نے غلط بیانی کی ہے)
(۳) مکتوبات شاد ص ۱۳۷ میں شاد لکھتے ہیں کہ ان کے دوست حسرت موہانی
نے ان کے سلسلے کو یوں چھاپا ہے۔ "شاگرد رشید حضرت فریاد خواہرزادہ و
شاگرد ارشد شاہ جمال حسین مولوی عظیم آبادی شاگرد درد" قاضی عبدالودود
کی تحقیق ہے کہ "حسرت موہانی نے اپنی کسی تحریر میں فریاد کو جمال یا اشکی کا شاگرد
نہیں لکھا۔ انہوں نے کہیں یہ بھی نہیں کہا کہ شاد کا سلسلہ شاعری تک پہنچتا ہے"
(۴) مکتوبات شاد ص ۱۷۳ میں ہے کہ "حضرت اشکی خود حضرت جمال کے شاگرد

تھے۔" مگر "حیات" میں اس کا ذکر نہیں کہ اشکی نے جمال حسین سے اصلاح لی تھی۔ بلکہ اس امر سے کہ انھوں نے فریاد سے یہ کہا تھا کہ بڑے بھائی کے ہوتے ہوئے میں کس طرح تمہاری غزل دیکھوں[1]، اس کی ایک طرح تردید ہوتی ہے۔"

(۵) "قاضی عبدالودود کہتے ہیں کہ شاہ جمال حسین کی شاعری کا ذکر کہیں اور نہیں دیکھا۔ اگر وہ شعر کہتے بھی ہوں تو درد کے شاگرد ہو نہیں سکتے۔ اس لیے کہ درد کی وفات کے وقت ان کی عمر صرف دو برس کی تھی۔

(۶) اشکی فریاد کے استاد ضرور تھے لیکن وہ درد کے شاگرد نہ تھے۔ تذکرۂ عشقی کا آغاز تصنیف درد کی وفات کے بعد ہوا ہے۔ اشکی اگر درد کے شاگرد ہوتے تو عشقی انھیں اپنا نومشق شاگرد نہ لکھتے۔

(۷) "قاضی عبدالودود نے درد کے سلسلۂ تلامذہ کی نقاب کشائی کے لیے چند دوسرے ذرائع کی طرف بھی اشارے کیے ہیں:

(الف) شاد کے خیال میں راسخ عظیم آبادی شاہ رکن الدین عشق کے استاد تھے۔ مگر راسخ کا استاد عشق ہونا صرف ایک ایسے شخص کے قلم سے نکل سکتا ہے جو ان دونوں میں سے کسی کے حالات سے واقف نہ ہو۔ راسخ دراصل عشق کے شاگرد (حضرت فدوی کے شاگرد) تھے۔ ان کا یہ شعر اس پر مشعر ہے:

۱؎ شاد نے حیاتِ فریاد صفحہ ۵ میں لکھا ہے کہ فریاد نے پہلے اشکی سے بغرضِ اصلاح رجوع کیا۔ اشکی نے فارسی کلام پر تو اصلاح کر دی لیکن اردو کلام کے بارے میں مشورہ دیا کہ جمال حسین کو دکھاؤ۔ جمال حسین نے کہا کہ بڑے بھائی کے ہوتے ہوئے میں کیسے اصلاح دوں۔ مگر جب فریاد نے کہا کہ انہیں کا حکم ہے تو اصلاح دے دی۔

شاگرد رہیں گے حضرت فدوی کے بیشمار ۔ راسخ ہموں ایک میں بھی ولے کس شمار میں

(ب) شاد نے شاہ جمال حسین (فرہاد کے ماموں) کے مزار کے بارے میں کہا ہے کہ وہ دھولپورہ میں ہے ۔ قاضی صاحب نصیح الدین بلخی کے خط کے حوالے سے کہتے ہیں کہ وہ مزار دراصل سید اقبال علی عرف شاہ جمال حسین بن حیدر علی رضوی کا ہے ۔ اس کا زیر بحث شاہ جمال حسین سے کوئی تعلق نہیں ۔

(ج) شاد لکھتے ہیں کہ شاہ جمال حسین شاہ کلب علی کے بیٹے تھے ۔ قاضی صاحب کہتے ہیں کہ بیٹے نہیں ، بھانجے تھے ۔ اسی طرح ، شاد کہتے ہیں کہ سید عطا حسین وارث علی اشکی کے پوتے تھے ۔ قاضی صاحب کی تحقیق ہے کہ سید عطا حسین کے دادا کا نام وارث علی ضرور تھا مگر پردادا حبیب اللہ تھے ۔ اور اشکی کے دادا کا نام میر شیفع علی تھا ۔ (بحوالہ حیات فرہاد صفحہ ۷۲) اس لیے سید عطا حسین اشکی کے پوتے نہیں ہو سکتے ۔

(د) شاد نے مرزا جنگلی کا خطاب امیر الممالک اور سعادت علی خاں کا خطاب امین الدولہ بتایا ہے ۔ انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ آصف الدولہ کے سوتیلے بھائی تین تھے ۔ قاضی صاحب ان باتوں کا انکار کرتے ہیں ۔ اور تاریخ اودھ جلد ا کے حوالے سے بتاتے ہیں کہ آصف الدولہ کے سوتیلے بھائیوں کی تعداد بہت زیادہ تھی ۔

شاد کی ان تحقیقی لغزشوں کی نشاندہی سے قاضی صاحب کی غرض یہ ہے کہ جس شخص میں تحقیق کا مطلق مادہ نہ ہو اور جس نے سنی سنائی باتوں پر تصنیف کی بنیاد رکھی ہو ، اس کی باتوں کو بغیر قوی دلائل کے کیسے قبول کر لیا جائے ۔

خطوط

[گذشتہ نصف صدی میں قاضی عبدالودود صاحب نے نہ جانے کتنے خطوط لکھے ہوں گے۔ اگر وہ سب محفوظ ہوتے اور انہیں جمع کیا جاتا تو ایک ضخیم کتاب مرتب ہو جاتی۔ ان کے خطوط کا زیادہ حصہ تو ضائع ہو گیا ہوگا۔ پھر بھی ان کے خرمن کے بعض خوشہ چینوں نے ان کے خطوط کو محفوظ رکھا ہے۔ اس لیے کہ ان میں علمی باتیں ہیں، تحقیقی نکات و رموز ہیں۔ اور یہی ان کی اہمیت ہے۔ ان میں نہ تو ادبی چاشنی ہے اور نہ خیالات کی لطیف پھوار۔ ان خطوط سے ان کی شخصیت، ان کے طرز فکر، ان کے اسلوب پر روشنی پڑتی ہے۔ وہ کام کی باتیں کام کی زبان میں کم سے کم لفظوں میں لکھتے ہیں۔ یہاں چند خطوط نقل کیے جاتے ہیں۔ جن لوگوں کو یہ خطوط لکھے گئے ہیں ان کے نام درج ذیل ہیں:-

ارشد کاکوی مرحوم (۱-۶)، سید ظہیر احسن (۷)، محمد حسن (۸-۱۲)، سید محمد حسنین (۱۳-۲۴)، محمد ذکی الحق (۲۵-۲۶)، کلیم الدین احمد (۲۷-۳۰)، دوارکا داس شعلہ (۳۱-۳۸) اور مختار الدین احمد (۳۹-۵۰)۔

[ک۔ا۔]

(۱)

۲۱/ جولائی ۶۵۲

پٹنہ ۴

برادرم۔

میں نے شادانی صاحب کو آپ کے متعلق لکھ دیا ہے۔ لیکن شادانی صاحب شاعر ہیں، اور وہ بھی ہندوستانی، مجھ سے والہانہ شیفتگی اور عقیدت کا اظہار ایک قسم کی شاعری سمجھئے۔

میں آرزومند ہوں کہ آپ اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کریں۔

عبدالودود

---

(۲)

۲۵/۸ ۶۵۲

پٹنہ ۴ -

برادرم

آپ کا خط ملا۔ آپ اگر فارسی میں بھی ایم اے ہوں تو ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی صاحب سہروردی اوپو کالج پارک سرکس کلکتہ کو لکھ دیں۔

کچھ دن ہوئے انھوں نے مجھ سے کہا تھا کہ کچھ جگہیں جو فارسی ایم اے والوں کو مل سکتی ہیں، خالی ہیں۔ یہ صحیح نہیں کہ ڈھاکہ میں تحقیقات نہیں ہو سکتی۔ ایک صاحب نے جو اورنگ آباد دکن گیا ہیں لکچرر ہیں ابھی کام شروع کیا ہے۔ تین موضوع فی الحال میرے پیش نظر ہیں۔ فورٹ

ولیم کالج۔ اس کی شائع کردہ کتابیں کچھ ڈھاکے میں اور باقی کلکتہ میں ملیں گی۔ مرزا جان طپش دہلوی، مقیم بنگال۔ کلیات شادانی صاحب کے پاس ہے۔ انھوں نے دس بارہ برس قبل طپش کی شمس البیان فی مصطلحات الہندوستان میری فرمایش پر مرتب کرنی شروع کی تھی۔ لیکن اب تک یہ کام مکمل نہ ہوا۔

اگر ان کا ارادہ مکمل کرنے کا ہو تو شمس البیان سے قطع نظر کی جائے۔ اس کے بعد بھی بہت کچھ رہ جاتا ہے طپش کا کلیات پٹنہ میں بھی ہے تیرے قائم شاگرد سودا۔ دیوان ڈھاکہ کلکتہ رام پور وغیرہ میں ہیں۔ محمد حسنین صاحب ... اورنگ آباد والے صاحب شیر علی افسوس پر کام کر سکتے ہیں۔ تو کوئی وجہ نہیں کہ اب میرے مجوزہ میں سے کسی پر کام نہ کر سکیں۔ رہی آب دہوا، تو اس سے متعلق میں کچھ کہنے سے قاصر ہوں۔

ع و

---

(۳)

۱۴ راکتوبر ۵۲ء

پٹنہ۔

برادرم۔ آج آپ کا خط ملا اس سے پہلے بھی ایک خط ملا تھا۔ میخانۂ الہام غالباً مل جائے گی اور طلعتِ سنجیدی جائے گی۔ ڈاکٹر عندلیب شادانی صاحب کا خط کل ملا تھا۔ یہ خط آپ کا ... مہربانی انھیں دکھا

دیکھیے گا نظیر صدیقی صاحب کے خط میں مضمون کی رسید نہ تھی صرف ان خطوں کی رسید تھی جو میں نے انھیں بھیجے تھے۔ اس امید سے کہ مضمون واپس نہیں ہوا یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ خاور کے لیے ناموزوں نہیں، لیکن میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ کس شمارے میں شائع ہوگا۔ مجھے ایک مضمون میں اس کا حوالہ دینا ہے۔ میری صحت موسم گرما میں ہمیشہ اچھی رہتی ہے۔ شکایتوں آغاز اکتوبر سے شروع ہوتا ہے۔ مگر ابھی تک اچھا ہوں۔ شادانی صاحب کی طبیعت خراب ہو گئی تھی اب کیسی ہے؟

ع د

(۴)

۸ر اکتوبر ۵۲ء

بھوز پوکھر پٹنہ ۴۔

برادرم۔

آپ کو میں نے لکھا تھا کہ میخانۂ الہام مل جائے گی اور ملتے ہی بھیج دوں گا اور کل میں نے شادانی صاحب کو لکھا ہے کہ کل پرسوں تک بھیجوں گا، لیکن کل محبوب حسین صاحب، مالک اقبال بک ڈپو سے معلوم ہوا کہ انھیں خود کئی نسخوں کی ضرورت ہے۔ (ایک صاحب کی فرمائش ہے کہ دس روپوں تک بھی ملے تو میرے لیے خرید لیجیے) لیکن نہ حمید صاحب کے پاس اور نہ شاد بک ڈپو میں ہے۔ یہ کیفیت ان کے قول کے مطابق دو برس سے ہے۔ آپ یہ بات شادانی صاحب سے کہہ دیں۔ یہاں کوشش جاری رہے گی کہ کوئی نسخہ مل جائے، لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ کامیابی ہوگی یا نہیں۔ میرے پاس بھی کوئی نسخہ نہیں کہ وہی بھیج دوں۔ آپ نے جس اخبار کے بارے میں دریافت کیا تھا، اس کا مجھ کو کچھ علم نہیں۔ نظیر صدیقی صاحب

سے کہدیجیے گا کہ شادانی صاحب کے خطوط اور ہیں مگر انھیں ڈھونڈنا پڑے گا اور آج کل میں عدیم الفرصت ہوں۔ شادانی صاحب کے پاس ایک قلمی کتاب دیوان ہوس ہے اگر اس میں ایک غزل ہو جس کے قوافی موڑ لیے توڑ لیے ہیں اور جس کا ایک مصرع :-

ہو تو آپ براہ مہربانی اس کی نقل فوراً بھیج دیجیے۔ شادانی صاحب کو بھی اس بارے میں لکھ چکا ہوں۔ مگر وہ کاہل ہیں اور مجھے جلدی ہے۔ اس کی ایک نقل اپنے پاس بھی رکھ لیجیے گا کہ مرسلہ نقل مجھے نہ ملے تو میں آپ سے دوبارہ منگوا سکوں۔

ع د

(۵)

۱۰ اگست ۵۲ء

پیٹنہ ۴ برادرم سلمہ

آپ کا خط ملا۔ شادانی صاحب کے ذمہ میرے ایک خط کا جواب باقی ہے جواب آنے سے پہلے میں انھیں خط نہیں لکھوں گا۔ سبزواری صاحب کا مضمون میں نے نہیں دیکھا مگر بعض اصحاب نے مجھے اس کے بارے میں اطلاع دی ہے۔ آپ کی یہ بات سمجھ میں نہیں آئی یقین ہے کہ آپ انھیں نہ بخشیں گے۔ اگر انھوں نے میری کوئی غلطی دکھائی ہے تو میں ان کا شکر گذار ہوں گا اور غلط اعتراض پر بھی تو ان سے مجھے نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ لہجہ اگر ٹھیک نہیں ہے اور میں خود اس بارے میں جب تک مضمون نہ دیکھ لوں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ تو اس سے بھی میرا کچھ گھٹتا نہیں اور انھیں فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ اور میں قطعی طور پر اس کا مخالف ہوں کہ مدیران رسالہ اپنے قلمی معاونین کے بارے میں بااحترام اظہار رائے کریں۔ شادانی صاحب کو

دوبارہ اس کے متعلق لکھ چکا ہوں ۔ ع ۔ و ۔

(۶)

۱۶/۱۰ ۶۵۴

پٹنہ ۔ برادم ۔ آپ کا خط مورخہ ۱۱ / اکتوبر ملا ۔

شادانی صاحب نے غزل کے مطلوبہ اشعار بھیج دیئے ہیں ۔ نظیر صدیقی صاحب کو آپ نے شادانی صاحب کے خطوط سے متعلق میرا پیغام نہ پہنچایا تو پہنچا دیجیے ۔

معاصرہ کا حصہ ۳ زیر طبع ہے اور حصہ ۴ راسخ کے لیے مخصوص ہے گلچھتہ ۵ ہوگا یا نہیں ، اس وقت اس بارے میں کچھ کہنا ممکن نہیں ۔ اس کا فیصلہ اس پر ہے کہ چار شماروں کی اشاعت کے بعد کتنے خریدار بنتے ہیں ۔ اس صورت میں آپ کو مضمون بھیجنے کی کیا زحمت دوں ۔

آپ کی بھابھی آپ کو دعا کہتی ہیں ۔ وہ تو آپ سے کئی بار مل چکی ہیں ۔ بھولنے کی کیا وجہ ہے ۔ میخانۂ الہام شاید ہی ملے ۔ عفت آرا کی شادی تھی ۔ اس میں آپ کے والد صاحب بھی شریک تھے ۔ ان سے بھی کتاب مذکور کے بارے میں گفتگو ہوئی تھی ۔ اگر یہی ہے کہ جاری رکھنے کا فیصلہ ہوا تو اس وقت اس کے لیے کچھ بھیجیے گا ۔ ع و

(۷)

پٹنہ ۴ ۔

۲۶/۹ ۶۶۷ عزیزی ۔

میں دہلی میں دس ہفتہ ٹھہرنے کے بعد پٹنہ واپس آیا ۔ تو آپ کے تین خط ملے ۔ جی اچھا نہیں ہے ۔ طبیعت پر قابو پانے کی کوشش کرنی چاہیے ۔

آپ اگر کچھ کر کے نہ آئے تو، نقصان مایہ اور شماتت ہمسایہ، کا معاملہ آپ کے ساتھ ہوگا۔

شاہ صاحب کو پیغام پہنچا دینے کا شکریہ۔ ان کا خط آیا تو جواب دونگا۔ آپ نے یہ نہیں لکھا کہ آپ کو وہاں کون سی جگہ ملی۔ اگر اب تک نہیں ملی ہے تو اس کا سبب کیا ہے۔

آپ نے ۲ جون کے خط میں لکھا ہے کہ "برٹش میوزیم کے مخطوطات کی ایک فہرست روانہ کی تھی، فہرست میں تذکروں کے ذیل میں جن کتابوں کے نام ہیں۔ ان میں یہ بھی ہیں:-

ریاض الوفاق، نکات الشعراء، تذکرہ شورش، طبقات سخن، تذکرہ عشقی، تذکرہ شعرائے ہند (کریم الدین) ان میں سے ایک تذکرہ کریم الدین کا تو شاید ہی کوئی مخطوطہ کہیں بھی ہو، رہا دوسرا، تو جہاں تک میرا علم ہے ان میں سے ایک بھی برٹش میوزیم میں نہیں۔

یہ کیسی فہرست ہے؟ بہر حال آپ کی فہرست کے تذکروں سے صرف دو اب تک طبع نہیں ہوئے عیار الشعرا و طبقات سخن۔

آپ نے دواوین کی جو فہرست دی ہے ان میں گلشن حیدری اور نثر بے نظیر بھی شامل ہیں۔ گلشن حیدری جہاں تک مجھے یاد ہے ایک مجموعہ ہے جس میں ممکن ہے دیوان بھی شامل ہو۔ رہی نثر بے نظیر تو یہ نام ہی سے ظاہر ہے کہ نثر کی کتاب ہے۔

اس فہرست میں دیوان بیکرنگ بھی ہے۔ اس کا پہلے تو کوئی نسخہ یورپ کے کسی مشہور کتب خانے میں نہ تھا۔ کیا میوزیم نے اسے حال ہی میں

حاصل کیا ہے؟ اگر واقعی وہاں ہے تو اس کا عکس فوراً لیجیے اور اسے شائع کیجیے۔ مجھے یقین نہیں کہ وہاں ہو۔ دیوان آبرو کا بھی کوئی نسخہ میوزیم میں نہ تھا۔

آپ کی فہرست غیر واضح بھی ہے۔ تخلص کے ساتھ ...... شعراء کا نام بھی چاہیے آپ اس سے واقف ہوں گے کہ ایک تخلص سے زیادہ اور بھی شاعر ہو سکتے ہیں۔

میں نے آپ سے کہا تھا کہ برٹش میوزیم کے انڈیا آفس کے کتب خانوں کے اردو مخطوطات (ان میں وہ کتابیں بھی شامل ہیں جن کا تعلق اردو سے ہے لیکن زبان فارسی ہے) کی فہرست بنائیں جو مطلوبہ فہرستوں میں شامل نہیں یہ بطور خود ایک علمی خدمت ہوگی۔ بشرطیکہ فہرست کے ساتھ بنائی جائے۔ میکر نگ سے قطع نظر آپ شعراء کے ذیل کے دیوان مرتب کر سکتے ہیں:۔

آصف، تاباں، ولا، اور شعرا بھی ہیں لیکن وہ آپ کی فہرست میں نہیں۔ آپ بادشاہ صاحب کچھ چیزوں کا عکس بھجوا سکتے ہیں۔؟ مگر قیمت کس طرح ادا ہوگی؟ معاوضہ میں کتابیں یہاں سے جا سکتی ہیں؟

قاطع برہان اور رسائل متعلقہ چھپ گئی ہے لیکن ابھی شائع نہیں ہوئی ہے۔ قاطع برہان کے علاوہ اس میں حسب ذیل رسائل ہیں:۔

سوالات کریم الدین۔ لطائف غیبی۔ نامۂ غالب۔ تیغ تیز۔

رالف رسل صاحب سے ملاقات ہوتی ہے؟ اگر ملنا ہو تو میری طرف سے دریافت کیجیے کہ غالب پر جو کتاب بشرکت ڈاکٹر خورشید الاسلام لکھ رہے تھے کن مراحل سے گذر رہی ہے۔ ترجمہ منتخب نظم و نثر غالب کا حال بھی پوچھیے۔

غالب سینٹنری کمیٹی کی تشکیل جدید ہونے والی ہے۔ ذاکر صاحب اس کے سرپرست اعلیٰ اور مسز اندرا گاندھی صدر اور مسٹر فخرالدین علی احمد اس کے سکریٹری ہونگے

سعید دعا کہتے ہیں اور مسعود سلام

خیر طلب

قاضی عبدالودود

(۸)

پٹنہ ۴-

۸ نومبر ۶۸ء عزیزی آپ کا خط ملا۔ میں اپنے بھائی کی سخت بیماری کی خبر سن کر یکایک دہلی سے چلا آیا۔ انہیں قلب کا مرض ہوگیا ہے۔ حملہ شدید تھا۔ لیکن اب پہلے سے بہتر ہیں۔ کتاب اگر کوئی صاحب دہلی سے نومبر کے تیسرے ہفتے میں آنے والے ہوں تو ان کی معرفت جیسا کہ آپ نے لکھا ہے۔ بھیج دیں۔ اور ممکن ہو تو کلیات سودا مطابق نسخہ لندن کا ایک نسخہ بھی۔ اس کی قیمت میں ادا کردوں گا۔ اگر وہ صاحب بعد کو آنے والے ہیں تو ڈاک سے روانہ ہو۔ امید ہے کہ آپ بخیر ہوں گے۔

خیر طلب

قاضی عبدالودود

(۹)

از لنگڈن کریسنٹ۔ نئی دہلی

۲۱/۱ ۶۹ء عزیزی، مجھ سے ایک شخص نے آکر کہا کہ ایک صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ چار بجے آجائیں گے۔ میں نے کہا کہ اچھی بات ہے۔ چار

بجے اس نے آکر کہا کہ وہ صاحب آ گئے۔ اور وہ سرِ دانی صاحب نکلے۔ ساڑھے چار بجے کے بعد سخت ضرورت (کمیٹی کا کام) سے باہر جانا پڑا۔ منتظر اعتیاط کہہ دیا کہ جلد واپس آجاؤں گا۔ کوئی ملنے آئے تو بٹھایا جائے۔ آپ آئے تو نہ جانے آپ سے کیا کہا گیا۔ مجھے آپ کا خط ملا مجھے بڑا افسوس ہے کہ کل ملاقات نہ ہوسکی۔

یہ کارڈ اگر آج مل جائے تو کل صبح آپ مجھے یہاں فون کریں۔ اور اگر میں یہاں نہ ملوں تو نورالدین احمد صاحب کے یہاں رہیں اب تک ان کے یہاں نہ جا سکا ہوں مصروفیت غیر معمولی رہی۔

یہ بتایئے کہ دیوان وحشت کلکتوی یہاں ہے؟ پٹیالہ میں غالب یا اس کے عہد سے متعلق کوئی اہم شے ہے؟ میں ۲۳ کی شب کو اگر پہنچ گیا تو ۲۴ کو ہوائی جہاز سے جاؤں گا۔

خیر طلب

(۱۰)

پٹنہ ۴۔

۱۱/۲/۶۷ عزیزی، آپ کا خط ملا۔ طبیعت ناساز تھی اور ہے۔ لیکن طبیعت پر جبر کر کے جواب دے رہا ہوں۔ ایوارڈ دینے والے خود انعام نہ لیں گے۔ ان کا ضمیر اگر مطمئن ہو تو شکایت کی مطلق پروا نہیں ہونا چاہئے۔ میرا پہلے ہی خیال تھا کہ ایوان غالب میں جگہ نہیں۔ سہ ماہی رسالہ نکالنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ پہلے شمارے میں اس وقت تک کی کارروائیوں کی نقل ارکان اور معطین کی فہرست بھی رہے گی۔

طبیعت بہتر ہوئے (کذا) تو اس کے متعلق مزید تفاصیل۔

روشن بسملہا کو دعا۔

خیر طلب

قاضی عبدالودود

(۱۱)

پٹنہ ۴

۹؍جولائی ۷۴ء   عزیزی، آپ کا خط ملا۔ بڑی خوشی ہوئی کہ آپ کا سفر علمی نقطۂ نظر سے کامیاب رہا۔ مبارک باد کا شکریہ فخرالدین صاحب کی نامزدگی کے بعد کامیابی یقینی ہے۔ اور جو باتیں اس سلسلے میں آپ نے لکھی ہیں مجھے ان سے اتفاق نہیں۔ ان کے صدر ہو جانے سے ایک سوال یہ پیدا ہو گیا ہے کہ ان کی جگہ غالب انسٹی ٹیوٹ کا سکریٹری کون ہو گا۔ اگست میں ٹرسٹیز بورڈ کے نئے سکریٹری کے انتخاب کی غرض سے جلسہ ہو گا۔ ابھی تاریخ کا مجھے علم نہیں۔ صحت ٹھیک رہی تو میں اس جلسہ میں شریک ہونگا۔ آپ پٹنہ آنا چاہیں تو جولائی میں آسکتے ہیں۔ یہ ہے، ہنگامے، تو کون سی جگہ اِن سے بچی ہوئی ہے؟

آپ کے مضامین متعلق سفر لندن کا شوق سے مطلعہ (مطالعہ؟) کروں گا۔

رحمانی صاحب کا ایک خط (ظاہراً بایمائے مسز فخرالدین علی احمد) اس مضمون کا آیا تھا کہ ڈاکٹر محمد حسن صاحب کا ڈراما آپ کے پاس تو نہیں۔ مجھے دیکھنے کے لیے ضرور دیا گیا تھا اور میں نے واپس کر دیا تھا۔ ورنہ ان کاغذات کے ساتھ ہوتا جو میرے ساتھ دہلی سے آئے ہیں۔ یہ سب ایک سوٹ کیس میں ہیں منتشر نہیں ہوئے۔

خیر طلب

قاضی عبدالودود

۱۲

پٹنہ ۴ -

۸ اکتوبر ۷۴ء عزیزی، کل آپ کا ٹیلی فون آیا۔ میری عمر کے ۷۸ سال گزر چکے ہیں۔ یہ ہفتاد و نہم ہے۔ نقوش کے آپ بیتی نمبر میں جو سال ہے، اس کے مطابق ہے تو صحیح ہے ورنہ غلط ہے۔ اس وقت حساب سے جو عمر درج ہے صحیح معلوم ہوئی بعد کو حساب سے جو عمر صحیح نکلی اور جس کی صحت میں شبہہ کی گنجائش بہت کم ہے، اوپر درج ہے۔

آج کل رمضان کی وجہ سے کتبخانۂ خدا بخش ۹ بجے صبح کو کھلتا ہے اور دو بجے بند ہو جاتا ہے۔ تعطیل ۱۷ اکتوبر سے ۲۸ تک رہے گی۔ آپ جب چاہیں آئیں۔

یہاں کے حالات اخباروں سے معلوم ہوتے ہوں گے۔ کوئی نئی بات قابلِ ذکر نہیں۔

آپ کا ٹیلی فون نمبر کیا ہے ؟

خیر طلب

ق ع و

۱۳

پٹنہ ۴۔ بھونر پوکھر

۲۲ جنوری ۵۱ء شفیقِ مکرم، آپ کا خط (۲۲-۱-۵۱) ملا۔ تین چار دن ہوئے میں نے آپ کو ایک خط لکھا ہے جس میں یہ اطلاع دی ہے کہ یکایک بیمار ہو جانے کی وجہ سے کلکتہ نہ جا سکا۔ ارادہ ابھی تک ہے مگر بعد صحت۔ مجھے بھی آپ کی طرح کھانسی نے ستا رکھا ہے۔ کب جا رہا ہوں اس کے بارے میں آئندہ لکھوں گا۔

وہ مجلس اردو امپیریل لائبریری میں نہیں، اور فارسی ہے تو آپ کے لیے

بے مصرف۔ مثنویاں جس جلد میں ہیں، اسی میں فتح علی گردیزی کا تذکرۂ شعرائے ریختہ بھی ہے، اس میں اس تذکرہ کا سراغ لگانے سے یہ پتہ مل جائے گا کہ مثنویاں کس جلد میں ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے پٹنہ میں فہرست مخطوطات ایشیاٹک سوسائٹی کا کوئی نسخہ نہیں۔ اس لیے کلکتہ گئے بغیر کام نہیں چل سکتا۔ کلکتہ میں برٹش میوزیم اور انڈیا آفس کی مطبوعات کی فہرست بھی ہوگی۔ فہرست میں پتا چلے گا کہ لندن میں دہ مجلس کا کوئی نسخہ ہے یا نہیں۔ کریم الدین کا تذکرہ کہیں ہو تو یہ معلوم کیجیے کہ دہ مجلس کے سال طبع وغیرہ کے بارے میں اس میں کیا لکھا ہے۔ یہ تذکرہ رام پور میں ہے عرشی صاحب سپرنٹنڈنٹ رضا لائبریری رام پور یو پی سے دریافت کیجیے۔ امید ہے آپ جلد کامل طور پر صحت یاب ہو جائیں گے۔ کلکتہ کا ارادہ ہے یا نہیں؟

مخلص

عبدالودود

(۱۴)

۷ فروری ۵۱ء

پٹنہ ۴ ۔ شفیق مکرم۔ آپ کا خط ملا۔ کلکتہ میں برٹش میوزیم اور انڈیا آفس کے مطبوعات کی فہرست ملے گی۔ اس میں پتا چلے گا کہ لندن میں فضلی کی کتاب ہے یا نہیں۔ (۲) کلکتہ جانے کا ابھی تک ارادہ ہے لیکن وقت معین نہیں ہوا۔ فیصلہ کرتے ہی آپ کو اطلاع دوں گا۔ آپ نہیں گئے جب بھی میں آپ کو یہ بتاؤں گا کہ مثنویاں کس طرح تلاش کی جائیں۔ (۳) جن صاحب نے ہمایوں میں مضمون لکھا تھا انھوں نے شاید عمر بھر میں کسی تذکرے کی صورت بھی نہ دیکھی ہوگی، اور یہ فرائض میں داخل بھی نہیں لیکن اس کے بغیر تذکرہ پر لکھنا بھی حماقت ہے۔

انہیں یہ تو سوچنا تھا کہ شمالی ہند میں اردو شاعری کی ترویج عہد محمد شاہ میں ہوئی۔ ۱۱۱۵ھ میں شعرائے اردو کا تذکرہ کہاں سے لکھا گیا۔ اصل یہ ہے کہ تنہا ہی نے تذکرۂ عشق کا سال تصنیف ۱۲۱۵ھ بتایا ہے محفوظ الحق مرحوم نے نہ معلوم کس طرح معارف میں اسے ۱۱۱۵ھ لکھ دیا، اس کے بعد سے کئی نقل نویس اصحاب یہی لکھ رہے ہیں شعر الہند میں بھی یہی ہے۔ میرے پاس اس کا نسخہ ہے۔ اس کی تکمیل ۱۲۳۰ میں یا اس کے بھی بعد ہوئی ہے۔ ایک نسخہ آکسفورڈ میں ہے۔ تذکرہ شورش کا صرف ایک نسخہ موجود ہے اور وہ آکسفورڈ میں ہے۔ زمانہ اختتام عشرہ دہم ماہ دوازدہم۔ گلزار ابراہیم کا زمانہ اختتام تیرہویں صدی کا عشرہ اول۔ آپ اپنا مقالہ ہوس پر بھی لکھ سکتے ہیں۔ اور اس پر آپ کو ڈگری مل سکتی ہے۔

ع۔ و

(۱۵)

۱۵-۱۲-۵۱ء

پٹنہ - ۴ شفیق مکرم۔ آپ کا خط ملا۔ تذکرۂ قاسم اس سے پہلے مل گیا تھا۔ خوشی ہوئی کہ دیوان ندوی کا مطلوبہ نسخہ آپ کے پاس آگیا۔ مگر آپ نے یہ نہیں لکھا کہ کلکتہ والے نسخے کے بارے میں آپ نے تحقیق کیا یا نہیں۔ اگر سکریٹری کو لکھتے تو وہ یقیناً جواب دیتا۔

حضرت عشق کے حالات شاہ حسام الدین صاحب کے بزرگوں میں کسی نے ایک کتاب میں لکھے ہیں۔ اور وہ کتاب چھپ بھی چکی ہے مگر اس میں بہت سی لغو باتیں ہیں اور ایک ہی بات مختلف طور پر بھی لکھی ہوئی ہے۔ اور کوئی قابل ذکر تحریر نہیں۔

مخلص۔ عبدالودود

(۱۶)

۲۹-۱-۶۵۲

پٹنہ ۴ شفیق مکرم

آپ کا بیرنگ خط ملا، عرشی صاحب کے سوال کا جواب میں نہیں دے سکتا۔ حسن عسکری صاحب شطاریوں کے حالات کی تحقیق کر رہے تھے عرشی صاحب اگر انہیں لکھیں تو ممکن ہے کہ وہ ان کے سوال کا جواب دے سکیں۔ کھانسی کا کچھ نہ کچھ سلسلہ اب تک باقی ہے۔ اسی لئے اب تک پرانے کاغذات میں فدوی کے تراجم تلاش نہ کر سکا۔ مسعود حسن رضوی کا پتا یہ ہے:۔ ادبستان، دین دیال روڈ لکھنؤ۔ ان کے پاس گلشن سخن مبتلاؔ کا ایک نسخہ ہے جس میں عشقؔ اور فدوی کے تراجم اور اشعار ہوں، تو عجب نہیں۔

(۱۷)

۱۱-۷-۶۵۲

پٹنہ۔ ۴۔ شفیق مکرم

آپ کا خط ملا، ونا سی بھی ہندوستان نہیں آیا تھا، مگر اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟ اس کی کتابیں بے انتہا غلط ہیں اور اس کی زبان دانی بہت ادنی درجے کی ہے۔ معیار میں اس کے خطبات پر جو تبصرہ چھپا تھا اسے دیکھئے۔

میں آپ کے مطلوب معلومات جلد فراہم کر لوں گا۔ آپ کب پٹنہ آنے والے ہیں؟ جلد آنیوالے ہیں تو وہاں نہ بھیجوں اور مجموعۂ نغز ساتھ لیتے آئیں گے اس کی ضرورت ہے۔ بعد کو میں پھر آپ کو دے سکتا ہوں۔

مخلص۔ عبدالودود

(۱۸)

۸-۱۲-۵۲ء

پٹنہ ۴ - شفیق مکرم -

آپ کا خط ملا۔ بڑا افسوس ہوا کہ دیوان فدوی کا نسخہ جو فدوی نے عشق کی نذر کیا تھا، غائب ہوگیا۔ مل جاتا تو بڑے کام کی چیز تھی۔ کلکتہ والا نسخہ بھی ضائع ہوگیا ہے۔ تو فدوی کے متعلق کچھ زیادہ لکھنا ممکن نہ ہوگا۔

آپ اب کے آئیں تو میں فدوی کے تراجم جو میرے پاس ہیں، آپ کو دوں گا اور یہ بھی بتاؤں گا کہ یورپ سے کیا کیا منگوانا ہے۔

قاطع برہان ضرور ساتھ لائیے گا۔

مخلص

عبدالودود

(۱۹)

۲۵ ۳/۵۲ء، پٹنہ ۴ -

آپ کا خط ملا۔ طبیعت ٹھیک نہیں، اس لیے جواب میں دیر ہوئی۔ یہی وجہ اب تک کلکتہ نہ جانے کی بھی ہوئی۔ ارادہ ابھی تک فسخ نہیں ہوا، لیکن جب طبیعت درست نہ ہو جائے، نہ جاؤں گا۔

یہ معلوم کر کے مسرت ہوئی کہ کلکتہ میں وہی نسخہ ہے جس کا ذکر اشپرنگر نے کیا ہے۔ اگر آپ کو گیلانی کا دوسرا نسخہ اور مٹیا برج گھاٹ والا نسخہ مل جائے تو جہاں تک ان کے نسخوں کی فراہمی کا تعلق ہے، آپ کا کام مکمل ہو جائے گا۔ میں کچھ دنوں کے بعد یہ بتاؤں گا کہ آپ کو یورپ سے کن کن چیزوں کا عکس منگوانا چاہیے۔ ڈاکٹر محسن سے اس سلسلے میں گفتگو ہوئی تھی۔ وہ صاحب جو لندن میں ہیں ابھی برس ڈیڑھ برس وہاں رہیں گے۔ وہ چیزیں جو میرے پاس ہیں ان

کی نقل بھی آپ کو دے دوں گا اور نگ آباد والے خطوط حاصل کرنے کی کوشش جاری ہے

مخلص ع و

(۴۰)

۲۹ نومبر ۵۲ء

پٹنہ ۴ ۔ شفیق مکرم ۔ مرسلہ کاغذات سے آپ کی نئی تحریر پرانی سے بہتر ہے، قبل والی وقت ملاقات۔ آپ ابھی اپنا مقالہ لکھنا شروع نہ کریں، ابھی مواد حسب دلخواہ جمع نہیں ہوا۔ اس وقت جو کام آپ کو کرنا ہے وہ دیوان کی ترتیب ہے اور اس میں کافی وقت صرف ہوگا۔ اس کے بعد دونوں دیوان سے الفاظ و محاورات وغیرہ کا نکالنا یہ بھی وقت لے گا۔ اس کے بعد بہلد کر لیجئے اور سب سے آخر میں حالات و تنقید۔ یہ مصالح پر منحصر ہے۔

تذکرۂ شورش والا عکس اور امراللہ کی نقلیں رجسٹرار یونی ورسٹی منگوانے کو تیار ہیں۔ آپ ابھی کوئی خط اس سلسلے میں نہ بھیجیں۔ مکتوبات ان تذکروں پر ختم نہیں ہوتی، اور تذکروں سے بھی حالات وغیرہ منگوانے ہیں، اگر مغنی صاحب راضی ہوں (ان سے دریافت کیجئے) یا کوئی دوسری صورت ہو تو میں فہرست بھیج دوں۔ آرزو صاحب نے اس سلسلے میں اب تک کچھ نہیں کیا۔ واضح رہے کہ اور تذکروں سے بہت زیادہ چیزیں منگوانی نہیں۔

آج اور کل تو یونیورسٹی بند ہے، حسن عسکری صاحب بھی کالج نہ آئیں گے۔ پرسوں کسوڈ والا خط انہیں بھیج دوں گا اور تاکید کر دونگا کہ نقل جلد منگوانے کا بندوبست کریں۔ ظہیر احسن صاحب کا ایک خط آیا تھا۔ جواب دیا گیا پھر وہ خاموش ہیں۔ اگر مراسلت ہو اطلاع آپ دیجئے۔ دیوان کلکتہ کی نقل کا اصل سے مقابلہ ضروری ہے۔

مخلص۔ عبدالودود

(۲۱)

۶ فروری ۵۴ء

پٹنہ ۴۔ شفیق مکرم۔

آپ کا خط ملا۔ فدوی کے بہت سے تلامذہ کا ذکر تذکرۂ عشقی میں ہے۔ اور اس کے منتشر اجزا میں نے اب یکجا کر لئے ہیں۔ آپ آئیں تو جس چیز کی ضرورت ہو نقل کر لیں۔ مکاتیب شبلی کی اشاعت ۲ میں آزاد کے نام کے بہت سے خطوط ہیں، اسے ضرور دیکھئے۔ شائع شدہ خطوط کو بشرطیکہ اصل ان سے مختلف نہ ہوں چھپوانے سے فائدہ نہیں نئے خطوط البتہ بلا تکلف چھپوائیے۔ پرانے خطوط کے لیے وہ شرط ہے جو میں نے ابھی لکھی ہے۔ آپ آئیں تو اپنا دیوان راسخ لیتے آئیں۔ کلیم صاحب کے یہاں ایک جلسہ معاصر کے سلسلے میں تھا اس میں آپ کا نام اور پتا منتظم صاحب کو بھجوا دیا گیا تھا۔ الہ آباد میں نول کے ذریعہ کاپی کا انتظام فی جز ۶ع کتابت، سید مسعود حسن رضوی کے داماد کے ذریعہ گفتگو ہو رہی ہے شورش اور ابوالحسن امر اللہ الہ آبادی کے تذکرہ کے متعلق اب میں آپ کو مکمل اطلاع دے سکتا ہوں بعض باتیں شبہہ پیدا کرتی ہیں کہ جو تذکرہ شورش کی طرف منسوب ہے وہ ان کا ہے بھی یا نہیں۔

مخلص۔

عبدالودود

(۲۲)

(۱) آپ نے سید حسن عسکری صاحب کا جو پرزہ بھیجا ہے، ملا۔ ان کی مطلوبہ کتاب جاتی ہے، یہ قریب ہی رکھی تھی۔ تلاش کرنے کی ضرورت نہیں پڑی۔

(۲) شورش کا تذکرہ پورا نقل ہو چکا ہے اور غالباً میں نے اس کا انڈکس بھی بنا

دیا ہے۔ اس لیے پورا تذکرہ پڑھے بغیر یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ کہاں کہاں کس شاعر کا ذکر ہے۔ یہ اور دیوانِ راسخ اب آپ کے بنارس سے واپس آنے کے بعد تلاش کرنے میں دیر ہوگی کتابیں گرد آلود ہیں اور صحت کی موجودہ حالت میں ان کی طرف توجہ نامناسب ہے۔

(۳) آپ نے یہ نہیں لکھا کہ فدوی کی مثنوی کی ضخامت کیا ہے اور یہ کس طرح معلوم ہوا کہ آپ ہی کے فدوی کی ہے؟

(۴) آپ جسے شورش کی مثنوی کہہ رہے ہیں، کس شورش کی ہے اور کس ضخامت کی ہے؟

(۵) آپ ۲۶ کو کس ٹرین سے بنارس جائیں گے۔

عبدالودود

(۲۳)

۶۵۸/۳/۲

آپ کی بھیجی ہوئی دونوں جلدیں ملیں، شکریہ

آپ نے میری طرف دو باتیں غلط منسوب کی ہیں، میرا خیال نہ ہے نہ تھا اور نہ کبھی میں نے آپ سے کہا کہ ضیا ۱۲۰۵ھ سے قبل فوت کر گئے۔ اس بات کی کہ راسخ ۱۱۶۲ھ میں مرے (قوش شاہ) میں بار بار تردید کر چکا ہوں، لکھا بھی ہے اور زبانی بات بھی آپ سے ہوئی ہے کہ ۱۱۷۰ھ کے لگ بھگ رحلت ہوئی۔ آپ نے یہ لکھ دیا ہے کہ میری تحقیقات کے بموجب ۱۱۶۲ھ ہے۔

آپ نے اپنی طرف سے سودا کا سال وفات ۱۱۹۸ھ بتایا ہے یہ کتابت کی غلطی نہیں۔ اس لیے کہ وہیں پر آپ نے یہ لکھا ہے کہ سال بھر بعد درد مرے تعجب ہے کلیم صاحب نے اسے کس طرح روا رکھا۔

آپ نے یہ بات کہ رفعت الہ آبادی مقیم پٹنہ ہر ہفتے مشاعرے کیا کرتے تھے، کہاں

سے لی ہے حوالہ تذکرہ شورش کا ہے۔ اس کی نقل جو میرے پاس ہے اس میں نہیں۔ موقع ہو تو عبارت متعلقہ کی نقل روانہ کریں۔

عبدالودود

(۲۲)

۶۵ ۴/۸

پٹنہ ۴۔ (۱) راسخ کے سال وفات پر نہیں، سال ولادت پر اعتراض ہے۔ (۲) ضیا کا سال وفات معلوم نہیں تذکرۂ لطف کی تصنیف سے قبل وفات پا چکے تھے۔ میں نے کبھی ۱۲۱۵ سال وفات نہ بتایا ہوگا۔

(۳) علی ہذا سودا کا سال ولادت نامعلوم ہے جو کچھ بتایا گیا قیاس آرائی ہے، میں نے ۱۲۱۲-۱۲۱۳ھ سودا کا سال وفات ہرگز نہیں بتایا اور یہ آپ نے اپنی کتاب میں لکھا ہے۔ آپ کی کتاب میں ۱۱۹۸ھ ہے۔ صحیح ۱۱۹۵ھ ہے اور یہ ہر شخص کو معلوم ہے آپ نے عجیب بات خط میں تحریر کی ہے۔ سودا ۱۲۱۲ یا ۱۲۱۳ میں یقیناً زندہ تھے۔

(۴) رفعت کے مکان کی تعریف زیر بحث نہیں۔ سوال یہ ہے کہ اس کے مکان میں مشاعرہ ہوتا کس نے لکھا ہے۔ یہ میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ رفعت کا جو ترجمہ تذکرۂ مسرت افزا یا تذکرۂ شورش میں ہے۔ اس میں مشاعرے کا مطلقاً ذکر نہیں۔ اور جہاں تک مجھے یاد ہے کسی اور شاعر کے ترجمے میں اس مشاعرہ کی طرف اشارہ ہے۔ سوال کسی کی شاعری کا نہیں۔ اس مشاعرے کا ہے جو رفعت کے یہاں سمجھ کو ہوا کرتا تھا۔ آپ براہ مہربانی وہ اصل عبارت مجھے بھیجئے جس پر آپ کا بیان مبنی ہے۔ آپ پر اعتراض مقصود نہیں ہے، میں اپنی واقفیت کے لیے دریافت کرتا ہوں۔ واضح رہے کہ میں وہ عبارت چاہتا ہوں جس میں صراحۃً مشاعرۂ رفعت کا ذکر ہے۔ ایسی عبارت جس میں

صرف تجمیر کے مشاعرے کا حال ہو مطلوب نہیں۔

عبدالودود

(۲۵)

۱۸/۵/۷۰ء

آپ کو دو خط یکے بعد دیگرے ایک ہی مضمون کے لکھے گئے۔ مگر یا تو آپ کو ملے ہی نہیں، یا میں نے جواب دینا غیر ضروری تصور کیا۔ اب خط اسی مضمون کا رجسٹرڈ جاتا ہے کہ نہ پہنچنے کا احتمال نہ رہے۔ آپ کے پاس ماہنامہ چاردڈھاکہ، امداد صابری کی کتاب متعلق اخبار نویسی ہیں، جو آپ نے مجھ سے مستعار لی تھیں۔ ممکن ہے کہ ان کے علاوہ بھی بعض کتابیں یا رسالے ہوں، آپ براہ مہربانی یہ سب جلد از جلد واپس کر دیں اور مصحفی اپنا تذکرہ جو میرے یہاں ہے، منگوا لیں۔ اگر اس کے علاوہ بھی کوئی اور کتاب آپ کی میرے پاس ہے تو اس کا نام لکھیں۔ آپ کے پاس جو روپے جمع ہیں، ان میں سے میری طرف سے جو روپے آپ نے صرف کیے ہوں انھیں جوڑ کر کے باقی جلد از جلد بھیج دیں۔

قاضی عبدالودود

(۲۶)

۱۷ دسمبر ۶۸ء

پٹنہ ۴۔ آپ کو ایک زحمت دیتا ہوں، ممکن ہے آپ کے سالے صاحب سے کام نہ نکل سکے۔ ایک شخص مکھن سنگھ ظالم سنگھ کا بیٹا ساکن کسارہ، چند ماہ قبل مرا ہے۔ اس کی تاریخ وفات مطلوب ہے۔ ایک سند کیلئے ضروری ہے۔ اگر دریافت کرنے والا کسارہ جائے اور کچھ خرچ ہو تو مضائقہ نہیں، میں ادا کر دوں گا۔ امید ہے کہ آپ باخیر ہوں گے۔ جواب جلد

قاضی عبدالودود

(۲۷)

نمبر ۱۔ ولنگڈن کریسنٹ۔ نئی دہلی۔ بوساطت مسٹر فخرالدین علی احمد

وزیر زراعت وغیرہ

۲۳/۲/ ۷۷ء

شفیق مکرم۔ آپ کا خط پانے کے بعد یہ تیسرا خط ہے جو آپ کو لکھ رہا ہوں۔ کوئی نہ کوئی تو مل ہی جائے گا۔ یہ خط آپ کے مکمل پتے سے بھیجا جا رہا ہے۔ گم شدہ خط مل گیا۔ آپ کا نام غالب انسٹی ٹیوٹ اوارڈ کے لیے پیش کر کے میں نے آپ پر عنایت نہیں کی۔ اپنا ایک نہایت خوشگوار فرض ادا کیا ہے۔ ساہتیہ اکیڈمی پر اگر چند ...... مسلط نہ ہوتے تو اس کا اوارڈ آپ کو پندرہ بیس سال قبل ملا ہوتا۔

غالب انسٹی ٹیوٹ کی دوامی رکنیت کا چندا ۱۰۰ روپے ہے۔ اور کوئی شخص اس کے بغیر ٹرسٹی نہیں بن سکتا۔ اور شاید اوارڈ کمیٹی کی رکنیت کے لیے بھی غالب انسٹی ٹیوٹ کا ممبر ہونا ضروری ہے۔ میری خواہش ہے کہ آپ انسٹی ٹیوٹ کے رکن بن جائیں اور اوارڈ کمیٹی کی رکنیت منظور کر لیں۔

میری واپسی ۱۹ سے قبل تو ہو ہی نہیں سکتی۔ اس کا امکان بھی ہے کہ تقسیم انعامات کے بعد آنا ہو۔

۱۹ کو مجلس عاملہ کا جلسہ ہے۔ غالباً تقسیم انعامات کا جلسہ اوائل اپریل میں ہوگا۔ انعام پانے والوں کو یہاں آنے کے لیے سب ملا کر جو ملے گا وہ ۲ فرسٹ کلاس ٹکٹ کی قیمت ہے۔

امید ہے کہ آپ شریک ہو سکیں گے۔

مخلص

قاضی عبدالودود

(۲۸)

شفیق مکرم۔ میرے حالات عباسی صاحب کے خط سے معلوم ہوئے ہوں گے
۱۰ تاریخ تقسیم انعامات کی مقرر ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ مختلف انعامات کے متعلق صحیح
معلومات آپ فراہم کر کے مجھے بھجوا دیں، تاکہ میں ان سے کام لے سکوں۔ میری صحت
ایسی نہیں کہ خود یہ کام متعلق معلومات حاصل کر سکوں۔

نوبل پرائز

گونکور اکادمی کی طرف سے بھی انعام ملتا ہے؟
انگلستان اور امریکہ کے انعامات۔ مجمل اطلاعات کافی ہوں گے۔ طبیعت
اچھی نہ رہی تو میں ان سے کام بھی نہ لے سکوں گا۔
مسٹر کلیم الدین احمد کو سلام۔ امید ہے کہ آپ کا مزاج بخیر ہو گا۔

مخلص

ق۔ ع۔ ح

(۲۹)

۱۱ ولنگڈن کرسنٹ۔ نئی دہلی

بوساطت مسٹر فخر الدین علی احمد ۔ ۴ ۔ ۷ ۔ ۵۱ء

شفیق مکرم۔ آج ایک خط لکھ چکا تھا۔ ایک ضروری بات جو نہ جانے کس
طرح قلم انداز ہو گئی یہ ہے:۔

غالب انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے ایک رسالہ نکل رہا ہے جس میں غالب، عہد غالب
اور غالب سے تعلق رکھنے والوں سے متعلق مضامین شائع ہوں گے۔ شمارۂ اول کے لیے
اگر آپ ایک مضمون (غالب کی نثر یا نظم کے کسی پہلو پر) لکھیں تو بڑی مہربانی ہو گی۔ مگر

کوئی نئی بات ہونی چاہیے۔ جو پہلے آپ نے نہیں لکھی۔

مخلص

قاضی عبدالودود

(۳۰)

۲۶/۴/۷۴ نئی دہلی

شفیق مکرم۔ فخرالدین علی احمد صاحب سے آپ کے ۱۲ ارکو نہ آسکنے کی وجہ بتا دی۔ انہیں افسوس ہے کہ ملاقات نہ ہو سکی۔ میری خواہش تھی کہ تقسیم انعامات کے بعد سب جمع ہوتے اور گفتگو ہوتی مگر خرابی صحت نے اس کا موقع نہیں دیا۔ انعام پانے والے شاعر کون ہوں گے؟ ابھی سے اس پر غور کریں۔

اس سے سب کو بڑی خوشی ہوئی کہ آپ ادارے کے ممبر بھی بن گئے۔ اور آپ نے کتابیں بھی اپنی ادارے کو دیں۔

واجد علی شاہ کے خطوط کا ایک مجموعہ دیکھا۔ دنیا کے مجرم لوگوں کی ایک فہرست بنائی جائے تو ان کا نام ضرور شامل ہوگا۔

ابھی تک یہ فیصلہ نہیں ہوا کہ کب پٹنہ واپس آؤں گا۔ مسز کلیم الدین احمد کو سلام .... کا شکریہ۔

مخلص

قاضی عبدالودود

(۳۱)

شفیق مکرم۔

آپ کا خط اور میخانۂ درد کا پیکٹ ملا۔ شکریہ۔

یہ لکھ کر کہ آپ آتے تو مجھ پر رحم ہوگا، آپ نہ صرف مجھ پر بلکہ اپنے آپ پر بھی ظلم کرتے ہیں۔ مالک رام صاحب جب باوجود وعدہ چار سالہ قیام دہلی میں پٹنہ آنے کے لئے وقت نکال نہ سکے تو واپسی کے بعد اس کی کیا توقع ہے۔ آپ آئیے اور ضرور آئیے۔

حاشیہ میخانۂ الہام ص ۲۶ ... مالک رام صاحب کی یہ عبارت نظر آئی:۔
"حضرت میر ناصر کی اولاد میں سے .... نصرت جہاں بیگم .... آخر حضرت مرزا غلام احمد مسیح موعود و مہدی معہود کے عقد نکاح میں آئیں اور یوں یہ پیشگوئی پوری ہوئی۔ پیشگوئی پدر درد کی تھی" جس کا ذکر کتاب کے صفحہ ۲۶ میں ہے۔ مجھے پہلے تو خیال ہوا کہ محض طنز ہے لیکن ایک علیحدہ کاغذ کتاب کے ساتھ نکلا جس میں خواجہ ناصر عندلیب پدر درد کے اخلاف کے نام مرقوم ہیں۔ اس میں ایک جگہ لکھا ہے:۔
نصرت جہاں بیگم = حضرت مسیح موعود علیہ السلام۔ کیا واقعی ان کا عقیدہ ہے کہ غلام احمد قادیانی مسیح موعود تھے؟ آپ نامناسب نہ سمجھیں تو ان سے دریافت بھی کر سکتے ہیں۔

یگانہ سے مسعود حسن رضوی صاحب (لکھنوی) کے بھی تعلقات تھے۔ چنانچہ "غالب شکن" ایک خط ہے جس کے مکتوب الیہ وہی ہیں۔ اپنے آخری زمانے میں کچھ دن انہوں نے مسعود صاحب کے مکان میں قیام بھی کیا ہے۔ آپ چاہیں تو یگانہ کے حالات ان سے معلوم کر سکتے ہیں۔

یہاں برسات اب شروع ہوئی ہے۔ "یہاں" سے مراد خاص پٹنہ ہے۔ صوبۂ بہار کے اور مقام نہیں۔

امید ہے کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔

مخلص۔ عبدالودود

(۳۲)

پٹنہ ۴ ۱۵ [illegible] ۶۰ء

شفیقِ مکرم،

آپ کے دو خط ملے۔ حالات معلوم ہوئے۔ امید ہے کہ صاحبزادی کو عمل جراحی کے بغیر ہی شفا ہو جائے۔ "پرسنل" کے یہ معنی نہیں کہ آپ خط کو نہ چھپوائیں، غرض یہ ہے کہ آپ کے کاروبار سے خط کا کچھ واسطہ نہیں۔

"استخرا" کوئی لفظ ہے تو یہ بتائیے کہ آپ نے اسے کہاں دیکھا۔ میں نے جواب دینے سے قبل از راہ احتیاط عربی لغات کی طرف رجوع کر لیا تھا۔ یہ میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ اس کا یا استرخا کو اصطخر یا استخر سے کچھ سروکار نہیں۔

آپ نے جو اپنے حالات لکھے تھے، انھیں دیکھتے ہوئے شراب قطعاً آپ کے لیے مضر ہے، فکر یہ بات اطبا پہلے ہی آپ سے کہہ چکے ہوں گے اور جب ان کے مشورہ پر آپ عامل نہیں، تو میری بات کا آپ کے سامنے کیا وزن ہوگا۔

مجھے سرور صاحب نے تاریخ ادبیات اردو کے سلسلے میں علی گڑھ بلایا تھا، آخری خط ان کا ۱۵ دن قبل آیا تھا، اس میں انھوں نے لکھا تھا کہ آپ ہی کوئی تاریخ علی گڑھ پہنچنے کی مقرر کیجیے۔ میں نے جواب دیا کہ میں ۵ ستمبر کے بعد چند دنوں کے لیے آ سکتا ہوں۔ تاریخ کا تقرر آپ خود کریں۔ اس کے بعد سے وہ خاموش ہیں۔ لطف یہ کہ ان کی فرمائش پر میں نے ان کے رسالے اردو ادب کے لیے ایک مضمون بھیجا تھا، اس کی رسید بھی اب تک نہیں آئی۔ ستمبر میں دہلی آنے کا مدار علی گڑھ آنے پر ہے۔

مالک رام صاحب کا خط دو تین دن ہوئے آیا تھا ان کی انگلیوں میں کچھ تکلیف ہے۔ اسی وجہ سے انھوں نے میرے خط کا جواب دیر سے دیا۔ آپ کے پاس بھی ان

کا خط آیا ہوگا۔ اب انگلیاں پہلے سے بہتر ہیں۔ اور خط خود ان کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ انہوں نے مجھ سے کلیات غالب فارسی کے دو خطی نسخوں کے مائکرو فلم بھجوانے کی فرمائش کی ہے۔

میں علمی خطوط طویل لکھتا ہوں، مگر میرے شوقیہ خطوط مختصر ہوتے ہیں سب کے ساتھ یہی حال ہے۔

فرمائش کی تعمیل پر اظہار آمادگی کا شکریہ۔ لیکن فی الحال کسی چیز کی ضرورت نہیں امید ہے کہ ایک خط میں آپ صاحبزادی کی شفایابی یا کم از کم یہ کہ حالات پہلے سے بہت بہتر ہیں، ضرور لکھیں گے۔

مخلص

عبدالودود

(۳۳)

۱۱ اگست ۵۹ء

شفیق مکرم۔

آپ کا خط ملا۔ میں نے آپ کے کل خطوط کا جواب دیا ہے اگر آزاد کے بارے میں جو رائے آپ نے ظاہر کی تھی، اس کے متعلق اب تک کچھ نہیں لکھا۔ میری رائے اس شخص کے متعلق کچھ اچھی نہیں۔ ڈاکٹر لوہیا نے جو کچھ اس کی کتاب انڈیا ونس فریڈم کی نسبت کہا تھا، وہ اسٹیٹسمین میں چھپا تھا۔ ان کا قول ہے کہ:-

Every page contains a big error, and a number of inexactitudes

اس کا ثبوت آپ ان سے مانگئے۔ آزاد کے ایک بیان کو نہیں جسے قطعاً غلط سمجھتا ہوں اور جو اسے صحیح ثابت کرے اسے پانچ سو روپیہ انعام دینے کو تیار

ہوں آزاد کا دعویٰ ہے کہ آزاد کے والد خیر الدین نے ۲۰ لاکھ روپئے جمع کر کے
سلطان عبدالمجید کو دیئے۔ آزاد کے مداحوں کے لیے ۵۰۰ روپیہ حاصل کرنے
کا بہت اچھا موقع ہے۔ آزاد کی راست گفتاری سے قطع نظر، بڑا اعتراض یہ ہے کہ
نہرو اور پٹیل سے علٰحدگی کیوں اختیار نہ کی۔

آپ کی نظم غور سے پڑھی حسب فرمائش جو باتیں اس کے متعلق سمجھ میں آئی ہیں
سپرد قلم کر رہا ہوں۔

بند (۱) "میرے آقا میرے مالک میرے مخدوم کی یاد" ہر جگہ میرے یا میرے کی
جگہ اپنے چاہیے۔ آقا اور مالک میں آپ کے نزدیک کیا فرق ہے؟ روز
مرّہ اردو میں تو ایک ہی ہیں۔ آپ بھی ان کے معنی میں فرق نہیں سمجھتے، تو ان
میں سے ایک حشو ہے۔

(۲) مصرع (۱) اور (۲) میں ربط نہیں، میری رائے میں مصرع (۲) میں
کوئی ایسی بات ہوتی جس کا تعلق عیب سے ہوتا تو بہتر تھا۔ اس سے قطع نظر یہ
مصرع نثر کا ایک ٹکڑا معلوم ہوتا ہے۔

بند (۳) لفظ شوق کی تکرار ٹھیک نہیں۔

بند (۴) روداد کی جگہ کوئی اور لفظ ہو تو بہتر ہے۔

بند (۵) میں جس طرح کے جذبات ظاہر کیے گئے ہیں۔ ان کا لحاظ کرتے ہوئے
بادشاہ کہہ کر خطاب کرنا ٹھیک نہیں معلوم ہوتا۔

بند (۸) "صاحب ایثار نفس" کھٹکتا ہے۔ یہ ترکیب صحیح نہ سمجھی جائے جب بھی
نفس بحرکت فا کی جگہ نفس بسکون فا چاہیے۔

بند (۹) محفل کی جگہ محافل درست سہی، مگر مجھے اس جگہ اچھا نہیں معلوم ہوتا مصرع ۴

ہیں "میری" ٹھیک ہے مصرع ۴ مجھے پسند نہیں۔

بند (۱۰) مصرع ۳ میں مرزا کا الف بری طرح دبتا ہے۔

بند (۱۱) "بہت" کی جگہ "بہت سے" چاہیے۔

بند (۱۲) "اپنے سینوں پہ مرا نام رقم فرمایا" سے جو آپ کا مطلب ہے، واضح نہیں ہوتا۔

بند (۱۴) مصرع ۴ کا مطلب میری سمجھ میں نہ آیا۔

بند (۱۵) ہر تار اسی صورت میں صحیح ہو سکتا ہے کہ ایک سے زیادہ تار ہوں۔

"جان سے شناسا" خلاف روزمرہ اردو ہے۔ "ہر ظاہر و باطن" میں ہر کی ضرورت نہیں۔

بند (۱۶) دوست مخلص ہیں، ان کی محبت عشق کی حد تک ہے اور آپ کے لیے جان تک دینے کو تیار ہیں تو اس سے زیادہ آپ کیا چاہتے ہیں۔ اس صورت میں وجہ ترجیح صرف یہی ہو سکتی ہے کہ خود آپ کی محبت عشق کی حد تک نہ پہنچ سکی ہو۔

"دوست بیدار" بے محل معلوم ہوتا ہے۔

بند (۱۷) پابستہ سے محبوس بہتر ہے۔ شر سے وابستہ ٹھیک نہیں۔ جنت دوزخ میں جانے کا سوال فضول سا ہے۔ اس کا مدار صرف اس پر نہیں کہ کسی کی دوستی آپ کے ساتھ مخلصانہ ہے یا نہیں۔

بند (۱۸) موزوں ناموزوں ہے۔ شے پر وزن فعل صحیح نہیں۔

بند (۱۹) مردن متروک، دوسری شکل بہتر ہے۔

بند (۲۰) مصرع ۴ میں چاہیگا نہیں چاہے، چاہیے۔

بند (۲۱) دوسرا مصرع بھرتی کا ہے۔

بند (۲۲) آپ خود اپنے خیالات و محسوسات کا جائزہ لے رہے ہیں۔ تحقیق و تجسس کا محل نہیں: "تجھے دوزخ الخ۔ تجھے سہو قلم تو نہیں؟

حیدرآباد ایک ہفتے کے بعد جانے کا ارادہ ہے۔ وہاں کا پتا بعد کو لکھونگا ممکن ہے وہاں آنا ہو۔ مگر آپ میری واپسی کے بعد ضرور پٹنہ آئیں۔

مخلص

عبدالودود

(۳۴)

محبّی تسلیم

آپکا خط جس کے ساتھ ریلوے کی رسید بھی ملا تھا، اور اس کے بعد ۳۰ مارچ والا خط آیا۔ پارسل کل منگوا لیا گیا، پہلے دو بار آدمی گیا تھا۔ مگر اسٹیشن والوں نے پارسل دینے سے انکار کر دیا تھا۔ کوئی چیز ٹوٹی نہیں، آپکے یہاں پیکنگ بہت اچھی ہوئی تھی۔ کتابخانوں کی فہرستیں بھی ساتھ تھیں، جو ڈاکٹر سید احمد کے حوالے کیجائیں گی بہت بہت شکریہ۔

آپ نے حفیظ جالندھری صاحب کا نام اس طرح لکھا کہ میں سمجھا دیا تین آدمی کے نام ہیں۔ آپنے لکھا ہے کہ حفیظ صاحب نے اس خوف سے کہ مبادا آپ اپنا پورا کلام نہ سنائیں، خود اپنا کلیات سنانا شروع کر دیا۔ اسے علاج بالمثل کہتے ہیں۔ یہ کہیے کہ کتنا کلام سنا؟

فراق صاحب کی غزلیں کیسی رہیں؟ وہ بڑی لمبی غزلیں لکھنے لگے ہیں۔ اور اس کا لازمی نتیجہ یہی ہے کہ بھرتی کے شعر ان کی غزل میں بہت ہوتے ہیں۔

میں نے اردو ادب کا جو نسخہ جس میں میرا مضمون ہے بھیجنے کا وعدہ کیا تھا،

کئی بار ڈھونڈا مگر نہ ملا، اتفاق کی بات کہ آج زیادہ تلاش کے بغیر مل گیا۔ اسے رجسٹری کرا کے بھیج رہا ہوں۔

یہ یاد نہیں کہ یہ نمبر آپ نے کیوں مانگا تھا۔ مضمون میں کوئی بات مجمل ہو تو مجھے لکھئے کہ میں حسب ضرورت تفصیل سے کام لوں۔

میری بیوی ایک مہینے سے بیمار ہیں اور عمل جراحی ضروری ہو گیا ہے۔ خاموشی کی ایک وجہ یہ بھی تھی۔ کمال یہ ہے کہ ہائی بلڈ پریشر بھی ہے۔ آج ایک ڈاکٹر صرف اس غرض سے بلوایا ہے کہ یہ فیصلہ کرے کہ عمل جراحی جلد ہو سکتا ہے یا نہیں۔ یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ تقریبیں اچھی طرح انجام ہو گئیں۔ مبارکباد قبول کیجئے۔ آپ کی صحت آج کل کیسی ہے۔

مخلص

عبدالودود

(۳۵)

۶۰-۱/۴ محبی تسلیم۔

اردو ادب اور آپ کے خطوط ملے۔ اوپریشن اسپتال میں ہو گا اور ابھی اس میں کئی دن باقی ہیں۔ آپ نے بڑی محبت سے لکھا ہے کہ ضرورت ہو تو خود آؤں یا دوائیں لیکر کسی کو بھیجوں، لیکن کون سی دوا ایسی ہے جو یہاں نہیں ملتی۔ آپ آنا چاہیں تو شوق سے آئیں، مگر ابھی نہیں۔

سقوط ی کی جو مثالیں ملتی ہیں۔ ان میں کوئی ایسی جس میں ی کے بعد الف کے علاوہ کوئی حرف ہو میں نے پیش نہیں کی، اور اس وقت ایسی کوئی مثال پیش نظر بھی نہیں، لیکن جہاں تک مجھے علم ہے کتب عروض میں ایسا کوئی قاعدہ نہیں ملتا

کہ ی اس کے بعد الف ہو تو ساقط ہو سکتی ہے، اور دوسرے حروف ہوں تو نہیں۔ ان میں سرے سے سقوط کے متعلق کوئی قاعدہ نہیں۔ آپ تقطیع کر کے دیکھ لیں، ی بالکل ساقط ہو جاتی ہے۔ اور مصرعے اس صورت میں بھی موزوں رہتے ہیں۔ اگر ی بالکل نہ ہو۔ مثلاً یہ کہ نظیری کی جگہ نظیر رکھا جائے تو موزونی میں مطلقاً فرق نہیں پڑتا۔ جو لوگ جو سقوط یا۔ پر معترض ہیں، وہ بھی یہ نہیں کہتے کہ الف اس کے بعد آئے تو سقوط روا ہے۔ بہر حال میں ایسی مثال کی تلاش میں رہوں گا جس میں ی تقطیع میں ساقط ہوتی ہو اور اس کے بعد الف نہیں کوئی اور حرف ہو۔

یگانہ کا کلام ابھی میں نے نہیں دیکھا، مختلف اقسام کی پریشانیاں اور مصروفیتیں ہیں۔ ہاں صاحب! میں نے بیبی (ب ی ب ی) لکھا تھا، بیٹی نہیں، آپ کی صاحبزادی کی شکایتوں کے رفع ہو جانے سے دلی مسرت ہوئی۔ امید ہے کہ شفایابی مستقل ہوگی۔ انھیں اور ان کے بچوں کو میری طرف سے دعائیں۔ وہ دوا جو آپ نے بتائی تھی، اس سے کچھ فائدہ معلوم ہوتا ہے۔ مگر یہ بتائیے کہ اس کا استعمال جاری رکھوں یا گرمی کی وجہ سے بند کر دوں۔

وہ دوا یہاں آسانی سے مل جاتی ہے۔

لفظ بیبی ترکی یا مغلی ہے، ہندوستانی نہیں۔ "بیوی" میری زبان پر نہیں، اور میں اسے پسند نہیں کرتا۔

مخلص ۔ عبدالودود

(۳۶)

پٹنہ ۴ ۔

محبی، تسلیم

۲ جولائی ۶۰ء ۔ ہاشم صاحب تجارتی معاملات میں محتاط ہوں گے۔

[illegible] شعرا [illegible] مناسب نہیں۔ میں انھیں خط تو جلد لکھوں گا، لیکن اغلاط کی [illegible] اسی وقت توجہ کروں گا جب وہ خود اس کی خواہش ظاہر کریں گے میں یہ نہیں چاہتا کہ نیکی برباد گناہ لازم کا معاملہ ہو۔

آپ ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو کیوں لکھتے ہیں؟ بہت دن ہوئے وہ بے تخلص ہو گئے۔ میں نے کبھی ان سے شعر سنانے کی فرمایش نہیں کی۔ اور نہ خود انھوں نے اپنے شعر مجھے سنائے۔ لیکن ان کے دو چار شعر کسی نہ کسی طرح میری نظر سے گزرے ہیں۔

مختار الدین احمد صاحب نے نقوش میں جو شعر میری طرف منسوب کیے ہیں، وہ نہ جانے انھیں کس طرح ملے مجھے تو بالکل یاد نہیں کہ میں نے انھیں دیے ہوں۔ بہر حال ان میں سے کچھ فارسی اشعار کا ترجمہ ہیں اور یہ بات بتانے کے قابل تھی، جو انھوں نے نہ لکھی۔ اگر انھوں نے میری زبان سے وہ اشعار سنے تھے تو یقین ہے کہ ساتھ ساتھ میں نے یہ بھی کہہ دیا ہو کہ ترجمہ ہیں۔ میں نے زیادہ شعر نہیں کہے۔ پہلا شعر جو میں نے کہا تھا، مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ جس وقت یہ شعر موزوں ہوا تھا، میری عمر بارہ تیرہ برس کی ہوگی فضول سا ہے۔

ژولیدہ بال کیوں ہیں چہرہ ہے کیوں پریشاں
مرگِ رقیب کی کیا تم نے خبر سُنی ہے

مجھے یاد ہے کہ آپ کی زوجہ محترمہ سے تعارف ہوا تھا۔ قیاس یہی تھا کہ دریا، انھیں کا نام ہو۔ آپ نے میرا سلام کہہ ہی دیا ہوگا۔ صاحبزادی کو بار بار درد گردہ کی شکایت ہو جاتی ہے۔ ...... صاحب نے عجیب بات کہی۔ ممکن ہے کہ جس فرقے سے وہ تعلق رکھتے ہیں، اس میں پختہ تر ممنوع ہو۔ یہ نہیں کہتے کہ میری تحریر و تقریر میں کوئی قابل گرفت بات نہیں ہوتی۔ ارادہ ہے کہ اپنے اغلاط کے متعلق خود ایک مضمون لکھا

فہرست [illegible] ہوگا۔

Tumo— (میں نہیں کہہ سکتا کہ ٹی بی ہے یا کوئی اور چیز) رحم
میں ہے، اور مس جون کا خیال ہے کہ اگر زیادہ بڑھ گیا ہے تو نکالا نہیں جا سکتا۔
دت صاحب کی تلاش بیکار رہے۔ آپ یہ لکھئے کہ دوا کس طرح استعمال ہو۔ کسی اچھے ہومیوپیتھ
سے دریافت کروں گا۔ بھئی، یہ معلوم ہے کہ ابتدا میں ڈریا کرسٹی سین کے ۱۸ انجکشن
دیے گئے تھے اور B12 کے اس سے کہیں زیادہ انجکشن دیئے جا چکے ہیں۔

رحمت قطبی سے ملاقات ہوتی ہے؟ ان حضرت نے ادارۂ تحقیقات اردو کی شائع
کردہ کتابیں تجارتی اغراض سے قیمتاً ذاکر کے منگوائی تھیں، بھجوا دی گئیں۔ مگر مہینوں
گزر جانے پر بھی انہوں نے یہ نہیں لکھا کہ ملیں یا نہیں۔

خواجہ میر درد کے والد کے مزار کے متعلق مرقوم ہے کہ اس کا پتھر کیسی ہی گرمی کیوں
نہ ہو، ٹھنڈا رہتا ہے۔ میں نے لکھا تھا کہ وہ اس کے بارے میں تحقیقات کر کے
اطلاع دیں۔ اس کے بارے میں بھی خاموشی ہے۔ درد کے والد کا نام خواجہ
محمد ناصر اور تخلص عندلیب تھا۔ ممکن ہے تو آپ ان کے مزار کے بارے میں دریافت
کریں کہ کیا حقیقت ہے۔

درد کا مزار، سنا ہے کہ بہت بری حالت میں ہے۔

مخلص

قاضی عبدالودود

(۳۷)

۱۸ ستمبر ۶۰ء
پٹنہ ۴

محبی، — فکر و نظر، دانشگاہ علی گڑھ کا سہ ماہی رسالہ

ہے، جس کے مدیر ڈاکٹر یوسف حسین، اس یونیورسٹی کے پرو وائس چانسلر اور ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے چھوٹے بھائی ہیں۔ وہ مقالہ جس کا میں نے ذکر کیا تھا، ظفر احمد صدیقی صاحب (کا) لکھا ہوا ہے جو دانشگاہ مذکور میں فلسفہ و نفسیات کے ریڈر رہے۔ ان کے مقالے "ادب اور نفسیات" (ص۹۵ تا ص۱۳۸) یگانہ کا ذکر ص۱۲۶ کی ۱۲ سطروں میں آیا ہے (صفحوں میں عموماً ۲۰ سطریں)" یاس عظیم آبادی کی شاعری کا مطالعہ کیا جائے تو ان کی شخصیت ایک شدید احساس کمتری کا شکار نظر آتی ہے۔ کبھی وہ اس قسم کی خبر پڑھتے ہوئے نظر آتے ہیں" یاس نام آور م فاتح لکھنؤ" کبھی یوں خودستائی کا حق ادا کرتے ہیں" لکھنؤ کے فیض ..... داماد ہوں" لکھنؤ کا بار بار ذکر اس بات کا اشارہ کرتا ہے کہ شاعر کی الجھن اور کشمکش سرزمین لکھنؤ اور وہاں کے اشخاص سے گہرا تعلق رکھتی ہے، یہ ابتدائی زمانے کے اشعار تھے۔ آخر میں احساس کمتری اس قدر شدید ہو گیا کہ ان کی تسکین اور تلافی کے لیے شاعر عظیم اور محترم شخصیتوں کے خلاف رکیک حملوں پر اتر آیا۔ غالب شکن" اور اسی قسم کے اور قطعات (کذا) اس ذہنیت کے ترجمان ہیں۔ اس بیمار ذہنیت اور احساس کمتری کا نقطۂ عروج اس وقت آتا ہے جب شاعر ذلت و فضیحت میں بھی اپنے لیے وجہ تسکین و افتخار ڈھونڈ لیتا ہے۔ اس کی مثال وہ انٹرویو ہے جس کا ذکر کسی پاکستانی ایڈیٹر نے اپنے رسالے میں کیا تھا۔ خود یاس نے ان سے اپنی حد سے گذری ہوئی فضیحت کا ذکر کرتے ہوئے اس بات پر فخر کا اظہار کیا تھا کہ آج تک اردو کے کسی بڑے سے بڑے استاد کو بھی یہ اعزاز نصیب نہ ہوا۔ یاس تخلص چھوڑ کر یگانہ چنگیزی کا لقب اختیار کرنا ان کے مرض نشو و نما کی پوری تصویر ہمارے سامنے لے آتا ہے۔ یہ کچھ اس قسم کی تبدیلی ہے جس نے ایک دائم المرض شاعر فلسفی کو "زرتشت نے کہا" ..... کا مصنف بنا دیا تھا۔"

...... رائے غلط ہو سکتی ہے لیکن اس میں تعصب کو دخل نہیں ...... کل پرسوں کے خط میں یگانہ کے متعلق جو کچھ لکھا تھا، وہ مجمل تھا۔ آج کسی قدر تفصیل کے ساتھ اپنی رائے ظاہر کرتا ہوں۔

یگانہ نے جس زمانے میں وہ پاس تھے ایک رسالہ چراغ سخن لکھا تھا جس کا مطالعہ میں نے اسی وقت کیا تھا جب یہ شایع ہوا تھا۔ اسے مدت گذر گئی، اور میں بالکل نہیں کہہ سکتا کہ اس کا مرتبہ علمی کیا تھا۔ ان کی کوئی اور تحریر جس سے ان کے علم و فضل کا اندازہ ہو سکے، یا تو میری نظر سے نہیں گذری۔ یا گذری ہے تو اسے اتنا زمانہ گذر گیا ہے کہ اس کے متعلق کوئی بات مجھے یاد نہیں۔ ایسی حالت میں ظاہر ہے کہ اس بارے میں میں کوئی رائے قائم نہیں کر سکتا۔ ان کے شائع شدہ اشعار کا بالاستیعاب مطالعہ میں نے نہیں کیا۔ جو کچھ دیکھا ہے اس میں بہت اچھے اچھے اور معمولی اشعار ہیں، میری فی الحال ہرگز یہ رائے نہیں کہ وہ اردو کے سب سے بڑے شاعر ہیں، اور اس کا امکان بہت کم ہے کہ مزید مطالعہ کے بعد اپنی رائے بدل سکوں۔ "نگاہ انتخاب" میں جو اشعار ہیں وہ ظاہرا مؤلف کی نظر میں ان کے بہترین اشعار ہیں، ان کا مطالعہ بھی اس نتیجے پر نہیں پہنچاتا کہ وہ اردو کے بزرگ ترین شاعر ہیں۔

رہی شخصیت، تو جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں، مجھے کبھی ان سے ملنے کا موقع نہیں ملا، اور ملتا بھی تو سرسری ملاقات میں محض اوپری باتیں نظر آتی ہیں۔ صحیح رائے قائم کرنے کے لیے اول تو بصیرت کی ضرورت ہے، دوسرے یہ کہ حالات زندگی سے کامل واقفیت لازم ہے۔ مجھے ان کے حالات بہت کم معلوم ہیں، جو کچھ جانتا ہوں، اس سے اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ان کی شخصیت متوازن نہ تھی، ایک فنکار کے لیے

یہ ضروری ہے یا نہیں، اس بحث میں میں پڑنا نہیں چاہتا۔ "فضیحت" پر فقرہ اس صورت میں روا ہو سکتا تھا کہ وہ پہلے سے واقف ہوتے کہ نیاز کو اشعار بھیجنے سے کیا نتائج مرتب ہوں گے۔ لوگ مسلمانانِ ہند کی پاکستان کے لیے قربانی کا ذکر کرتے ہیں، میں ہمیشہ یہ کہا کرتا ہوں کہ جو کچھ ہوا اس میں خود ان کے ارادے کو دخل نہ تھا۔ اس لیے وہ اپنی قربانیوں پر فخر کرنے کا حق نہیں رکھتے۔

آپ نے لکھا ہے کہ وہ اپنے کو بیچ نہیں سکتے تھے، ممکن ہے یہ صحیح ہو، لیکن ایک سوال یہ ہے کہ انھیں خریدنا چاہا کس نے، اور ان کی قیمت کیا لگی؟ اس شخص کے لیے جسے کبھی ترغیب دی ہی نہیں گئی ہو، گناہ سے بچنا زیادہ مشکل نہیں۔

میں نے اوپر جو کچھ لکھا اس میں صرف ایک قطعی ہے اور وہ توازن کے فقدان کے متعلق ہے۔ اس کا امکان کہ یہ رائے بدل سکتی نہیں ہے۔ اور باتیں جو میں نے لکھی ہیں ان پر قائم رہنا ضروری نہیں، بشرطیکہ ان کے خلاف شہادتیں میرے علم میں آئیں۔

میں نے تفصیل سے کام اس لیے لیا ہے کہ آپ میرے متعلق غلط فہمی میں مبتلا نہ ہیں

مخلص

عبدالودود

۳۸

۱۴ ستمبر ۶۰ء، پٹنہ

..... تسلیم۔ آپ کا خط ملا، اور دعوت نامہ بھی۔

دعوت نامے کی رسید الگ سے بھیجوں گا۔ ۲۰ ستمبر کو یہاں سے روانگی کا ارادہ ہے۔ نرملا اور ان کے بچوں کو دعائیں۔ تقریب میں ضرور شریک ہوں گا۔ یہ بیان محض صرف اس امر کے اظہار کے لیے ہے کہ لام مفتوح ہے۔ شعر پر اعتراض غلط ہے۔

۳۔ آپ کا یہ خیال کہ میں نے یگانہ پر اعتراض کے لیے خاص اہتمام کیا تھا، صحیح نہیں۔ خط کی تحریر کے وقت یگانہ کے ان اشعار میں سے بھی جو نگاہ انتخاب میں ہیں، چند پیش نظر تھے۔ وہ شعر جس میں لفظ "حالی" آیا ہے، صرف اس غرض سے پیش کیا گیا تھا کہ آپ یہ معلوم کریں کہ یگانہ کا سقوط یا کے متعلق کیا عمل ہے۔ اس پر اعتراض مقصود نہ تھا۔ میرا خیال ہے کہ اردو میں ی کا دبنا یا گرنا خاص خاص صورتوں میں ناگوار معلوم ہوتا ہے، عام طور پر نہیں۔ رہی فارسی، تو جو مثالیں میں نے پیش کی تھیں، ان سب میں ی کے بعد الف ہے۔ اور ان میں الف ساقط ہوتا ہے۔ ی نہیں۔ اس باب میں آپ نے جو کچھ لکھا تھا صحیح ہے۔ آپ کا خط آنے کے بعد میں تلاش میں رہا کہ فارسی کا کوئی ایسا شعر ملے جس میں ی دبتی یا گرتی ہو لیکن اس کے بعد الف کے سوا کوئی حرف ہو، مگر اب تک نہیں ملا۔ آپ نے اپنے خط میں چند شعرا کے اردو کے متعلق لکھا تھا کہ ان کے یہاں ی گرتی ہے اور چند کے بارے میں بتایا تھا کہ ان کے یہاں نہیں گرتی۔ میرا خیال ہے کہ ان سب کے یہاں ی کے دبنے یا گرنے کی مثالیں ملیں گی۔ آپ براہ کرم ان کے نام دوبارہ لکھیں۔

مفتعلن بیشک مستفعلن کا زحاف ہے لیکن جہاں تک میرا علم ہے، یہ جائز نہیں کہ رجز مثمن مطوی مخبون میں مفتعلن کی جگہ مستفعلن لایا جائے۔

المعجم فی ... ادر معیار الاشعار بڑی مستند کتابیں ساتویں صدی ہجری کی لکھی ہوئی ہیں ان میں بحر مذکور کے متعلق جو مرقوم ہے درج ذیل ہے۔

(۱) "مثمن ... مجنون" بر شعرے از نشاط دل وقت سحر بنظرہ، مفتعلن مفاعلن مفتعلن مفاعلن دباید کہ در فعل ... سب اجزا رعایت کنند با مضاریع مختلف نیاید و ذوق شعر مختل نگردد، چنانکہ گفتہ اند بس چہ توئی نگار من وز دو جہاں بزار ام مفتعلن مفاعلن مفتعلن مشغولن نگار من کنی نظر وگر نہ دل بر دارم مفاعلن

مفتعلن مفاعلن مفعولن"   المعجم ص ۹۹

(۴) تسبیغ از مفاعلن مفتعلن چہار بار یا برعکس بکار دارند و خوش باشد مثال:

اول ز تنگوان لطف و کرم سزا تمد از جور تو ستم مدار از این بیش بغم دل مرا تو

او اگر جائے بنا درین ترتیب بگردد، عذر خواہند چنانکہ خاقانی گوید در قصیدہ کہ بترتیب دوم گفتہ است (یعنی مفتعلن مفاعلن مفتعلن مفاعلن)

کیسہ ہنوز فربہ است با تو ازیں قوی دلم   چارہ چہ خاقانی اگر کیسہ ابلہ لاغری

گرچہ بموضع لقب مفتعلن دوبارہ شد   بحر ز قاعدہ نشد تا تو بہانہ آوری" معیار الاشعار ص

آپ کے نزدیک اگر یہ بات کہ بحر مذکور میں مفتعلن کی جگہ مستفعلن لانا کسی قاعدہ کلیہ کے ماتحت ہے، یا ان کتابوں یا دوسری مستند کتابوں میں یہ موجود ہے کہ اس بحر میں مستفعلن بجائے مفتعلن آسکتا ہے، تو کتابوں کی عبارتیں پیش کریں۔

ہاں میں نے میر مظفر علی اسیر استاد امیر مینائی کی کتاب متعلق عروض میں بھی بحر مذکور کی بحث دیکھی، مگر کوئی بات جس سے آپ کی بات ثابت ہو سکے، نہ ملی۔

فرض کیجیے کہ آپ کسی مستند شخص کا قول اپنے دعوے کے اثبات میں پیش کریں، اس صورت میں بھی میں یہ کہوں گا کہ مفتعلن کی جگہ مستفعلن ہرگز نہ لانا چاہیے۔ اس کی وجہ یہ کہ ذوق شعر مختل ہوتا ہے۔ غزل کی زبان نازک اور لطیف ہوتی ہے۔ بہت سے اوزان اور ان کے زحافات جو اور اصناف سخن کے لیے روا ہیں غزل کے لیے روا نہیں، اور یہ معاملہ ذوقی و وجدانی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ کسی اچھے فارسی یا اردو غزل گو کے یہاں آپ کو اس کی مثال نہ ملے گی کہ بحر مذکور میں مفتعلن کی جگہ مستفعلن آیا ہو۔ مجھے یقین ہے کہ خود یگانہ نے کبھی ایسا نہ کیا ہو۔

ہاں یگانہ کے "حالی" والے شعر میں ایک اور لفظ کی سی گڑتی یاد پڑتی ہے۔ شعر
اس وقت سامنے نہیں۔ آپ اسے خود دیکھ لیجیے۔

زمانۂ قدیم میں ایرانی شعراء عجیب عجیب اوزان میں شعر کہا کرتے تھے۔ اس
موضوع سے دلچسپی ہو تو المعجم یا معیار دیکھیے۔

ایسے کچھ اوزان میرے اس مضمون میں ہیں جو ندیم ڈھاکہ میں عنوانِ ذیل سے
چند ماہ قبل چھپا تھا: "غالب کا ایک عروضی اعتراض"

نیاز احمد کا پرچہ بند ہو گیا ہے۔ پتا یہ ہے۔

16, Wellesley Square

Calcutta-16

مخلص

عبدالودود

(۳۹)

۲۶ جنوری ۶۸ء

مجنور پوکھر، بانکی پور

مکرمی،

میں کل پٹنہ واپس آیا تو علی گڑھ میگزین کا اگست نمبر اور آپ کے تین خط ملے۔ شکریہ۔
میگزین کے بعض مضامین اچھے ہیں۔

(۱) غالب کا یہ اعتراض کہ خلف، نام نہیں ہو سکتا، غلط ہے۔ کتابوں میں اس نام
کے بہت سے آدمیوں کا ذکر ہے۔

(۲) فرہنگ نظام کا نام میں نے سنا ہے مگر ابھی اس کے دیکھنے کا موقع نہیں ملا۔

(۳) آغا احمد علی کے بارے میں فی الحال میرا کچھ لکھنا مشکل ہے۔ جن کتابوں کے نام

آپ نے تحریر کیے ہیں، ان کے علاوہ بھی ان کی کتابیں ہیں نام اس وقت یاد نہیں آتے حکیم حبیب الرحمن مرحوم نے ان سے متعلق ایک مضمون مدت ہوئی لکھا تھا۔ مگر باوجود وعدے کے مجھے وہ رسالہ جس میں یہ چھپا تھا نہ بھیج سکے۔ آپ ڈاکٹر عندلیب شادانی سے اس کی، لسبت دریافت کریں۔ آغا کے بارے میں میری رائے ہے کہ وہ فارسی کی صرف و نحو اور اس کے ادب سے غالب کے مقابلہ میں بہت زیادہ واقفیت رکھتے تھے لیکن شاعر کی حیثیت سے انھیں کوئی مرتبہ حاصل نہیں۔ مؤید برہان کا سال طبع جو ہر نے لکھا ہے غالباً صحیح ہے قطعی طور پر مؤید کو دیکھنے کے بعد لکھوں گا۔

(۴) جرمن اور فرانسیسی دونوں سیکھنے کے قابل زبانیں ہیں۔ فرانسیسی نسبتاً آسان ہے۔ چار پانچ مہینوں میں اتنی آجائے گی کہ آپ نثر کی معمولی کتابیں بے تکلف پڑھنے لگیں۔ Hugo Self - Taught Series منگوا لیجئے، تلفظ کے لیے کسی ایسے شخص سے مدد لیجئے جو اس زبان سے واقف ہو علیگڑھ میں ایسے بہت سے لوگ ہوں گے۔

(۵) مکتوبات شاد پر جو مضمون لکھا گیا تھا وہ شخص معلوم نے واپس نہیں کیا۔ کسی دوسرے مضمون کے لیے فی الحال وقت نکالنا مشکل ہے۔ ایک بات اور بھی ہے: میں خود ایڈیٹر کی درخواست کے بغیر رسالے کے لیے مضمون نہیں دے سکتا۔

(۶) ۔ ۔ ۔ ۔ کی نیادت کے بارے میں سعدی کی رائے سن لیجئے۔

کس نیاید بزیر سایۂ بوم ۔ ور ہما از جہان شود معدوم

(۷) غبار خاطر ابھی حال میں دیکھی۔ اور باتوں سے قطع نظر مصنف صحیح اردو بھی نہیں لکھ سکتا۔

(۸) میں ابھی سندھ گیا تھا۔ سات آٹھ ہفتے رہ کر واپس آیا ہوں۔ ہوائی راستہ

اب تک خرابی سے خالی ہے۔ امید ہے کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔

و

(۹) غالب کے فارسی اشعار کا ایک مجموعہ علی گڑھ میں ہے غالباً شیفتہ کلکشن ہیں۔ میں اس کے مندرجات کے متعلق تفصیل چاہتا ہوں۔ کیا یہ ممکن ہے؟ یہ معلوم ہو جانے کے بعد کہ اس میں کیا کیا ہے، ممکن ہے میں مزید تفاصیل چاہوں۔ آپ اگر یہ نہ کر سکیں اور کوئی دوسرا شخص اس پر راضی ہو تو اسے معاوضہ بھی دے سکتا ہوں۔

(۴۰)

۲۶/۲ ۵۵ پٹنہ ۴۔

شفیق مکرم، آپ کا خط ملا۔

(۱) مطبوعہ مخزن نکات ۹۷ صفحوں میں ہے۔ قدرت کا حال ص۶۰ میں ہے میر ضیا کے بعد اور ابوالحسن وحشت سے قبل۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ ترجمۂ قدرت کی سطر ۲ میں جو لفظ چرکشی آیا ہے وہ دراصل کیا ہے۔ مائل کا حال اس تذکرے کے ص۶۷ و ص۶۸ میں مرقوم ہے۔ ص۶۸ کی سطر ۲ میں قدرت کا نام ضمناً آیا ہے اور اس کے بعد لفظ "خاں" مرقوم ہے۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ شاہ قدرت اللہ خاں "ہے یا کچھ اور ۔۔۔ (۲) جرمنی سے جو چیزیں آپ نے بھیجی تھیں وہ مل گئیں، دلی شکریہ قبول کیجیے ۔۔۔ (۳) کتابیں زیرِ طبع ہیں یہ چرکشی کے متعلق تحقیق ضروری ہے۔ یہ کوئی لفظ نہیں۔ کچھ دیر مجھ سے ہوری ہے اور کچھ اہلِ مطبع سے۔ متن ایک کتاب کا چھپ چکا ہے، دوسری کا زیرِ طبع ہے۔ معاصر حصہ ۸ ابھی زیرِ طبع ہے۔ (۵) ذکی الحق صاحب کا موضوع میر حسن ہے اور وہ اس پر اس وقت سے کام کر رہے ہیں جب اس کا مطلقاً علم نہ تھا کہ ڈاکٹر قمر لبنٹی نے بھی یہی موضوع اختیار کیا ہے۔ موجودہ حالات میں تصادم ناگزیر ہے۔ (۶) ڈاکٹر فاروقی کو میں نے صاف لکھ دیا تھا کہ

... دو فلم نہیں ..ی۔ اور وہ مدت سے خاموش ہیں، ممکن ہے انھیں یہ بات ناپسند آئی ہو۔ اس کی مجھے پروا نہیں۔ شکایت کا کسی کو حق ہے تو مجھے۔ غالباً مائکروفلم پٹنہ یونیورسٹی ... بیگی۔ (۷) معاصر کے متعلق میں نے کلیم صاحب کو خط لکھا تھا جس کا جواب انھوں ... دیا لیکن حسن عسکری صاحب آکر ملے۔ میں نے کہہ دیا ہے کہ میری تعلمی خدمات حاضر ... لیکن اور باتوں سے سروکار نہیں۔ اس کا جواب بھی مجھے اب تک نہیں ملا۔ (۸) کلیات میر حسن کا مائکروفلم روپے وصول کیے بغیر بھجوانے کا سوال نہیں۔ اور باتوں کا جواب آئندہ تذکرۂ قائم کی وجہ سے جاری ہے جواب طلب امور بہت سہل ہیں، ہر شخص جو تھوڑی فارسی جانتا ہو آسانی کے ساتھ جواب دے سکتا ہے۔ (۹) لکھنؤ خط لکھا تھا سرور کا عکس پہلے ہی آچکا ہے۔ ابن قدامہ کی کتاب کے لیے اور یاد دہانی بھی کی تھی، مگر اب تک ... نہیں آیا۔ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی صاحب سے بھی دریافت کیا تھا، انھوں نے لکھا تھا کہ تحقیق کر کے جواب دوں گا کہ کہاں سے مل سکتی ہے۔

مخلص

عبدالودود

(۴۱)

۸؍ ... ۵۶ء شفیقی مکرم،

(۱) آپ کو پہلے لکھ چکا تھا کہ ڈاکٹر شادانی کا خط آیا۔ انشا کا رسالہ جس کا ذکر آپ نے کیا تھا کہاں ہے نقل لکھیں ممکن ہے کہ وہ اس کا عکس حاصل کریں۔ آپ اپنا مضمون قبل اس کے کہ وہ اس کے متعلق کچھ لکھیں آپ فی شائع کر سکتے ہیں۔ (۲) میں آج کل بہت مصروف ہوں آپ غالب سے متعلق ایسے امور کی جن کے بارے میں لندن میں تحقیقات ہو سکتی ہے فہرست بنا کر جلد از جلد بھیجیں ممکن ہے کہ ڈاکٹر شادانی اپنا کچھ وقت

[illegible] بیشک آسانی سے نہ مل سکیگا۔ مالک رام [illegible] بہت [illegible]
خوب آدمی ہیں اور میں دہلی میں رہتا یا وہ پٹنہ میں تو یقین ہے کہ انہیں راہ پر لے آتا

مخلص

عبدالودود

(۴۲)

پٹنہ ۴۔ ۵۶/۱۲/۱۷

شفیق مکرم، آپ کے دو خط ملے۔ میں نے جو یہ لکھا تھا کہ ہر شخص کے لیے کسی دوسرے [illegible] طرح سمجھنا بہت مشکل ہے۔ وہ عام بات تھی۔ اس [illegible] سے [illegible] نہ تھا۔ یہ البتہ میں چاہتا تھا کہ آپ میری نسبت جو کچھ لکھیں وہ خلوص پر مبنی ہو اور اس کی غرض مجھے خوش کرنا نہ ہو، رہی یہ بات کہ آپ [illegible] میری تنقیص کریں اس کا مجھے وہم بھی نہیں ہے آپ نے جو کچھ لکھا ہے وہ آپ نظر ثانی کیجیے [illegible] بھی چاہتے تو [illegible] دیکھتا ہاں آپ [illegible] کی [illegible] مجھ سے چاہتے [illegible] کر سکتا تھا اور اب بھی ممکن ہے آپ بطور استدراک مضمون میں اضافہ کر سکتے ہیں۔ لوگ جانتے ہیں کہ آپ مجھ سے خلوص رکھتے ہیں، اگر آپ کے قلم سے کوئی بات نکل گئی تو لوگ اسے صحیح سمجھیں گے۔ اس لیے کسی امر کے متعلق شبہہ ہو تو مجھ سے دریافت کیجیے۔ اس سے میری یہ غرض نہیں کہ میں جو کچھ لکھوں اسے آپ لازماً صحیح سمجھیں، آپ کو کامل آزادی ہے کہ میرے کسی بیان کو کلاً یا جزءً قبول نہ کریں۔

افسوس کا حال دکنی تذکروں میں ملیگا، شمالی ہند کے شاید ہی کسی تذکرے میں اس کا حال ہو۔ دو دکنی تذکرے "بہار و خزاں" اور "ریاض حسینی" (نام ٹھیک یاد نہیں) ابھی نہیں چھپے۔ موزاں کردہی وہی ہے جس کے متعلق آپ نے دریافت کیا ہے۔ ہاشمی صاحب

کا ایک مضمون اس سے متعلق چھپا ہے۔ یہ دونوں تذکرے حیدرآباد میں ہیں۔

اردوئے معلیٰ کے متعلق کچھ فیصلہ ہوا؟ ڈاکٹر... نے، احتشام حسین صاحب کو میری شکایت میں ایک خط لکھا تھا۔ محمد حسنین سے یہ بات معلوم ہوئی۔ ڈاکٹر زور یہاں آئے ہوئے تھے۔ سرگذشت حاتم وہاں ہو تو یہ لکھیں کہ اس میں حاتم کی قدیم ترین غزل جس کا ذکر ہے کونسی ہے۔ اور وہ کس کی غزل کے جواب میں ہے۔

مخلص

عبدالودود

(۴۳)

پٹنہ ۴۔ ادارہ تحقیقات اردو

۲۷/۲ ۵۷ء شفیق مکرم۔ کل آپ کے خط کا جواب دے چکا ہوں۔ کچھ باتیں اور آج لکھتا ہوں۔ آپ کے مضمون میں اس کے سوا کہ حقیقت سے جابجا انحراف ہوا ہے۔ کوئی بات ایسی نہ تھی کہ میری رنجیدگی کا باعث ہوتی، لیکن بعض امور کا قلم انداز ہو جانا (ان کی صراحت میں نہ کروں گا) یہ گمان پیدا کرنے کے لیے کافی تھا کہ ابھی آپ کو محقق بننے کیلیے بہت سے مراحل سے گذرنا ہے۔

اس بات کا آپ نے جواب نہیں دیا کہ میرے ہزار خط آپ کے پاس کہاں سے آئے۔ میں اس طرف ہفتوں سے مختلف قسم کے کاغذات کو الگ الگ کر رہا ہوں۔ اور اس وقت تک صرف خطوط یکجا کر لیے گئے ہیں بلکہ بڑی حد تک یہ کام بھی ہو گیا ہے کہ ذاتی خاص کے خطوط علیحدہ علیحدہ کر لیے جائیں۔ میرے نام [illegible] ذرا میرے پاس جمع ہیں ان کی تعداد کسی طرح تین سو سے زیادہ نہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ دس بیس خط ضائع بھی ہوئے ہیں اس سے زیادہ نہیں۔ اس کی کوئی وجہ نہیں کہ آپ کے ہر خط کے بدلے

ہیں میں نے ۲ خط لکھے ہوں۔ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کے خطوط کی تعداد ۲۰۰ سے زیادہ ہے۔ ڈاکٹر عندلیب شادانی، ڈاکٹر انور، ڈاکٹر فاروقی کے خطوط بھی بہت ہیں۔ شیرانی کے کچھ خط غائب ہو گئے ہیں جو ہیں ان کی تعداد زیادہ نہیں۔ ڈاکٹر عبدالحق کے بہت سے خطوط نکل آئے ہیں، مگر ان کے بیشتر خطوط ضائع ہو گئے۔ کل خطوط ۳ ہزار کے قریب ہوں گے۔ اس میں بہت سے بالکل بیکار ہیں مگر اتنا وقت کہاں کہ انھیں پڑھوں اور یہ فیصلہ کروں کہ کون کارآمد ہے اور کون بے مصرف۔

میں نے اپنے مضامین کے متعلق جو کچھ لکھا تھا، اس کا تعلق کسی ایسے فعل سے نہ تھا جو آپ سے سرزد ہوا ہو۔ انجمن ترقی اردو کو اگر اس نے مجھے اس بارے میں لکھا تو براہ راست جواب دوں گا۔ مگر مجھے اس کی مطلقاً پروا نہیں کہ انجمن کا کوئی خط مضامین کے ثمنوں میں میرے پاس آتا ہے یا نہیں۔ آپ اس سلسلے میں کارکنان انجمن سے کچھ کہیں تو یہ آپ کا معاملہ ہے۔ نہ کہیں تو مجھے اس سے بحث نہیں۔

"تاریخ ادبیات اردو" کے سلسلے میں جو جلسہ علی گڑھ میں ہونے والا ہے اس میں شرکت کے لیے رشید صاحب کا دعوت نامہ آیا ہے۔ مگر اس میں کوئی تاریخ مقرر نہیں کی گئی۔ صرف یہ لکھا ہے کہ مارچ کے دوسرے ہفتے میں جلسہ ہے۔ میں انھیں آج جواب دے رہا ہوں کہ میں شرکت کی کوشش کروں گا۔ میرا ارادہ کلکتہ جانے کا بھی ہے اور اس کے لیے کراچی سے سعید کی واپسی کا منتظر ہوں۔

مخلص ۔ عبدالودود

رشید صاحب کا ۱۰/۲ کا خط کل ملا تھا۔ ممکن ہے میرا خط بھی انھیں دیر سے ملے اور یہ بھی ممکن ہے کہ نہ ملے۔ اگر آپ سے ملاقات ہو تو اس کا ذکر کر دیجیے گا۔ کہ اس بارے میں میں نے آپ کو کیا لکھا ہے۔

(۴۲)

۱۸/۷، ۵، پٹنہ ۴۔

آپ کا خط کل ملا۔ انفلوئنزا کا یہاں بھی بڑا زور رہا، مگر اب کمی ہے۔ آپ کے سوالات کے جواب یہ ہیں۔

(۱) ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی میرے اور ذاکر صاحب کے مشترک دوست ہیں، وہ اسی دن یہاں آئے جس دن ذاکر صاحب پہنچے اور اسی دن دونوں میں ملاقات ہوئی۔ مقدم الذکر سے میرا ملنا ہوا تو انھوں نے کہا کہ ذاکر صاحب آپ کے بہت مشتاق ہیں بلکہ یہ جاننے کے بعد کہ میری آپ کی ملاقات آج ہوگی انھوں نے آپ کو پیغام بھیجا ہے کہ گورنمنٹ ہاؤس میں ان سے ملوں۔ میں "حکام" کی دربارداری خلاف روش سمجھتا ہوں اور میں نے کبھی اس قسم کے لوگوں سے ملنا ضروری نہیں سمجھا، ذاتی تعلقات پہلے سے ہوں تو اور بات ہے۔ ذاکر صاحب کو میں ۱۹۲۳ء سے جانتا تھا، لیکن معمولی تعلقات تھے اور آخری ملاقات کو کم و بیش ۲۰ سال گذر چکے تھے، مجھے ان کے یہاں جانے میں تامل تھا، لیکن سلیم صاحب نے بہت اصرار کیا، اس پر بھی میں ٹال رہا تھا کہ خلیل احمد صاحب سے ملاقات ہوئی اور انھوں نے کہا کہ ذاکر صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ ان کی رائے بھی یہ ہوئی کہ اس میں مضائقہ نہیں تو میں راضی ہو گیا اور خود انھوں نے وقت مقرر کرا کے مجھے اس کی اطلاع دی۔ ذاکر صاحب سے میری ملاقات کم و بیش ایک گھنٹا رہی ہوگی، رسمی گفتگو کے بعد تاریخ ادبیات اردو کا ذکر آیا اور انھوں نے کہا کہ میں اس میں آپ کا تعاون قطعی طور پر ضروری سمجھتا ہوں۔ میں نے انھیں بتایا کہ اسکیم مجھے بالکل پسند نہیں، لیکن میں بشرائط تعاون کے لیے تیار رہا تھا۔ یہ شرطیں منظور کر لی گئی تھیں، مگر بعد کو ان میں سے ایک جو نہایت ضروری

تھی، نظرانداز کر دی گئی ہے اور اس صورت میں میرا تعاون ممکن نہیں۔ ذاکر صاحب نے کہا کہ میں اس کا ضامن ہوں کہ وہ شرط منظور کر لی جائے گی گو اس کے متعلق بعض خاص وجوہ کی بنا پر کوئی باقاعدہ خط یو رڈ کی طرف سے نہیں آئے گا۔ اس کے بعد انکار کی کوئی وجہ باقی نہیں رہی تھی، اور میں نے وعدہ کر لیا کہ جو ابواب میرے سپرد ہوئے تھے ہیں، انھیں لکھوں گا۔ اس سلسلے میں میں نے انھیں بتایا کہ میرے انکار کے بعد یہ ابواب دوسروں کے سپرد کر دیے گئے ہیں۔ اس پر انھوں نے کہا کہ ان لوگوں سے واپس لینے میں کچھ دشواری نہ ہوگی۔ اس کے دو تین دن بعد وہ رانچی چلے گئے۔ اور اب کل کتب خانۂ خدابخش میں ان سے ملاقات ہوگی۔ ادارۂ تحقیقات اردو اور کتب خانۂ خدابخش کا بھی ان سے ذکر آیا تھا۔ اور انھوں نے بغیر اس کے کہ میری طرف سے اس کی خواہش ظاہر کی گئی ہو، یہ کہا تھا کہ میں آپ کے کاموں میں آپ کی مدد دوں گا۔

(۲) یہ ملاقات ذاکر صاحب کی کتاب زندگی کا ایک لفظ ہے۔ ممکن ہے کہ یہ لفظ بہت فصیح ہو اور بالکل برمحل استعمال ہوا ہو، لیکن محض ایک لفظ سے ساری کتاب کے متعلق کوئی رائے قائم کرنا درست نہ ہوگا۔ کم از کم میری یہ روش نہیں۔

(۳) میرا خیال ہے کہ ذاکر صاحب کو وزرا کے مشورے کے بغیر نامزدگی کا حق نہیں اور اس کی کوئی وجہ نہیں کہ وہ میرے حق میں رائے دیں۔ اس سے قطع نظر، میرا مسلک یہ ہے کہ میں کسی سیاسی جماعت، علی الخصوص کانگریس میں شریک نہیں ہو سکتا۔ اس صورت میں ظاہر ہے کہ میری رائے قطعی طور پر آزاد ہوگی۔ یہ سمجھنے کے بعد اگر مجھے نامزد کیا جاتے تو میں قبول کروں گا۔ مگر ایک بات اور ہے: میں سیاسیات سے بہرصورت زیادہ سروکار نہ رکھوں گا۔ اور میرا تعلق زیادہ تر علمی اور تعلیمی مسائل سے رہے گا۔ قبول کرنے کی سب سے بڑی وجہ یہ ہوگی کہ اس طرح مجھے اپنے کام کو آگے بڑھانے کا موقع ملے گا۔ اگر اس مسلک میں

کچھ قباحت ہو تو مجھے ضرور اس کے متعلق لکھیے۔ مطلب یہ کہ شروط طور پر قبول کر نا بھی قبیح ہو تو میں منظور نہ کروں گا اور اس معاملے میں مخلص احباب کی رائے کو نظر انداز نہ کروں گا۔ یہ سب آپ کے سوال کے جواب میں ہے ورنہ میرا خیال وہی ہے جو ابتدا میں میں نے لکھا ہے۔

(۴) معاصر حصہ ۱۰ کے آخری اجزا کا پروف تصحیح کے لیے آیا تھا۔ تین چار دن میں واپس ہو۔ اب اس کی اشاعت میں زیادہ دیر نہ ہو گی۔

(۵) حسن عسکری صاحب غالباً کل کتب خانہ میں ملاقات ہو۔ ان سے داخلے کے بارے میں کہہ دوں گا۔

(۶) رشید صاحب کے دو خط حال میں میرے پاس آئے ہیں، ایک میں انھوں نے اس پر خوشی ظاہر کی ہے کہ میں تعاون کے لیے راضی ہو گیا۔ دوسرے میں انھوں نے لکھا ہے کہ ان حضرات سے جنھیں وہ ابواب جو میں لکھنے والا تھا حوالے کیے گئے تھے، مراسلات ہو رہی ہے۔

کلیاتِ میر طبع کلکتہ کا کوئی نسخہ علی گڑھ میں ہے؟

اس بچے کا حال لکھیے جو مدت سے بیمار چلا آتا تھا۔ اب اس کی صحت کیسی ہے؟ احبابِ علیگڑھ کو سلام۔

مخلص

عبدالودود

(۲۵)

پٹنہ۔ ۴

آپ کے خط کے جواب میں جو خط میں نے لکھا ہے اس کا اتمہ سمجھیں

(۱) جہاں تک میں اندازہ کر سکا ہوں ذاکر صاحب کی تقریر کو لوگوں نے عام طور پر پسند کیا ہے۔ اس وقت تک ان کی تقریریں جو ہوئی ہیں لوگ ان کی تعریف کرتے ہیں، مگر

ایک صاحب نے مجھ سے شکایت کی کہ ہمارے متعلق جوان کی تقریر تھی، اس میں کسی مسلمان کا ذکر نہ تھا۔ میں ہمارا اخبار دیکھتا ہی نہیں یا دیکھتا ہوں تو بہت کم، ان کی تقریریں میری نظر سے بہت کم گزریں۔ اور میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ کسی مسلمان کے ذکر کی توقع بھی تھا یا نہیں۔ مجھے یہ محسوس ہوا ہے کہ ان کی شخصیت میں دلکشی ہے، مگر میں ابھی تک یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس کے وجوہ کیا ہیں۔

(۲) میں نے آپ کے ایک خاص سوال کا جو جواب دیا تھا وہ یہ سمجھ کر کہ اس قسم کے سوال آپ سابق میں بھی کر چکے ہیں اور میں اپنے نقطۂ نظر سے آپ کو مطلع کرتا رہا ہوں غرض صرف یہ کہ آپ اس کے متعلق غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوں۔ سابق خط میں "کام" سے مراد ادبی اور علمی کام ہیں۔

عبدالودود

(۴۶)

۸/۶۵۹

یہ آپ نے صحیح نہیں لکھا کہ بھگونت رائے راحت کا ذکر گلشنِ بیخار میں ہے، فہرستِ اشپرنگر سے راحت کا غیر حاضر ہونا اس پر مشعر ہے کہ اور تذکروں میں بھی جو اشپرنگر کے ماخذ تھے اس کا حال نہیں ملتا۔ دتاسی لکھتا ہے کہ کریم الدین کے تذکرے میں اس کی ایک غزل ہے، اس کا جو نسخہ پیشِ نظر ہے وہ ناقص الآخر ہے اور اس کی فہرست بھی مکمل نہیں۔ اس میں راحت کا ترجمہ یا کلام نہیں اور مجھے یقین ہے کہ ان چند صفحات میں بھی جو اس نسخے سے غائب ہیں، راحت مذکور کا ذکر یا اس کے اشعار نہیں ہیں۔ یہ نسخہ ۴۸۰ صفحے پر ختم ہو جاتا ہے۔ سراپا سخن طبع اول ص ۳۸ میں ہے: بھگونت رائے راحت ولد دینی دیال کاکوروی ہے یا نہیں اس وقت نہیں کہہ سکتا۔ شاگرد امانت صرف ایک شعر۔

دتاسی کی تاریخ ادبیات جلد ۲ صفحہ ۵۴۴ میں ہے: راحت، بھگونت رائے کاکوروی پسرِ دین دیال و شاگردِ امانت، ایک غزل کریم الدین نے نقل کی ہے (صراحتہً تذکرہ کریم الدین نہیں، یہ میرا قیاس ہے کہ تذکرہ مراد ہے) یہ غالباً وہی شاعر ہے جس کا سو سے زیادہ ابیات کا قصیدہ مسمّیٰ بفتح دہلی وحال بغاوت بحمایت انگریزاں مطبع نور الاخبار آگرہ میں ۱۸۵۷ء میں طبع ہوا تھا۔ محسن نے اس کے اشعار کا نمونہ دیا ہے۔ نساخ سخن شعرا میں لکھتے ہیں: راحت ..... بھگونت رائے ولد دین دیال باشندۂ کاکوری شاگردِ امانت، ان کی مثنوی زہرہ و بہرام و نلدمن نظر سے گزری" صفحہ ۱۷۲ وہی ایک شعر جو سراپا سخن میں ہے۔ آثار شعرائے ہنود سامنے نہیں اور میں یہ کہہ نہیں سکتا کہ اس میں ان کا ذکر ہے یا نہیں۔ یہ تذکرہ علی گڑھ میں ہوگا، اسے اور خمخانۂ جاوید کو دیکھیے۔ مؤخر الذکر میں یقین ہے کہ راحت کا ترجمہ ہوگا۔ خواجہ عبدالرؤف عشرت نے آبِ بقا (شعرا) صفحہ ۱۷۶ میں نام، تخلص، ولدیت و وطن وہی دیا ہے جو سخن شعرا میں ہے۔ مگر سالِ وفات بتایا ہے جو نساخ وغیرہ کے یہاں ۱۸۸۴ء عشرت کہہ رہے ان کے بموجب، راحت کے تصانیف حسب ذیل ہیں: نلدمن، مثنوی نعت اردو، مثنوی مدح مالتی، مثنوی زہرہ بہرام، مثنوی بوستان راحت۔ عشرت کے متعلق میری رائے سے آپ ناواقف نہ ہوں گے، میں انھیں قطعاً ساقط الاعتبار سمجھتا ہوں، مگر یہ ضروری نہیں کہ ان کا ہر بیان غلط ہو۔ کتبخانہ خدا بخش میں نل و دمن کا ایک ناقص الآخر نسخہ ملا۔ اس کے صفحہ ا میں صرف نام کتاب ہے، مصنف اور مطبع کا نام نہیں۔ صفحہ ۲ کے ایک مصرع میں تخلص راحت آیا ہے۔

ادارۂ تحقیقات اردو کے کتبخانے میں نل دمن کا کوئی نسخہ ہے یا نہیں، میں اس وقت نہیں کہہ سکتا۔ سعید باڑھ گئے ہوئے ہیں، اور کتبخانہ ان کی غیر حاضری میں بند ہے۔ ان کی واپسی کے بعد اگر کوئی نسخہ وہاں ملا تو اس کا حال لکھوں گا۔

مثنوی … بہرام مصنفہ بھگونت رائے راحت کاکوروی کا ایک قلمی نسخہ نمائش کے لیے یہاں … دوسرا مصرع یہ ہے: "کروں حمد ذاتِ الٰہی بیاں" سالِ تصنیف بقول مصنف … ہے … بلا واسطہ … سے نکلتی ہے = ۱۲۲۱ لیکن فرح یا فرخ کی تاریخ ہے "ہے یہ باغِ بہار" اس سے ۱۲۴۱ مستخرج ہوتا ہے۔ سعید کے واپس آنے کے بعد اور نسخے کو دوبارہ دیکھ کر کوئی کام کی بات نکلی تو لکھوں گا۔ ۱۲۲۱ھ نہیں ۱۲۴۱ ہی ہی۔ سوال یہ ہے کہ کیا اس زمانے میں امانت کی عمر اتنی تھی کہ کوئی شخص خواہ کتنا ہی مبتدی ہو ان کا شاگرد ہو۔ میرا خیال ہے کہ نہیں۔ یاد آتا ہے کہ دیوانِ امانت کے دیباچے میں بتایا گیا ہے کہ وفات کے وقت امانت کی کیا عمر تھی۔ آپ اسے دیکھیے۔

نل دمن مصنفہ راحت کی زبان امانت سے قبل کی زبان ہے ص۵ میں لاچار، ص۶ میں وے، ص۱۶ میں جیوں اور ص۷ میں تس اوپر ہے۔ مثنوی بالاستیعاب پڑھی جائے تو یقین ہے کہ اور الفاظ اور طرقِ استعمال بھی نکلیں گے جو امانت سے قبل رائج تھے یا ان کے ابتدائی زمانے میں متروک ہو چکے تھے۔

یاد آتا ہے کہ سحر ہنگامی نے نل دمن لکھی ہے، مگر وہ زمانہ حال کے شاعر ہیں۔ راحت کے علاوہ کوئی اور قدیم شاعر اس وقت ذہن میں نہیں جس نے نل دمن کا قصہ نظم کیا ہو۔

اس خط کی رسید سے مطلع کیجیے۔

عبدالودود

(۴۷)

۲؍ اگست ۶۰

پٹنہ ۴۔

عزیزی مختار۔ آپ کا آخری خط میرے خط کے جواب میں

اسٹرائک سے قبل ملا تھا۔ اور میں نے فوراً اس کا جواب دیا تھا۔ آپ کی خاموشی سے گمان ہوتا ہے کہ خط آپ کو نہ ملا۔ اس زمانے میں بہت خط غائب ہوئے ہیں۔ میں نے آپ کو لکھا تھا کا سلاک اسٹڈیز کانفرنس کے مطبوعہ قواعد بھجوائیے۔ یہ اب تک نہیں آئے۔ طارق اب کیسے ہیں، اور ڈاکٹروں نے کوئی قطعی بات کہی یا نہیں ؟

لوگن ویلیا کے درخت علی گڑھ میں بہت ہیں۔ آپ براہ کرم جلد مطلع کریں کہ اس کے چھوٹے پودے جو یہاں آسکیں اور لگائے جاسکیں، وہاں کس قیمت پر ملتے ہیں اور کس کس رنگ کے ملتے ہیں۔ وہاں جو رنگ عام طور پر نظر آتا ہے، فالسائی ہے۔ اس رنگ کے پودے یہاں نہیں ملتے۔

امید ہے کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔

خیر طلب

عبدالودود

(۴۸)

۲۹
۱۹۶۱

پٹنہ ۴ ۔ عزیزی مختار ۔

خط ملا۔ شیخ وزیرالدین وہی ہوں گے جن کا ذکر غالب کے خطوط میں ہے، اگر کوئی معمولی آدمی تھے۔ زیادہ توجہ کے مستحق نہیں۔ ان کے خطوط اس کا حقدار ٹھہراتے ہوں تو اور بات ہے۔

اغلاط کی فہرست بھیج چکا ہوں، ملی ہوگی۔

میں کوئی تحقیقی رسالہ جس میں تحقیقی مضامین ہوں نکالنا نہیں چاہتا۔ ایک مختصر سا رسالہ (سہ ماہی یا چہار ماہی) ایسا نکالنا چاہتا ہوں جو تحقیقات (متعلق اردو) سے تعلق رکھے

والوں میں رابطہ پیدا کرسکے۔ اس میں یہ بتایا جائیگا کہ کن موضوعات پر تحقیق ہو چکی ہے اور کن پر ہو رہی ہے۔ سوالات اور ان کے جوابات ہوں گے۔ کتب خانوں کا جائزہ لیا جائیگا۔ اور آگے چل کر تحقیقی مضامین کا جو دوسرے رسالوں میں شائع ہوں، خلاصہ شائع ہوگا۔
قیمت اس کی دو رُپے سالانہ ہوگی اور نام "تحقیق" نہیں، "تحقیقات" ہوگا۔

"دیوانِ کبیر" پر جو صاحب کام کرنا چاہتے ہیں میں نے ان سے کہہ دیا ہے کہ آپ نے عکس کے بارے میں کچھ جواب نہیں دیا، وہ چاہیں تو لندن سے منگوائیں۔ یہ بات کہ آپ کا ارادہ اس کے مرتب کرنے کا ہوگا، میرے ذہن میں تھی۔ مگر میرا خیال ہے کہ وہ کتاب آپ کے لیے موزوں نہیں۔ اس کے وجوہ ملاقات کے وقت بیان کر دوں گا۔

بچے آج کل کیسے ہیں؟ ہاں آپ کی یونیورسٹی کے چانسلر آئے ہوتے تھے علی گڑھ کے قدیم طلبہ نے انھیں ایٹ ہوم دیا، ادارۂ تحقیقات اردو نے بھی انھیں بلایا تھا۔ اور اس موقع پر ایک مختصر سی نمائش بھی ہوئی تھی۔

علی گڑھ سے کوئی اطلاع تاریخ جلسہ کے متعلق نہیں آئی ہے۔

خیر طلب

عبد الودود

(۷۹)

پٹنہ ۴ - ۲۰ ستمبر ۶۵ء

عزیزی، کل اوراق مرسلہ کا رجسٹرڈ پیکٹ روانہ کیا جا رہا ہے۔
بہت سے حواشی لاحاصل ہیں، آپ ترجیح بلا مرجح کے مرتکب ہوتے ہیں، بہت سے الفاظ حواشی سے محروم ہیں۔ ہمزہ مکسور الف کے نیچے لکھا گیا ہے، عربی میں ہوگا مگر اردو کی کتابوں میں یہ دستور نہیں، سوال یہ ہے کہ ہمزۂ مضموم کا کیا حشر ہوگا۔ آیاتِ قرآنی

خاص طور پر لکھے جاتے ہیں اور تتبع واجب ہے، آپ دیکھ لیں کہ کتابت قرآن کے مطابق ہوئی ہے یا نہیں۔

اگر آپ یہ چاہتے ہوں (اور جہاں تک مجھے یاد ہے آپ نے ایک بار یہ کہا تھا) کہ میں مقدمہ لکھوں تو مطبوعہ اوراق بھیجے جائیں کہ میں انھیں دیکھتا رہوں۔

نذیر صاحب شاید، ۲ ستمبر کو پٹنہ آئیں۔

آیات قرآنی و احادیث و فہرست کتب کی طرف میں نے توجہ نہیں کی۔

خیر طلب

قاضی عبدالودود

(۵۰)

۲۱/۵ ۶۸ء عزیزی،

آپ کا خط ملا۔ بہت خوشی ہوئی کہ آپ صدر شعبہ ہو گئے۔ آپ کو علی گڑھ کے صدور کو نمونہ نہیں بنانا چاہیے، خود آپ کی یونیورسٹی آکسفرڈ میں جو صدر شعبہ رہا ہو اس کے نقش قدم پر چلیے۔

اس ملک کا باوا آدم ہی نرالا ہے۔ آپ اسے مخاطب کرکے یہ کہہ سکتے ہیں کہ "اونٹ رے اونٹ تیری کون سی کل سیدھی ہے" اساتذہ کا زیادہ وقت ارباب اقتدار کی خوشامد اور دربار داری میں صرف ہوتا ہے، اور ہمیشہ یہ فکر رہتی ہے کہ کس طرح ممتحن بن کر دوسری یونیورسٹیوں میں جا سکیں اس سے طلبہ کا جو نقصان ہوتا ہے اس کی انھیں مطلقاً فکر نہیں ہوتی۔ چند روز ہوتے کلیم الدین احمد صاحب یہاں آئے تھے میں نے ان سے پوچھا کہ کیا آپ نے کیمبرج میں یہ دیکھا کہ معلمین نے کسی دوسری جگہ جانے کے لیے لکچر ناغہ کیا ہو۔ انھوں نے مجھ سے اتفاق کیا کہ بطور شاذ

کبھی ایسا نہیں ہوا۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ دوسری جگہ جانا ہو تو تعطیل لی جاتا ہو؟

آپ کو میرا خاص طور پر یہ مشورہ ہے کہ ہمہ گیری کا خیال ترک کیجیئے۔ زیادہ نہ لکھیں تو مضائقہ نہیں۔ جو کچھ لکھیں وہ ایسا ہو کہ اس پر اعتراض کی گنجائش نہ ہو۔ اتفاقی غلطی اور بات ہے۔ خود نمائی سے جہاں تک ممکن ہو بچیں۔ بعض اوقات یہ بہت بدنما ہو جاتی ہے۔ دوسروں کے متعلق خواہ دوست ہوں یا دشمن آپ سچی بات لکھ سکتے ہیں، لیکن، اسے مبالغے سے بالکل خالی ہونا چاہیئے۔

یہ سب باتیں اس لیے لکھ رہا ہوں کہ آپ کو اپنا عزیز سمجھتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ آپ ایک مثالی صدر شعبہ ہوں۔ آپ پٹنہ آ رہے ہیں؟ مجھے اب تک سیائیٹکا سے نجات نہیں ملی۔

امید ہے کہ آپ کی دلہن اور آپ کے بچے بخیریت ہوں گے۔

خیر طلب

عبدالودود

ہاں، ادارۂ تحقیقات اردو کی طرف سے ایک کتاب جلد شائع ہوگی اس کا نام "غالب اور بہار" ہوگا۔ آپ اپنا مختصر حالات زندگی (ولدیت، سال ولادت، تعلیم، موجودہ عہدہ) کے ساتھ اپنے کل مضامین یا کتب متعلق غالب کی فہرست اس تصریح کے ساتھ کہ کون سی چیز کب اور کہاں چھپی بھیجدیں۔ ممنون ہوں گا۔

محمد ذکی الحق
محمد منصور عالم

مقالات قاضی عبدالودود کی فہرست

قاضی عبدالودود صاحب پچھلے چالیس برسوں سے متواتر لکھتے رہے ہیں۔ ان کے مضامین ہند و پاک کے معروف رسالوں میں شائع ہوئے ہیں۔ (فہرست دیکھنے سے یہ معلوم ہو جائے گا) مطالعے کی کثرت اور حافظے کی تیزی سے انھوں نے جو کچھ حاصل کیا اس کا اکثر و بیشتر حصہ منظر عام پر آ گیا ہے۔ اب یہ ہمارا کام ہے کہ اس سے استفادہ کریں۔

قاضی صاحب کے زیادہ تر مضامین "معاصر" پٹنہ میں شائع ہوئے ہیں۔ انھوں نے نہ جانے کتنے مضامین لکھے ہوں گے۔ ذیل میں جو فہرست دی جا رہی ہے، وہ مکمل نہیں۔ وقت کی کمی کے باعث پوری تلاش نہ ہو سکی۔ لیکن اس فہرست سے یہ بات ظاہر ہو جائے گی کہ قاضی صاحب کے مضامین کی تعداد دو سو ہے۔ اور یہ امر بھی واضح ہو جائے گا کہ ان کے مضامین کی نوعیت، قیمت اور کمیت کیا ہے۔ (یہاں عیار ستان کے تبصرے اور ان کی دوسری تصنیفات مثلاً دیوان جوشش، قطعات دلدار، تذکرہ مشعرا ابن امین اللہ طوفان، شہر آشوب قلق وغیرہ شامل نہیں کیے گئے ہیں۔)

فہرست ذیل میں مقالوں کے عنوانات کی ترتیب حروف تہجی کے مطابق ہے

نمبر شمار	مقالہ	رسالہ
۱	آب حیات اور طبقات الشعرا۔	معاصر، پٹنہ۔ حصہ ۴
۲	آب حیات کے دو ماخذ	" " حصہ ۱
۳	آزاد بحیثیت محقق ۱	سہ ماہی، نوائے ادب، بمبئی۔ اپریل سنہ ۱۹۵۶ء
۴	آزاد بحیثیت محقق ۲	سہ ماہی، نوائے ادب، بمبئی۔ جولائی سنہ ۱۹۵۶ء
۵	آزاد بحیثیت محقق ۳	سہ ماہی، نوائے ادب، بمبئی اکتوبر سنہ ۱۹۵۶ء
۶	آصف الدولہ کا جشن ہولی اور افسوس کی مثنوی	معاصر، پٹنہ۔ حصہ ۱
۷	آوارہ گرد اشعار	معاصر، پٹنہ۔ حصہ ۱
۸	آوارہ گرد اشعار	معاصر، پٹنہ۔ حصہ ۲
۹	اردو انڈین کرانیکل، پٹنہ۔	معاصر، پٹنہ۔ حصہ ۳
۱۰	اردو بہار ہیرلڈ و انڈین کرانیکل	معاصر، پٹنہ۔ حصہ ۵
۱۱	اردو کا پہلا تاریخی ناول	معاصر، پٹنہ۔ حصہ ۲
۱۲	اردو کا پہلا واسوخت	ماہنامہ معاصر، پٹنہ۔ ستمبر سنہ ۱۹۴۱ء
۱۳	استر اور غالب۔	
۱۴	استفسارات	ماہنامہ معاصر، پٹنہ۔ اگست سنہ ۱۹۴۱ء
۱۵	اسعد الاخبار، آگرہ۔ قسط اول۔	ماہنامہ معاصر، پٹنہ۔ جون سنہ ۱۹۴۲ء

نمبر شمار	مقالہ	رسالہ
۱۶	اسعد الاخبار، آگرہ۔ قسط دوم	ماہنامہ معاصر، پٹنہ۔ جولائی ۱۹۴۲ء
۱۷	اسعد الاخبار، آگرہ۔ قسط سوم	ماہنامہ معاصر، پٹنہ۔ اگست ۱۹۴۲ء
۱۸	اسعد الاخبار، آگرہ۔ قسط چہارم	ماہنامہ معاصر، پٹنہ۔ ستمبر ۱۹۴۲ء
۱۹	اسعد الاخبار، آگرہ۔ قسط پنجم	ماہنامہ معاصر، پٹنہ۔ اکتوبر ۱۹۴۲ء
۲۰	اسعد الاخبار، آگرہ۔ قسط ششم	ماہنامہ معاصر، پٹنہ۔ نومبر ۱۹۴۲ء
۲۱	اسعد الاخبار، آگرہ۔ قسط ہفتم	ماہنامہ معاصر، پٹنہ۔ دسمبر ۱۹۴۲ء
۲۲	اسعد الاخبار، آگرہ۔ قسط ہشتم	ماہنامہ معاصر، پٹنہ۔ جنوری ۱۹۴۳ء
۲۳	اسلاف درد	
۲۴	اشارات۔	ماہنامہ معاصر، پٹنہ۔ فروری ۱۹۴۱ء
۲۵	اشارات۔	ماہنامہ معاصر، پٹنہ۔ مارچ ۱۹۴۱ء
۲۶	اشارات۔	ماہنامہ معاصر، پٹنہ۔ فروری ۱۹۴۲ء
۲۷	اشارات۔	ماہنامہ معاصر، پٹنہ۔ اگست ۱۹۴۲ء
۲۸	اشارات۔	ماہنامہ معاصر، پٹنہ، مئی جون ۱۹۴۳ء
۲۹	اصول تحقیق	ماہنامہ آج کل، دہلی۔ اردو تحقیق نمبر، اگست ۱۹۶۷ء
۳۰	اقتباس سفینۂ خوشگو	نوائے ادب بمبئی۔ جولائی ۱۹۵۰ء
۳۱	ایلیچ ۱۹۰۲ء	معاصر، پٹنہ۔ حصہ ۱۷
۳۲	انتخاب دیوان آنندرام مخلص	سہ ماہی نوائے ادب، بمبئی۔ اکتوبر ۱۹۵۰ء

نمبر شمار	مقالہ	رسالہ
۳۳	انشا کا غیر مطبوعہ کلام	معاصر، پٹنہ۔ حصہ ۸
۳۴	انشا کی مثنوی خالص ہندوستانی زبان میں	معاصر، پٹنہ۔ حصہ ۱
۳۵	انشائے مومن	معاصر، پٹنہ۔ حصہ ۱۶
۳۶	انشائے مومن	معاصر، پٹنہ۔ حصہ ۱۷
۳۷	ایک انگریز مستشرق کا سرقہ	معاصر، پٹنہ۔ حصہ ۱
۳۸	ایک قدیم بیاض کے منتخبات	معاصر، پٹنہ۔ حصہ ۱۴
۳۹	ایک قدیم ناول، نقش طاؤس	معاصر، پٹنہ۔ حصہ ۲
۴۰	بخشی الملک راجا الفت رائے بہادر الفت	
۴۱	برہان قاطع اور ہندوستان ۱	سہ ماہی نوائے ادب۔ بمبئی اکتوبر ۱۹۶۳ء
۴۲	برہان قاطع اور ہندوستان ۲	سہ ماہی۔ نوائے ادب۔ بمبئی اپریل ۱۹۶۵ء
۴۳	بزم خاص	معاصر، پٹنہ۔ حصہ ۲
۴۴	بزم معاصر۔	معاصر، پٹنہ۔ حصہ ۵
۴۵	بزم معاصر۔	معاصر، پٹنہ۔ حصہ ۷
۴۶	بزم معاصر	معاصر، پٹنہ۔ حصہ ۹
۴۷	بشارۃ الامامۃ قسط اول	ماہنامہ معاصر، پٹنہ، اپریل ۱۹۴۲ء

نمبر شمار	مقالہ	رسالہ
۴۸	بشارۃ الامامۃ قسط دوم	ماہنامہ معاصر، پٹنہ۔ مئی ۱۹۴۲ء
۴۹	بشندر ابن راقم	
۵۰	"بہار" (ماہنامہ)	ماہنامہ اشارہ، پٹنہ۔ نومبر ۱۹۶۰ء
۵۱	بہار میں اردو زبان وادب کا ارتقا از ڈاکٹر سید اختر احمد اورینوی۔ ۱	سہ ماہی نوائے ادب، بمبئی اکتوبر ۱۹۵۸ء
۵۲	بہار میں اردو زبان وادب کا ارتقا از ڈاکٹر سید اختر احمد اورینوی۔ ۲	سہ ماہی۔ نوائے ادب۔ بمبئی جنوری ۱۹۵۹ء
۵۳	بہار میں اردو زبان وادب کا ارتقا از ڈاکٹر سید اختر احمد اورینوی۔ ۳	سہ ماہی۔ نوائے ادب۔ بمبئی اپریل ۱۹۵۹ء
۵۴	بہار میں اردو زبان وادب کا ارتقا از ڈاکٹر سید اختر احمد اورینوی۔ ۴	سہ ماہی۔ نوائے ادب۔ بمبئی جولائی ۱۹۵۹ء
۵۵	بہار میں اردو زبان وادب کا ارتقا از ڈاکٹر سید اختر احمد اورینوی۔ ۵	سہ ماہی۔ نوائے ادب۔ بمبئی اکتوبر ۱۹۵۹ء
۵۶	بیاض عنایت حسین خاں مہجور	سہ ماہی۔ نوائے ادب۔ بمبئی جنوری ۱۹۶۰ء

نمبر شمار	مقالہ	رسالہ
۷۰	تذکرۂ صادقہ اور لسان الصدق	ماہنامہ آج کل ۔ دہلی ۔ جون ۱۹۵۹ء
۷۱	تذکرۂ مسرت افزا مصنفہ ابوالحسن (ترتیب)	معاصر ۔ پٹنہ ۔ حصہ ۵
۷۲	تذکرۂ مسرت افزا مصنفہ ابوالحسن (ترتیب)	معاصر ۔ پٹنہ ۔ حصہ ۶
۷۳	تذکرۂ مسرت افزا مصنفہ ابوالحسن (ترتیب)	معاصر ، پٹنہ ۔ حصہ ۷
۷۴	تذکرۂ مسرت افزا ۔ ابوالحسن (ترتیب)	معاصر ، پٹنہ ۔ حصہ ۸
۷۵	تذکرۂ مسرت افزا ۔	معاصر ، پٹنہ حصہ ۱۴
۷۶	تذکرۂ یوسف علی خاں	سہ ماہی ، نوائے ادب ۔ بمبئی ۔ اپریل ۱۹۵۱ء
۷۷	تعارف	ماہنامہ معیار ، بانکی پور ، پٹنہ مارچ ۱۹۳۶ء
۷۸	تعارف	ماہنامہ معیار ، بانکی پور ، پٹنہ ۔ مئی ۱۹۳۶ء
۷۹	تعین زمانہ	معاصر ، پٹنہ ۔ حصہ ۱
۸۰	تعین زمانہ	معاصر ، پٹنہ ۔ حصہ ۲
۸۱	تعین زمانہ	معاصر ، پٹنہ ۔ حصہ ۸
۸۲	تعین زمانہ	معاصر ، پٹنہ ۔ حصہ ۱۰
۸۳	تعین زمانہ	معاصر ، پٹنہ ۔ حصہ ۱۸
۸۴	تعین زمانہ	معاصر ، پٹنہ ۔ حصہ ۲۳
۸۵	توضیحات	ماہنامہ نیا دور ، لکھنؤ ، نومبر ۱۹۵۹ء
۸۶	تیغ تیز	سہ ماہی ۔ فکر و نظر ، علیگڑھ ۔ جولائی ۱۹۶۱ء
۸۷	جہان غالب	معاصر ، پٹنہ ۔ حصہ ۱
۸۸	جہان غالب	معاصر ، پٹنہ ۔ حصہ ۲

نمبر شمار	مقالہ	رسالہ
۵۷	بیدل اور تذکرۂ خوشگو	معارف اعظم گڑھ۔ مئی ۱۹۴۲ء
۵۸	بیدل اور تذکرۂ خوشگو	معارف اعظم گڑھ۔ جولائی ۱۹۴۲ء
۵۹	پٹنہ ہرکارہ ۱۸۵۵ء و ۱۸۵۶ء	معاصر، پٹنہ۔ حصہ ۱۵
۶۰	تاریخ ادبیات ہندوی و ہندوستانی	سہ ماہی صحیفہ لاہور۔ دسمبر ۱۹۵۷ء
۶۱	تاریخ ادبیات اردو مصنفہ ڈاکٹر محمد صادق	سہ ماہی نوائے ادب بمبئی۔ اکتوبر ۱۹۶۷ء
۶۲	تاریخ ادبیات ہندوی و ہندوستانی اردو تاسی (اشاعت ۱)	معاصر، پٹنہ۔ حصہ ۱۱
۶۳	تبصرہ مخطوط غالب	ماہنامہ معاصر، پٹنہ۔ اکتوبر ۱۹۴۳ء
۶۴	تبصرہ مخطوط غالب	ماہنامہ معاصر، پٹنہ۔ جولائی ۱۹۴۴ء
۶۵	تبصرۂ کتب (تاریخ صحافت اردو۔ مصحفی اور ان کا کلام)	معاصر پٹنہ، حصہ ۷
۶۶	تبصرۂ کتب (مطالعۂ غالب از مرزا جعفر علی خان اثر۔ ولی گجراتی از ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی)	معاصر، پٹنہ۔ حصہ ۸
۶۷	تذکرۃ الابرار (خلاصہ)	معاصر، پٹنہ۔ حصہ ۱۸
۶۸	تذکرۃ الاسلاف	سہ ماہی۔ نوائے ادب۔ بمبئی جنوری ۱۹۶۳ء
۶۹	تذکرۂ شورش	

رسالہ	مقالہ	نمبر شمار
معاصر۔ پٹنہ۔ حصہ ۴۰	جہانِ غالب	۸۹
معاصر۔ پٹنہ۔ حصہ ۷	جہانِ غالب	۹۰
معاصر۔ پٹنہ۔ حصہ ۹	جہانِ غالب	۹۱
معاصر۔ پٹنہ۔ حصہ ۲۳	جہانِ غالب	۹۲
دو ماہی مطالعہ پٹنہ۔ مئی جون ۱۹۶۹ء	جہانِ غالب	۹۳
دو ماہی مطالعہ پٹنہ۔ مارچ اپریل ۱۹۷۰ء	جہانِ غالب	۹۴
معاصر۔ پٹنہ۔ حصہ ۷	چند الفاظ	۹۵
ماہنامہ صبح نو، پٹنہ۔ مارچ، اپریل ۱۹۶۳ء	چند الفاظ اور طرق استعمال	۹۶
ماہنامہ نقوش لاہور۔ خاص نمبر۔ اکتوبر، نومبر، دسمبر ۱۹۶۶ء	حافظ اور زوال فارسی	۹۷
معاصر۔ پٹنہ۔ حصہ ۱۸	حواشی	۹۸
سہ ماہی، نوائے ادب، بمبئی جولائی و اکتوبر ۱۹۵۱ء	خاتمہ خلاصۃ الافکار	۹۹
معاصر، پٹنہ۔ حصہ ۱۶	خاش اور خاشاک اور غالب	۱۰۰
ماہنامہ اشارہ پٹنہ۔ اگست ۱۹۶۳ء	خواجہ عبدالرؤف عشرت۔	۱۰۱
	داستان عشاق	۱۰۲
ماہنامہ تحریک۔ دہلی۔ بیس سالہ انتخاب نمبر اگست ۱۹۷۳ء	درد اور شاد	۱۰۳
ماہنامہ آج کل، دہلی۔ اکتوبر ۱۹۶۰ء	درد دل مصنفہ خواجہ میر درد	۱۰۴

نمبر شمار	مقالہ		رسالہ
۱۰۵	دریائے لطافت		ماہنامہ معیار۔ بانکی پور پٹنہ۔ مارچ ۱۹۳۶ء
۱۰۶	دریائے لطافت		ماہنامہ معیار۔ بانکی پور پٹنہ مئی ۱۹۳۶ء
۱۰۷	دریائے لطافت		ماہنامہ معیار، بانکی پور پٹنہ، جولائی اگست ۱۹۳۶ء
۱۰۸	دساتیر		ماہنامہ نقوش لاہور، سالنامہ ۱۹۶۶ء
۱۰۹	دہ مجلس فضلی		معاصر، پٹنہ، حصہ ۴
۱۱۰	دیوان آغا علی خاں مہر لکھنوی		ماہنامہ نیا دور، لکھنؤ اسپیشل نمبر ۱۹۶۱ء
۱۱۱	دیوان افسر		نگار، رامپور۔ مارچ ۱۹۶۳ء
۱۱۲	دیوان اوج	۱	معاصر، پٹنہ۔ حصہ ۱۳
۱۱۳	دیوان اوج	۲	معاصر، پٹنہ۔ حصہ ۱۴
۱۱۴	دیوان ترابی		
۱۱۵	دیوان جوشش		ماہنامہ معیار، بانکی پور پٹنہ۔ مارچ ۱۹۳۶ء
۱۱۶	دیوان دوم معروف		ماہنامہ معیار، بانکی پور پٹنہ۔ مئی ۱۹۳۶ء
۱۱۷	دیوان رضا		ماہنامہ معاصر، پٹنہ۔ مئی ۱۹۴۲ء
۱۱۸	دیوان راغب		ماہنامہ معیار، بانکی پور پٹنہ جولائی، اگست ۱۹۳۶ء
۱۱۹	دیوان غالب کے دو نسخے		معاصر، پٹنہ۔ حصہ ۱۲
۱۲۰	دیوان غالب کے دو نسخے		معاصر، پٹنہ۔ حصہ ۱۳

نمبر شمار	مقالہ	رسالہ
۱۲۱	دیوان نجیب الدین جرباذقانی	
۱۲۲	دیوان نوا	ماہنامہ نقوش لاہور۔ جنوری ۱۹۶۲ء
۱۲۳	دیوان نوازش	ماہنامہ آج کل، دہلی۔ جولائی ۱۹۶۲ء
۱۲۴	دیوان نوعی	سہ ماہی فکر و نظر، علی گڑھ، اکتوبر ۱۹۶۰ء
۱۲۵	دیوان یقین مرتبہ مرزا فرحت اللہ بیگ مرحوم (۱)	ماہنامہ اشارہ پٹنہ۔ جنوری تا فروری ۱۹۶۳ء
۱۲۶	ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی	ہفتہ وار اورنگ، پٹنہ ۸-۱۵ اپریل ۱۹۶۶ء
۱۲۷	رباعی بیدل معروف بہ نرگستان	معاصر، پٹنہ۔ حصہ ۲
۱۲۸	روز روشن۔ شعرائے فارسی گو کا ایک تذکرہ	بہار کی خبریں، آزادی نمبر۔ ۱۹۶۱ء
۱۲۹	زبان شناسی ۱	معاصر، پٹنہ۔ حصہ ۲۵
۱۳۰	زبان شناسی ۲	معاصر، پٹنہ۔ حصہ ۲۶
۱۳۱	سال وفات آبرو	ماہنامہ معیار، بانکی پور پٹنہ۔ مارچ ۱۹۳۶ء
۱۳۲	سال وفات حاتم	ماہنامہ معیار، بانکی پور پٹنہ۔ مئی ۱۹۳۶ء
۱۳۳	سراج المعرفت	سہ ماہی فکر و نظر، علی گڑھ۔ اپریل ۱۹۶۲ء
۱۳۴	سراج نظم مصنفہ ناسخ	معاصر، پٹنہ۔ حصہ ۲
۱۳۵	سفر آشوب	معاصر، پٹنہ۔ حصہ ۱۷
۱۳۶	سفینۂ ہندی	سہ ماہی نوائے ادب، بمبئی۔ اکتوبر ۱۹۵۷ء

نمبر شمار	مقالہ	رسالہ
۱۳۷	سنتوکھ رائے بیتاب دہلوی۔	معاصر، پٹنہ۔ حصہ ۲
۱۳۸	سودا اور مکین	معاصر، پٹنہ۔ حصہ ۱
۱۳۹	سودا کے کبت	معاصر، پٹنہ۔ حصہ ۱
۱۴۰	شاد عظیم آبادی اور حیدرآباد	ماہنامہ تحریک دہلی۔ مارچ ۱۹۶۴ء
۱۴۱	شاد کی کہانی شاد کی زبانی	اشتر و سوزن
۱۴۲	شاہ کمال علی کمال ۱	ماہنامہ معاصر۔ پٹنہ۔ مئی ۱۹۴۱ء
۱۴۳	شاہ کمال علی کمال ۲	ماہنامہ معاصر۔ پٹنہ۔ جون ۱۹۴۱ء
۱۴۴	شاہ کمال علی کمال ۳	ماہنامہ معاصر۔ پٹنہ۔ جلائی ۱۹۴۱ء
۱۴۵	شاہ کمال علی کمال ۳ الف	ماہنامہ معاصر۔ پٹنہ۔ اگست ۱۹۴۱ء
۱۴۶	شاہ کمال علی کمال ۳ ب	ماہنامہ معاصر۔ پٹنہ۔ ستمبر ۱۹۴۱ء
۱۴۷	شاہ کمال علی کمال ۳ ج	ماہنامہ معاصر۔ پٹنہ۔ اکتوبر ۱۹۴۱ء
۱۴۸	شاہ کمال علی کمال ۴	ماہنامہ معاصر۔ پٹنہ۔ نومبر ۱۹۴۱ء
۱۴۹	شاہ کمال علی کمال ۵	ماہنامہ معاصر۔ پٹنہ۔ دسمبر ۱۹۴۱ء
۱۵۰	شاہ کمال علی کمال ۶	ماہنامہ معاصر۔ پٹنہ۔ مارچ ۱۹۴۲ء
۱۵۱	شاہ کمال علی کمال	ماہنامہ معاصر۔ پٹنہ۔ فروری ۱۹۴۳ء
۱۵۲	شمشیر تیز تر	ماہنامہ نقوش لاہور۔ اگست ۱۹۶۱ء
۱۵۳	شمع محفل	معاصر۔ پٹنہ۔ حصہ ۱۸
۱۵۴	صحت متن	ماہنامہ تحریک دہلی
۱۵۵	صوبۂ بہار، گیارہویں صدی کی اردو	ماہنامہ معیار، بانکی پور پٹنہ۔ مارچ ۱۹۳۶ء

نمبر شمار	مقالہ	رسالہ
۱۵۶	ضاحک	علی گڑھ میگزین ۔ ظرافت نمبر
۱۵۷	طبقات الشعرائے ہند	معاصر، پٹنہ ۔ حصہ ۹
۱۵۸	عبدالحق بحیثیت محقق ۱	معاصر، پٹنہ ۔ حصہ ۱۳
۱۵۹	عبدالحق بحیثیت محقق ۲	معاصر، پٹنہ ۔ حصہ ۱۴
۱۶۰	عبدالحق بحیثیت محقق ۳	معاصر، پٹنہ ۔ حصہ ۱۵
۱۶۱	عمدۂ منتخبہ یعنی تذکرۂ سرور	اشتر و سوزن
۱۶۲	عہد شاہجہاں کا ایک ادبی مناقشہ اور غالب	معاصر ۔ پٹنہ ۔ حصہ ۵
۱۶۳	غالب (پنج آہنگ ۔ غالب کے دو لطیفے، سراپا سخن اور غالب، تذکرۂ سرور اور غالب)	ماہنامہ معیار، بانکی پور، پٹنہ جولائی، اگست ۱۹۳۶ء
۱۶۴	غالب اور بہار	دو ماہی مطالعہ ۔ پٹنہ ۔ جنوری فروری ۱۹۶۹ء
۱۶۵	غالب اور "تپش"	
۱۶۶	غالب بحیثیت محقق	نقد غالب، مرتبہ مختار الدین احمد
۱۶۷	غالب کے اشعار فارسی کا ایک مجموعہ	سہ ماہی فکر و نظر ۔ علیگڑھ ۔ اپریل ۱۹۶۰ء
۱۶۸	غالب کے بارے میں بعض وضاحتی امور	ماہنامہ نقوش لاہور ۔ غالب نمبر ۔ فروری ۱۹۶۹ء
۱۶۹	غالب کے فارسی خطوط (ایک نیا مجموعہ)	ماہنامہ ماہ نو ۔ کراچی ۔ فروری ۱۹۶۲ء
۱۷۰	غالب کے کلیات نظم فارسی کا قدیم ترین موجودہ نسخہ	مجلہ علوم اسلامیہ علیگڑھ ۔ دسمبر ۱۹۶۰ء

نمبر شمار	مقالہ	رسالہ
۱۷۱	غالب کی غزل گوئی کے پانچ دور	دو ماہی مطالعہ پٹنہ جنوری، فروری ۱۹۶۹ء
۱۷۲	غالب نے اردو میں خط و کتابت کب سے شروع کی	
۱۷۳	غیر مطبوعہ کلام میر، قصیدہ در شکایت نفاق یاران زماں	
۱۷۴	فارسی تذکرے اور ریختہ گو شعرا	سہ ماہی، نوائے ادب، بمبئی، اپریل ۱۹۵۶ء
۱۷۵	قصیدۂ مصحفی	ماہنامہ معاصر، پٹنہ، نومبر ۱۹۴۲ء
۱۷۶	قصائد مصحفی	ماہنامہ معاصر، پٹنہ، جولائی اگست ۱۹۴۲ء
۱۷۷	قطعات جوشش	ماہنامہ معاصر، پٹنہ، فروری ۱۹۴۱ء
۱۷۸	کچھ انشا کے بارے میں	سہ ماہی، نوائے ادب، بمبئی جنوری ۱۹۵۱ء
۱۷۹	کچھ انشا کے بارے میں	سہ ماہی، نوائے ادب، بمبئی، اکتوبر ۱۹۵۳ء
۱۸۰	کچھ سودا کے بارے میں	معاصر، پٹنہ، حصہ ۲
۱۸۱	کچھ میر حسن کے بارے میں	پندرہ روزہ، بہار کی خبریں، پٹنہ جنوری ۱۹۶۱ء
۱۸۲	کریم الدین اور گارساں دتاسی	دی کالج میگزین، کالج نمبر ۱۹۵۳ء
۱۸۳	کلام ثابت	ماہنامہ معاصر، پٹنہ، جولائی ۱۹۴۲ء
۱۸۴	کلام ولی	ماہنامہ معاصر، پٹنہ، اپریل ۱۹۴۱ء
۱۸۵	کلام دلدار	ماہنامہ معاصر، پٹنہ، دسمبر ۱۹۴۲ء
۱۸۶	کلام راسخ ۱	ماہنامہ معاصر، پٹنہ، ستمبر ۱۹۴۲ء

نمبر شمار	مقالہ	رسالہ
۱۸۷	کلام راسخ ۲	ماہنامہ معاصر پٹنہ۔ اکتوبر ۱۹۴۲ء
۱۸۸	کلام رضا	ماہنامہ معاصر، پٹنہ۔ اکتوبر ۱۹۴۱ء
۱۸۹	کلام ضیاء ثابت عظیم آبادی	ماہنامہ معاصر، پٹنہ۔ اگست ۱۹۴۲ء
۱۹۰	کلام فدوی	ماہنامہ معاصر، پٹنہ۔ جولائی ۱۹۴۱ء
۱۹۱	کلام غلام علی حیدری	ماہنامہ معاصر، پٹنہ۔ جون ۱۹۴۲ء
۱۹۲	کلام میر ضیا	ماہنامہ معاصر، پٹنہ۔ مارچ ۱۹۴۲ء
۱۹۳	کلام نالاں	ماہنامہ معاصر، پٹنہ۔ اگست ۱۹۴۱ء
۱۹۴	کلیات سودا کا خطی نسخہ	سہ ماہی، نوائے ادب، بمبئی جولائی ۱۹۶۱ء
۱۹۵	کلیم الدین احمد	ماہنامہ نقوش لاہور۔ جنوری ۱۹۵۵ء
۱۹۶	گلدستۂ بہار	بہار کی خبریں۔ آزادی نمبر۔
۱۹۷	گلدستۂ شعرا۔ پٹنہ	معاصر، پٹنہ۔ حصہ ۱۴
۱۹۸	گلستان سخن	دلی کالج میگزین۔ کالج نمبر ۱۹۵۳ء
۱۹۹	گلشن بیخار۔	نوائے ادب بمبئی، ار
۲۰۰	گلشن سخن۔	معاصر، پٹنہ۔ حصہ ۲۷
۲۰۱	لسانیات	معاصر، پٹنہ۔ حصہ ۱
۲۰۲	لطائف سعادت مصنفہ انشا	معاصر، پٹنہ۔ حصہ ۴
۲۰۳	لکھنؤ کا دبستان شاعری	
۲۰۴	ماہنامہ "ادیب"، پٹنہ	ماہنامہ اشارہ، پٹنہ۔ فروری ۱۹۵۹ء
۲۰۵	متفرقات	ماہنامہ آج کل دہلی۔ اگست ۱۹۵۷ء

نمبر شمار	مقالہ	رسالہ
۲۰۶	مثنوی اکبر علی خاں اکبر	معاصر، پٹنہ۔ حصہ ۱۰
۲۰۷	مثنویات راسخ از ڈاکٹر ممتاز احمد	ہفتہ وار ہماری زبان علیگڑھ نومبر ۱۹۵۵ء
۲۰۸	مثنویات رکن الدین عشق دہلوی	
۲۰۹	مجموعہ اشعار حسین علی خاں شاداں	
۲۱۰	محرق قاطع برہان	سہ ماہی۔ نوائے ادب۔ بمبئی۔ اپریل ۱۹۶۲ء
۲۱۱	محکمہ	ماہنامہ معیار، بانکی پور۔ پٹنہ مارچ ۱۹۳۶ء
۲۱۲	محکمہ	ماہنامہ معیار، بانکی پور، پٹنہ۔ اپریل ۱۹۳۶ء
۲۱۳	محکمہ	ماہنامہ معیار، بانکی پور، پٹنہ۔ مئی ۱۹۳۶ء
۲۱۴	محکمہ (سال وفات نجف خاں وسال آغاز تذکرہ مصحفی (تصحیح دیوان معروف)	ماہنامہ معیار، بانکی پور پٹنہ۔ جون ۱۹۳۶ء
۲۱۵	محکمہ (دریائے لطافت، ایک ایرانی مجتہد اور عظیم آباد، شرف جہاں کا ایک شعر)	ماہنامہ معیار بانکی پور پٹنہ۔ جولائی اگست ۱۹۳۶ء
۲۱۶	مرثیہ ظہور علی خلیق	معاصر، پٹنہ۔ حصہ ۴
۲۱۷	مرزا قتیل	معاصر، پٹنہ۔ حصہ ۴
۲۱۸	مرزا احمد علی ندوی، ان کا عصر، حیات، شاعری اور کلام — از ڈاکٹر سید محمد حسنین	ماہنامہ صنم پٹنہ۔ بہار نمبر ۱۹۵۹ء
۲۱۹	مرگ انیس	معاصر، پٹنہ۔ حصہ ۱
۲۲۰	مرگ دبیر	معاصر، پٹنہ۔ حصہ ۱

نمبر شمار	مقالہ	رسالہ
۲۲۱	مصحفی اور آتش	سہ ماہی۔ اردو ادب علیگڑھ جنوری و اپریل ۱۹۵۱ء
۲۲۲	مصحفی اور جرأت	معاصر، پٹنہ۔ حصہ ۲
۲۲۳	مصحفی اور سودا	سہ ماہی اردو ادب علیگڑھ۔ اکتوبر ۱۹۵۰ء
۲۲۴	مصحفی کا سال وفات	ماہنامہ معارف، اعظم گڑھ۔ اکتوبر ۱۹۳۷ء
۲۲۵	مصحفی کا غیر مطبوعہ قصیدہ	ماہنامہ معاصر، پٹنہ۔ فروری ۱۹۴۳ء
۲۲۶	مصحفی کے قصیدے	ماہنامہ معاصر، پٹنہ۔ مئی۔ جون ۱۹۴۳ء
۲۲۷	مطالعات	معاصر، پٹنہ۔ حصہ ۱۸
۲۲۸	مطبوعات جدیدہ (دیوان معروف دریائے لطافت۔ نکات الشعرا)	ماہنامہ معیار، بانکی پور پٹنہ۔ مارچ ۱۹۳۶ء
۲۲۹	مطبوعات جدیدہ (خطبات ذاکی)	ماہنامہ معیار بانکی پور پٹنہ۔ مئی ۱۹۳۶ء
۲۳۰	مطبوعات جدیدہ (دیوان تاباں)	ماہنامہ معیار، بانکی پور پٹنہ جولائی۔ اگست ۱۹۳۶ء
۲۳۱	مطبوعات جدیدہ	ماہنامہ معاصر، ستمبر ۱۹۴۱ء
۲۳۲	مطبوعات جدیدہ	ماہنامہ معاصر، اکتوبر ۱۹۴۱ء
۲۳۳	مطبوعات، جدیدہ	ماہنامہ معاصر، نومبر ۱۹۴۱ء
۲۳۴	مطبوعات جدیدہ	ماہنامہ، معاصر، مارچ ۱۹۴۲ء
۲۳۵	مطبوعات جدیدہ	ماہنامہ معاصر، پٹنہ۔ مئی ۱۹۴۲ء
۲۳۶	مطبوعات جدیدہ	ماہنامہ معاصر پٹنہ۔ جون ۱۹۴۲ء
۲۳۷	مطبوعات جدیدہ	ماہنامہ معاصر پٹنہ۔ اگست ۱۹۴۲ء

نمبر شمار	مقالہ	رسالہ
۲۳۸	معروضات	ماہنامہ معیار بانکی پور پٹنہ۔ مارچ ۱۹۳۶ء
۲۳۹	معروضات	ماہنامہ معیار بانکی پور۔ پٹنہ مئی ۱۹۳۶ء
۲۴۰	معروضات	ماہنامہ معیار، بانکی پور پٹنہ جون ۱۹۳۶ء
۲۴۱	معروضات	ماہنامہ معیار بانکی پور پٹنہ۔ جولائی اگست ۱۹۳۶ء
۲۴۲	مقدمہ	معاصر، پٹنہ۔ حصہ ۱۰
۲۴۳	مقدمہ دیوان رضاؔ	ماہنامہ معاصر، پٹنہ۔ جنوری ۱۹۴۳ء
۲۴۴	مقدمہ دیوان رضاؔ	ماہنامہ معاصر، پٹنہ۔ فروری ۱۹۴۳ء
۲۴۵	مکاتیب غالب	ماہنامہ معاصر، پٹنہ۔ مارچ ۱۹۴۳ء
۲۴۶	مکتوبات، غالب	ماہنامہ معاصر، اپریل ۱۹۴۳ء
۲۴۷	مکاتیب غالب	ماہنامہ معاصر، پٹنہ، اپریل ۱۹۴۳ء
۲۴۸	مکاتیب غالب	ماہنامہ معاصر، پٹنہ۔ مئی جون ۱۹۴۳ء
۲۴۹	مولانا ابوالکلام کی قدیم تحریریں	ماہنامہ نقوش لاہور۔ اگست ۱۹۶۰ء
۲۵۰	میر تقی میر۔	ماہنامہ معیار، بانکی پور پٹنہ مئی ۱۹۳۶ء
۲۵۱	میر یا نثار اللہ خاں مصدر	معاصر، پٹنہ۔ حصہ ۲
۲۵۲	نادر خطوط غالب	ماہنامہ معاصر، پٹنہ۔ جنوری ۱۹۴۳ء
۲۵۳	نعیم دہلوی	دلی کالج میگزین۔ دلی نمبر ۱۹۵۹ء
۲۵۴	نوبہار یعنی قصہ گل وصنوبر از بینی نرائن جہاںؔ	ماہنامہ نیا دور لکھنؤ۔ جولائی ۱۹۵۹ء

نمبر شمار	مقالہ	رسالہ
۲۵۵	نئے مطبوعات (نادرات غالب۔ پھان بین۔ دیوان فائز)	ماہنامہ معاصر۔ پٹنہ۔ حصہ ۱
۲۵۶	نئے مطبوعات (وقائع عالم شاہی۔ ذکر غالب اشاعت ۲۔ نورالمعرفت از ولی۔ خطوط اکبر۔ اصلاحات اقبال۔ تاریخ ہندی قرون وسطی جلد ۲)	ماہنامہ معاصر، پٹنہ۔ حصہ ۲
۲۵۷	نئے مطبوعات (کلام انشا۔ احوال غالب میر تقی میر حیات اور شاعری۔)	ماہنامہ معاصر، پٹنہ۔ حصہ ۹
۲۵۸	نئے مطبوعات (میر تقی میر حیات اور شاعری (معاصر حصہ ۹ کا باقی)۔ وجہ الدین وجدی۔ از محمد عمر)	ماہنامہ معاصر، پٹنہ۔ حصہ ۱۰
۲۵۹	واجد علی شاہ کا سفر کلکتہ	
۲۶۰	یادداشت	ماہنامہ معاصر۔ پٹنہ۔ حصہ ۱۷
۲۶۱	یادداشت	ماہنامہ معاصر، پٹنہ۔ حصہ ۱۸
۲۶۲	یادداشت	ماہنامہ معاصر، پٹنہ حصہ ۱۹
۲۶۳	یادداشت	ماہنامہ اشارہ پٹنہ۔ اگست ۱۹۶۱ء

سید انیس الرحمٰن

قاضی عبدالودودؒ اور سیاسیات

قاضی عبدالودود اردو ادب کی ایک بڑی شخصیت ہیں۔ تحقیق انکا خاص موضوع ہے۔ علم اور مطالعہ کے علاوہ، صاحبان علم وفن کی نظر میں، ان کی ان تحقیقی تخلیقات کا پایہ بہت بلند ہے۔ ان میں سے اکثر کے مطابق قاضی صاحب نے اردو تحقیق کے سرمایہ کو جس قدر وسیع اور اس کے معیار کو جتنا بلند کیا ہے اس کی مثال کسی دوسرے کے یہاں نہیں ملتی ہے۔ اور اسی اعتبار سے دنیا قاضی عبدالودود کو اردو کے ایک عظیم محقق کی حیثیت سے جانتی ہے۔ ان کی شخصیت کے دوسرے پہلو یا تو سرے سے تاریکی میں ہیں یا پھر بہت کم روشنی میں آئے ہیں۔

اتفاقات کا انسانی زندگی میں بڑا دخل ہے۔ اور یہ محض اتفاق ہے کہ قاضی عبدالودود کی شخصیت کے کئی عناصر پر، طبعی حالات کے سبب، عملاً روک لگ گئے۔ اور ایسے میں ادبی عنصر کو فروغ اور غلبہ کا موقع مل گیا ورنہ ان کی شخصیت کے خمیر میں سیاست کا عنصر ہی اہم ترین تھا۔ ابتدا میں فکری اور عملی دونوں اعتبار سے یہ توانا اور متحرک تھا۔ بعد کے ایام میں اس کا عملی پہلو کم زور ہو کر ختم ہو گیا۔

لیکن فکری اعتبار سے یہ عنصر ہمیشہ موجود رہا۔ اور یہ ارتقا کی منزلوں سے گذرتا رہا۔ اگر طبعی حالات مانع نہ ہوتے تو ان کی شخصیت میں سیاسی عنصر ہمیشہ اہم ترین رہتا۔ ادبی عنصر کی حیثیت ثانوی ہوتی۔ لیکن بدلی ہوئی صورت میں بھی ان کی شخصیت میں سیاسی عنصر کی جلوہ گری بدرجہ اتم موجود ہے۔ ہر چند یہ ثانوی اور فکری ہی سہی۔

نقوش، لاہور کے آپ بیتی نمبر میں قاضی عبدالودود نے خود جو کچھ لکھا ہے تحریری صورت میں اب تک وہی ایک مضمون ہے جس سے ان کی سیاسی دلچسپیوں کا مواد فراہم ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ کوئی دوسری باضابطہ تحریر سامنے نہیں آتی ہے۔ لیکن وہ خود سب سے بڑا ماخذ ہیں۔ اپنی نجی صحبتوں میں، اور باتوں کے علاوہ، سیاسی موضوعات، مسائل اور شخصیتوں پر وہ جس طرح گفتگو فرماتے رہے ہیں ان سب کو اگر یکجا کر دیا جائے تو بلاشبہ ایک بڑی ضخیم کتاب تیار ہو جائے۔

قاضی عبدالودود کی سیاسی دلچسپیوں کو، خواہ وہ فکری ہوں یا عملی، تین ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ (۱) تحریک آزادی اور کانگریس سے وابستگی (۲) تحریک آزادی اور مسلم لیگ سے وابستگی (۳) عالمی حکومت کی طرف۔

آگرہ اخبار، اردوئے معلیٰ اور الہلال کے مطالعے سے قاضی عبدالودود میں سیاسی ذوق اور بیداری کی نشو و نما ہوئی۔ عالم اسلام اور ہندوستان کے سیاسی حالات نے ان کے دل میں تڑپ اور آزادی کی تمنا پیدا کی۔ مولانا محمد علی، مولانا

حسرت موہانی، مولانا مظہر الحق، مولانا آزاد اور گاندھی جی سے بے حد متاثر ہوئے۔ تحریک ترک موالات اور تحریک آزادی میں شریک رہے۔ پھر باضابطہ انڈین نیشنل کانگریس میں شامل ہو گئے۔

کانگریس میں شمولیت کے بعد کئی سال تک اس کی سیاست میں بے حد فعال رہے۔ ان کے ساتھ بہت سے مسلمان کانگریس میں شامل ہو گئے۔ یہ سبھی ترک موالات کے حامی تھے۔ اور ایک سالانہ انتخاب میں بہار کانگریس کی صوبائی تنظیم پر مکمل طور پر چھا گئے۔ اعتدال پسند ہار گئے۔ اسی حلقہ کے لوگ بہار صوبائی کانگریس کے عہدہ دار بنے۔ مولانا مظہر الحق صدر ہوئے۔ قاضی صاحب مجلس عاملہ میں آئے۔ پھر اپنی پسند کے لوگوں کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے لئے ڈیلی گیٹ منتخب کیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد بھی ان ہی ڈیلی گیٹوں میں ایک تھے۔ یہ اہم تاریخی بات ہے کہ مولانا آزاد پہلی بار اسی موقع پر کانگریس میں شریک ہوئے اور بہار کے نمائندہ کی حیثیت سے آل انڈیا کانگریس کمیٹی میں شرکت کی۔ اور ان سبھوں کی ذمہ داری، بلاشبہ، اسی نوجوان حلقہ پر ہے جس کے سرکردہ لوگوں میں مسٹر محمود شیر، مسٹر عبدالباری ساقی اور قاضی عبدالودود شامل تھے۔ ایک کانگریسی کی حیثیت سے قاضی عبدالودود نے کل ہند کانگریس کے دو سالانہ اجلاسوں میں شرکت کی۔ اور دونوں جگہ ترک موالات کی حمایت میں سرگرم رہے۔

اس زمانہ میں ان کے مراسم صوبہ بہار کے بیشتر سیاسی لوگوں سے رہے۔ اس میں اس وقت کی تمام سیاسی جماعتوں کے افراد شامل ہیں۔ کانگریس کے لوگوں میں قابل ذکر، شاہ محمد زبیر، ڈاکٹر راجندر پرشاد، ڈاکٹر سید محمود، پروفیسر

عبدالباری اور ڈاکٹر سری کرشن سنہا ہیں۔

کانگریس میں، کچھ برسوں کے بعد، اس کے زیادہ تر ارکان کی ذہنیت، روش اور عمل کو دیکھ کر قاضی عبدالودود کی بڑی حوصلہ شکنی ہوئی۔ وہ خاصے کبیدہ خاطر ہو گئے۔ اور جوشِ عمل میں سردی آ گئی۔ اور ایک طور پر بے تعلق سے ہو گئے۔

پھر کچھ ہی دنوں کے بعد قاضی عبدالودود، اعلیٰ تعلیم کے پیشِ نظر، ہندستان سے باہر چلے گئے۔ اور تقریباً سات سال کیمبرج اور دوسرے یورپی ممالک میں مقیم رہے۔ اور باتوں سے قطع نظر مغرب کے اس قیام کے تین خاص پہلو قابل ذکر ہیں۔ ایک تو یہ کہ یونی ورسٹی میں ان کے مضامین تعلیم، معاشیات اور سیاسیات تھے۔ اور پھر قانون بھی۔ معاشیات کے استاد پروفیسر اے۔ سی۔ پیگو اور سیاسیات کے پروفیسر ریمزے مور تھے۔ دوسرے وہاں ایسے ہندستانیوں سے راہ و رسم پیدا ہوئی جو یا تو عملی سیاسیات میں داخل ہو چکے تھے یا پھر بعد میں داخل ہوئے۔ ایسے لوگوں کی ایک لمبی فہرست ہے۔ لیکن ان میں نمایاں نام پنڈت جواہر لال نہرو، ڈاکٹر ذاکر حسین خاں اور مسٹر فخرالدین علی احمد کے ہیں۔ پنڈت نہرو سے ملاقات سوئٹزرلینڈ میں ہوئی تھی اور ڈاکٹر ذاکر حسین سے جرمنی میں۔ پھر پنڈت نہرو سے مسٹر فخرالدین علی احمد کا تعارف قاضی عبدالودود ہی نے کرایا تھا۔ پنڈت نہرو اور فخرالدین علی احمد کی ملاقات لندن میں ہوئی تھی۔ یہ اور اسی طرح کی دوسری ملاقاتیں بڑی غیر رسمی تھیں۔ قاضی عبدالودود نے ہندستان واپس آ کر بھی کئی ایک سے اپنے تعلقات قائم رکھے۔ اور بعضوں سے ان کے تعلقات بڑے گہرے ہو گئے۔ تیسری خاص بات ان کی علالت ہے۔ قاضی عبدالودود کیمبرج ہی میں تھے کہ علیل ہو گئے۔ پہلے تو وہیں کے سینی ٹوریم میں داخل ہوئے۔ لیکن بہتر علاج اور آرام

کے لئے سوئٹزرلینڈ کے ایک سینی ٹوریم میں چلے گئے۔ کملا نہرو بھی یہیں زیر علاج تھیں۔ ان ہی کے علاج کی غرض سے پنڈت نہرو اپنی صاحبزادی اندرا نہرو کے ساتھ وہاں مقیم تھے۔ اسی سینی ٹوریم میں قاضی عبدالودود اور اس چھوٹے سے نہرو خاندان کا تعارف ہوا۔ اور پنڈت نہرو اور قاضی عبدالودود کی ملاقاتیں برابر ہوتی رہیں۔ قاضی عبدالودود کی یہ علالت بہرحال ان کی صحت کو ہمیشہ کے لئے کمزور کرگئی۔ اور ان کی زندگی کے رخ کو یکسر بدل دیا۔ ان کو محنت اور جاں فشانی سے پرہیز کرنا پڑا۔ اور ان کی عملی زندگی محدود ہوگئی۔ یہ علالت کا سلسلہ بعد میں بھی قائم رہا۔ اور علاج و آرام ایک مستقل ضرورت بن گئے۔ ایسی حالت میں نہ تو قانونی پریکٹس کی گنجائش ہوسکی۔ نہ ہی عملی سیاست کی۔ پھر بھی اپنی تعلیم مکمل کرکے قاضی عبدالودود ہندستان واپس آئے۔

قاضی عبدالودود کے تجربات، بہرحال، کانگریس میں اچھے نہیں رہے۔ انھوں نے محسوس کیا کہ کانگریس کے ہندو ارکان کی بڑی تعداد اپنے مسلمان ساتھیوں کو غیر سمجھتی ہے۔ وہ سمجھتی ہے کہ مسلمان باہر سے آکر ان پر حکمراں بنے اور صدیوں ہندوؤں کو دبائے رہے۔ اسی لئے ابھی انتقام کے جذبات ان کے دلوں میں موجزن تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ اس سیاسی تنظیم میں یا اس کے ذریعہ حاصل ہونے والی حکومت میں مسلمان کا بھی کوئی اچھا مقام اور حصہ ہو۔ وہ اپنی عددی اکثریت کے بل پر فرقہ وارانہ ذہن کے ساتھ کانگریس کو چلانا چاہتے تھے۔ قاضی عبدالودود کو کانگریس کے ان ہندوؤں کی یہ روش پسند نہ آئی۔ اور وہ عملاً کانگریس سے علاحدہ ہوگئے۔

ہندستانی سیاسیات کے طالب علموں کے لئے یہ ایک عجیب لیکن بڑا بامعنی مطالعہ ہے کہ اس عہد کی سیاست میں حصہ لینے والی مسلمان شخصیتوں میں سے کئی

بہتیرے دل و دماغ کو کانگریس میں اسی نوع کے تجربات ہوئے۔ اور مایوس و مجبور ہو کر انھوں نے کانگریس سے علاحدگی کی روش اختیار کی۔ مولانا حسرت موہانی، مولانا محمد علی، مولانا ظفر علی خاں، مسٹر محمد علی خاں، مسٹر محمد علی جناح، نواب اسمٰعیل خاں، مسٹر خلیق الزماں، مسٹر عبدالرحمٰن صدیقی، مسٹر شعیب قریشی اور کئی دوسرے مسلمان سیاستداں آزادیٔ وطن کے جذبہ سے سرشار ہو کر کانگریس کی تحریک میں شریک ہوئے تھے۔ یہ سبھی اعلیٰ تعلیم یافتہ، روشن خیال اور مخلص تھے۔ یہ آزادی اور تمام ہندستانیوں کی ترقی و سربلندی کی تمنائیں لئے ہوئے کانگریس میں آئے تھے۔ لیکن کانگریس کے اندر اس کے ہندو ارکان کے تعصب، تنگ نظری اور رویے نے ان سبھوں کو پہلے حیرت اور بعد میں اندیشہ ہائے حال و مستقبل میں ڈال دیا۔ انھوں نے دیکھا کہ یہاں سیاست فرقہ وارانہ خطوط پر چلائی جا رہی ہے یہاں اکثریت و اقلیت سیاسی نہج پر نہیں بن رہی ہے۔ بلکہ محض مذہبی بنیادوں پر۔ انھوں نے محسوس کیا کہ اس طرح سیاسی اور قومی زندگی میں ایک فرقہ کی مستقل بالادستی رہے گی۔ اور دوسرے کی مستقل زیر دستی۔ آزادی سے پہلے سیاسی تنظیم میں اور آزادی کے بعد سیاسی اور قومی زندگی میں۔ ان تمام مسلمان رہنماؤں نے مسلمانوں کی اس زیر دستی کو پسند نہیں کیا۔ بد دلی اور اندیشوں کے ساتھ یہ کانگریس سے علاحدہ ہو گئے۔ بلا شبہ یہ ہندستانی قومیت کی بد نصیبی اور ہندستانی سیاست کا عظیم المیہ ہے کہ یہ وسیع اور کشادہ ہونے کے بجائے اس وقت تنگ و محدود ہو کر رہ گئی۔

اور اس طرح قاضی عبدالودود کی سیاسی زندگی کا پہلا دور ختم ہوا۔

یورپ سے واپسی کے بعد قاضی عبدالودود، بہرحال عملی سیاست سے کنارہ کش رہے۔ بلاشبہ اس میں ان کی صحت کی کمزوری اور خرابی کا زیادہ دخل رہا۔ لیکن سیاسی لحاظ سے بھی حالات ناموافق ہی رہے۔ نہرو رپورٹ کا ردعمل مسلمانوں میں خراب ہوا۔ کانگریس کی نیت اور ارادوں کے متعلق مسلمانوں کے پچھلے شکوک و شبہات کا ازالہ ہونے کی بجائے ان میں اور اضافہ ہی ہوا۔ نتیجۃً'' فطری طور پر، کانگریس اور مسلمانوں کے درمیان فصل بڑھتا گیا۔

قاضی عبدالودود اس زمانہ میں تین مختلف کیفیتوں سے گزرتے رہے۔ ایک طرف تو ہندستان کی آزادی کی تڑپ ان کے دل میں بڑھتی گئی۔ دوسری طرف کانگریس سے، اس کی اکثریت کی فرقہ وارانہ ذہنیت کی بناپر، عملی کے علاوہ فکری بُعد بھی پیدا ہوتا گیا۔ اور تیسری طرف آزادی کے ایسے تصور اور نقشے کی فکر لاحق رہی جس کے مطابق آزاد ہندستان میں مسلمان بھی آزاد و خود مختار اور باوقار رہیں۔

وقت گزرتا گیا۔ اور انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کی صوبائی خود مختاری کے پلان کے مطابق برطانوی ہند کے تمام صوبوں میں اسمبلیوں کے انتخابات ہوئے۔ بہار اسمبلی میں ان دنوں مسلمانوں کی چالیس سیٹیں تھیں۔ اور انتخاب کا طریقہ جداگانہ تھا۔ مسلمانوں کی دو سیاسی جماعتیں، یونائٹیڈ پارٹی اور انڈپینڈنٹ پارٹی، مسٹر سید عبدالعزیز اور مسٹر محمد یونس کی سرکردگی میں انتخاب میں حصہ لے رہی تھیں۔ کانگریس نے بھی اپنے ٹکٹ پر مسلمان امیدوار کھڑے کئے تھے۔ یہ بہت کم جیتے۔ اس انتخاب کے نتیجہ میں، بہرحال، انڈین نیشنل کانگریس عام نشستوں پر زیادہ تر صوبوں میں بڑی اکثریت سے جیتی۔ اور ایک وقفہ کے بعد کئی صوبوں میں

کانگریس کی حکومت قائم ہوگئی۔ صوبہ بہار میں بھی کانگریسی سرکار بنی۔

کانگریس نے وزارت بنانے کے بعد جس طرز پر حکومت چلائی اس سے مسلمانوں کے دلوں میں اعتماد بحال ہونے کے بجائے ان کے پرانے شکوک اور قوی ہوتے گئے۔ کئی جگہ زبان، تعلیم اور فرقہ وارانہ جھگڑوں کے مسائل اٹھ کھڑے ہوئے۔ مسلمانوں کے بہت سارے خواص و عوام سمجھنے لگے کہ اگر ہندستان کا سیاسی ڈھانچہ اسی طرز پر بنا اور مضبوط ہوا تو اس میں مسلمانوں کا مستقبل حد درجہ تاریک ہوگا۔ ردعمل کے طور پر مسلمانوں میں مسلم لیگ کی نئی تشکیل ہوئی۔ مسلم لیگ ملک کی آزادی کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے مفادات کے مکمل تحفظ کی علم بردار تھی۔

کانگریسی حکومتوں کی کارگزاریوں، اردو ہندی کے قضیے اور فرقہ وارانہ جھگڑوں نے قاضی عبدالودود میں پھر تحریک پیدا کی۔ وہ مسلم لیگ کے بے حد قریب ہوگئے۔ پھر چند لیگی رہنماؤں نے جب قاضی عبدالودود کو مسلم لیگ میں شرکت کی دعوت دی تو وہ اسے رد نہ کرسکے۔ انھوں نے اسے قبول کرلیا۔ لیکن صوبہ بہار کی مسلم لیگ میں ان دنوں دو اہم گروپ تھے۔ قاضی عبدالودود منحرف گروپ میں شریک ہوئے جس کی سربراہی مسٹر عبدالعزیز کر رہے تھے۔ اس گروپ میں ان کے دوسرے رفقاء میں مسٹر محمد نعمان، محمد ضمیرالدین، قاضی محمد سعید، شاہ جعفر حسین اور مسٹر نظیر حیدر پیش پیش تھے۔ دوسرا اور برسراقتدار گروپ خان بہادر نواب محمد اسمٰعیل کا تھا۔ جو بہار صوبائی مسلم لیگ کے صدر تھے۔ ان کے ساتھیوں میں سید جعفر امام، سردار لطیف الرحمان، سید بدرالدین احمد، مسٹر حسین امام اور سید مظہر امام بہت نمایاں تھے۔

قاضی عبدالودود اس زمانہ میں کافی سرگرم عمل ہوگئے۔ اہم مشوروں میں برابر شریک رہتے تھے۔ اور نقشہ کار کو ترتیب دیتے تھے۔ انھوں نے فرضی ناموں کے تحت کئی مضامین بھی لکھے جو معاصر صدائے عام پٹنہ میں شائع ہوتے رہے۔ اس روزنامہ کے کئی اداریے بھی انھوں نے لکھے۔ یہ سارے مقالے اور اداریے بڑے دقیع، اہم اور مؤثر تھے۔ اور یہ سبھی عصری سیاسی مسائل پر ہوتے تھے۔

لیکن قدرت کو منظور نہ تھا کہ یہ سلسلہ دراز ہو۔ قاضی عبدالودود پھر علیل ہوگئے۔ اور علاج و آرام کرنے لگے۔ اور یہ علالت کا سلسلہ قدرے طویل ہوگیا۔ نتیجتہً قاضی صاحب پھر عملی سیاست سے کنارہ کش ہوگئے۔ گو یہ درست ہے کہ ذہنی اعتبار سے سیاست اب بھی ان کے قریب اور ان سے وابستہ رہی۔ اصل میں یہ زمانہ ہی ایسا تھا کہ ناوابستگی، ذہنی سطح پر، ناممکن تھی۔ ملکی سطح پر سیاسی جدوجہد تیز تر ہوگئی تھی اور بین الاقوامی سطح پر دوسری جنگ عظیم پوری طرح اپنے شباب پر تھی۔ یہ جنگ نیشن اسٹیٹس کے ارتقا کا ایک لازمی نتیجہ تھی۔

قاضی عبدالودود فرد اور جماعتوں کے حقوق کے ہمیشہ قائل اور حامی رہے۔ اسی بنا پر مسلمانوں نے، مسلم لیگ کی قیادت میں، وطن کی آزادی اور اپنے سیاسی حقوق، دونوں، کی جب مانگ کی تو انھوں نے اس کو نظر انداز کرنا غلط سمجھا۔ وہ چاہتے تھے کہ کانگریس مسلمانوں کے حقوق کا پاس کرکے ان کے مطالبات کی روشنی میں ایسی راہ نکالتی جو مسلمانوں کے لئے قابل قبول ہوتی۔ ایسا ممکن بھی تھا۔ لیکن صاف دل سے اس پر کام نہیں ہوا۔ نتیجہ میں تقسیم ملک کی تجویز

سامنے آئی۔ یہ تجویز، ابتدا میں، کوئی قطعی اور آخری نہ تھی۔ اور مسٹر محمد علی جناح، بہرحال اور بنیادی طور پر، ایک قوم پرست اور ترقی پسند سیاستدان تھے جو تقسیم کی تجویز کو مسلم مفاد کے حق میں سودے بازی کے طور پر استعمال کر رہے تھے۔ اور اسی لئے، بعد میں، وہ کیبنٹ مشن پلان کو قبول کر کے تقسیم کے مطالبہ سے دستبردار بھی ہو گئے۔ لیکن پنڈت نہرو کے ایک بیان نے، اور اس پر مولانا آزاد اور قاضی عبدالودود دونوں متفق ہیں، صورت حال اس طرح بدل دی کہ تقسیم کے سوا کوئی دوسری راہ نہیں رہی۔ بلاشبہ اس تقسیم ملک کے لئے، اور یہ قاضی عبدالودود کا پختہ خیال ہے، کانگریس اور اس کے رہنما بھی ہر طرح ذمہ دار ہیں۔

دوسری جنگ عظیم کے خاتمہ اور، بعد میں، تقسیم و آزادی کے حصول کے ساتھ قاضی عبدالودود کی سیاسی دلچسپیوں کا دوسرا دور بھی ختم ہو جاتا ہے۔

تیسرا دور ان ہی حالات و کوائف کے پس منظر میں تقریباً ۴۷ء کے بعد سے شروع ہوتا ہے۔ اور حال تک پھیلا ہوا ہے۔ اس دور کی سیاسیات میں قاضی عبدالودود نے کوئی بھی عملی حصہ نہیں لیا ہے۔ اس میں ان کی ناسازئ طبیعت کے ساتھ بدلے ہوئے حالات کا بھی دخل ہے۔ لیکن فکری طور پر اس دور کے تمام قومی اور بین الاقوامی مسائل و حالات سے وہ محض باخبر ہی نہیں رہے بلکہ ان سبھوں کا سختی سے جائزہ لیتے رہے اور پھر ان میں سے بیشتر کے متعلق ایک قطعی واضح رائے بھی قائم کی۔

تقسیم، آزادی، فسادات، انسانی ہلاکت، مال بربادی، پناہ گزین، کشمیر

دونوں نو آزاد مملکتوں کے تصادم ۔ پھر دوسری جنگ عظیم اور ایٹم بموں کے پس منظر میں زمانۂ امن میں طاقتی بلاک کے ابھار، ان کے درمیان شدید سرد جنگ جیسے گوناگوں قومی و عالمی مسائل تھے جو موضوع بن کر ان کے سامنے آتے رہے اور اپنے اثرات پوری طرح پیدا کرتے رہے ۔

ان اثرات کے تحت قاضی عبدالودود کے سیاسی خیالات بھی ارتقائی منزلوں سے گزرے ۔ انھوں نے کئی موضوعات پر نئے طور پر بڑے واضح تصورات قائم کئے ۔ نیشنلزم کے بارے میں، مثلاً، یہ خیال قوی ہوا کہ اب یہ کوئی ترقی پسند سیاسی تصور نہیں رہا ہے ۔ اب یہ عصبیت سے بھر گیا ہے ۔ اب یہ تصور انسانوں کو باہم متحد کرنے کے بجائے خانوں میں بانٹ رہا ہے ۔ اور محض تیس سالوں کے اندر دو عظیم جنگوں کا سبب بنا ہے ۔ اس اعتبار سے بین الاقوامی سطح پر یہ ایک منفی اور تخریبی کردار کا حامل ہے ۔

سیاسی ماحول بھی اتنا گندہ ہو گیا ہے کہ سیاستداں بالعموم دوہرے اور تہرے معیار استعمال کرنے لگے ہیں ۔ اس میں انہیں نہ تو کوئی شرم معلوم ہوتی ہے نہ ہی کسی اصول سے انحراف کا خوف ہوتا ہے ۔ اگر اپنے یہاں فوجی تیاریاں ہوں تو ان کی غرض اور نوعیت ہمیشہ محض دفاعی ہوتی ہے ۔ اور اسی کام کو جب دوسرے کریں تو انہیں جارحانہ عزائم کے نام سے یاد کیا جاتا ہے ۔ پھر بین الاقوامیت کا سہارا لیکر دوسرے ممالک کے معاملات و مسائل کے بارے میں سب کچھ کیا اور کہا جانا پسند کیا جاتا ہے ۔ لیکن اپنے یہاں کے بارے میں اسی نوعیت کے کاموں کو مداخلت تصور کیا جاتا ہے ۔

کمیونزم کے بارے میں قاضی عبدالودود کے خیالات بڑے کھرے اور صاف

ہیں - ان کا خیال ہے کہ معاشی مساوات کی بات تو تسلیم کی جا سکتی ہے - لیکن یہ کیسے تسلیم کیا جائے کہ مقصد کے حصول کے لئے سب کچھ جائز ہے - خود غرضی، ظلم اور تشدد اس نظریۂ سیاست کی عام خصوصیت ہے - یہ سماج کا نام لیکر فرد کو غلامی کی سطح پر پہنچاتا ہے - نتیجہ میں فرد کو، اس نظام سیاست میں، نہ تو آزادی فکر ہوتی ہے اور نہ آزادی عمل - اور اس میں کسے کلام ہے، قاضی عبدالودود یہ یقین رکھتے ہیں، کہ روس عصر حاضر کی سب سے بڑی سامراجی طاقت ہے - اس کی تصدیق کے لئے روس کی مسلم آبادی کے علاقے اور مشرقی یورپ کے ممالک کے حالات کا مطالعہ کافی ہے -

فلاحی ریاست کا، قاضی عبدالودود کے خیال میں، کردار یہ نہیں کہ ایک انسان کے پاس جو کچھ ہے اس کو چھین کر دوسروں میں بانٹ دیا جائے - اور جب یہ شخص بیمار پڑے تو اپنے علاج کے لئے، اس کے پاس کوئی پھوٹی کوڑی بھی نہ ہو - اصل میں سبھوں کی ضروریات کی کفالت ہی اصل فلاح ہے -

پھر جمہوریت کی کامیابی کا راز بس یہ ہے کہ عوام میں شعور ہو اور افراد بلند کردار کے مالک ہوں - وہ شہریت کے حقوق و فرائض کو سمجھ سکیں اور ادا بھی کر پائیں - اگر ایسا نہیں تو، قاضی عبدالودود کے مطابق، بڑے خطرناک تجربات ہوں گے -

بدقسمتی سے تمام ہندستانیوں، خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان کے کیریکٹر مطلوبہ معیار سے نیچے ہیں - اور جب کردار بگڑ جائے تو، ظاہر ہے، اچھا سے اچھا نظام حکومت بھی بے کار ہو جاتا ہے - ہندستان آج اسی عارضہ میں مبتلا ہے - کردار سازی بلاشبہ بڑا مشکل فن ہے - اور اس میں کئی عناصر کا دخل ہے -

ہندستان کی اقلیتیں، خواہ مسلمان ہوں یا دوسری جماعتیں، خوف، اشتعال اور پست ہمتی سے اپنے کو محفوظ رکھیں تو تعمیری راہ پر لگ سکتی ہیں۔ یہ مناسب ہوگا کہ وہ مجالس قانون ساز میں اپنے لئے پروپورشنل نمائندگی کا مطالبہ کریں۔ اقلیتی مفادات کی حفاظت کا، قاضی عبدالودود کی رائے میں، یہ سہل اور مناسب راستہ ہے۔

وسائل کی فراوانی نے دنیا کے ایک حصے کو دوسرے حصے سے کئی لحاظ سے قریب کر دیا ہے۔ انسانوں کے بنیادی مسائل بھی یکساں نوعیت کے ہیں۔ زمان و مکاں کے تصور میں بھی تبدیلی آ رہی ہے۔ ایک نیا عالمی ذہن بن رہا ہے۔ اس نئے ذہن اور قومی ریاستوں میں، ظاہر ہے، کوئی جوڑ نہیں۔ قومی ریاستیں، منفی کردار اور زیادہ تر جارحانہ عزائم کی حامل ہیں۔ اسی لئے بنیادی طور پر قاضی عبدالودود، عالمی ریاست کے تصور کے حامی ہیں۔ انسانیت کی نجات، ان کے نزدیک، اسی تصور کے حقیقت بننے پر منحصر ہے۔ ورنہ خطرہ ہے کہ تہذیب و تمدن انسانی ختم ہو جائیں گے۔

مندرجات بالا قاضی عبدالودود کے سیاسی افکار کے تھوڑے سے نمونے ہیں۔ اگر اس طرح کے تمام افکار کو یکجا کیا جائے تو ایک ضخیم کتاب تیار ہو جائے۔

یہ ایک دلچسپ اتفاق ہے کہ جمہوریہ ہند کے تین صدر سے قاضی عبدالودود کے مراسم ذاتی نوعیت کے رہے۔ ڈاکٹر راجندر پرشاد سے راہ و رسم تحریک ترک موالات کے دوران ہوئی تھی۔ اور اس میں اتنی گہرائی آ گئی تھی کہ قاضی عبدالودود کی شادی کے موقع پر ڈاکٹر راجندر پرشاد صرف دعوت طعام ولیمہ

ہی میں نہیں شریک تھے بلکہ شروع سے آخر تک بارات میں بھی شریک رہے تھے۔

پھر ڈاکٹر ذاکر حسین کے ساتھ قاضی عبدالودود کی راہ و رسم جرمنی کی ملاقاتوں سے شروع ہوئی اور گہری ہی ہوتی گئی۔ بہار کے گورنر کی حیثیت سے جب ڈاکٹر ذاکر حسین پٹنہ آئے تو اس راہ و رسم میں تازگی اور مزید استواری پیدا ہوئی۔ اور قاضی عبدالودود کی نیک خواہشات کے ساتھ وہ عہدہ صدارت پر فائز ہوئے۔

موجودہ صدر جمہوریہ، مسٹر فخرالدین علی احمد، کے ساتھ قاضی عبدالودود کی راہ و رسم دیرینہ بھی ہے اور ہر درجہ دوستانہ بھی۔ دونوں ایک دوسرے کے گرویدہ ہیں۔ باہمی اعتماد، خلوص اور ارتباط کا یہ عالم ہے کہ اگر اول الذکر پٹنہ کی طرف آئے تو قاضی عبدالودود سے ملے بغیر آگے نہیں بڑھتے۔ اور اگر موخر الذکر دلی دو دن کے لئے جائیں تو مسٹر فخرالدین علی احمد دو ہفتہ بعد بھی انہیں رخصت کرنا گوارا نہیں کرتے۔ یہ دونوں کی وضعداری ہے۔ ہماری پرانی تہذیب کا قابل قدر پہلو۔

قاضی عبدالودود اواخر انیسویں صدی اور اوائل بیسویں صدی کے یورپی، بالخصوص انگریزی، علوم، افکار اور روایات کی پیداوار ہیں۔ ان سبھوں کے اثرات ان کے انداز فکر پر نمایاں ہیں۔ اسی لئے وہ جہاں معاشی مساوات کے خواہاں ہیں وہیں فرد کی آزادی فکر و آزادی عمل کو محفوظ و برقرار دیکھنا چاہتے ہیں۔ ان کے سیاسی شعور کی ابتدائی نشو و نما تو پہلی جنگ عظیم اور اس کے بعد کے ہندستان اور عالم اسلام کے حالات کے پس منظر میں ہوئی لیکن ان کے سیاسی افکار میں پوری پختگی قیام یورپ کے بعد ہی ظاہر ہوئی۔

اتنا تو اب، بہر حال، ظاہر ہے کہ قاضی عبدالودود کی شخصیت کا ایک عنصر سیاست ہے۔ لیکن یہ پوری بات نہیں۔ سیاسیات کے ذوق، اس کی تعلیم، اس میں عملی حصے اور اس کی شخصیتوں سے تعلقات کی بنا پر یہ بالکل عیاں ہے کہ سیاسیات ان کی شخصیت کا اہم ترین عنصر بن رہا تھا۔ لیکن برا ہو بار بار کی بیماری کا کہ قاضی عبدالودود کو اپنے سب سے بڑے ذوق کو کچلنا پڑا۔ اور اردو تحقیق کو، یقیناً، ان کی اس علالت دائمی کا شکر گزار ہونا چاہئے کہ پروفیسر بیگو اور پروفیسر ریمزے مور کا شاگرد، سیاسیات کے فن اور میدان سے ہٹ کر، مصحفی، جوشش اور سودا کے کلیات میں پناہ گزیں ہو گیا۔

کلیم الدین احمد

حرف آخر

معاصر کے دو شمارے نکل چکے تھے۔ سید اختر احمد اورینوی اور سید حسن نے مضامین کے لئے لوگوں کو خط لکھے تھے۔ میں نے سوچا کہ قاضی عبدالودود صاحب سے بھی قلمی معاونت کی درخواست کی جائے۔ میں نے سید حسن عسکری صاحب سے کہا۔ وہ مجھے قاضی صاحب کے یہاں لے گئے۔ قاضی صاحب اس زمانے میں قدم کنواں میں رہتے تھے۔ ان سے پہلی ملاقات کا ذکر انھیں کے لفظوں میں سنئے:

"ان سے میری پہلی ملاقات کا مقصد اس رسالہ (معاصر) کے متعلق تبادلۂ خیالات تھا لیکن رسمی بات چیت کے بعد جس میں ان کا بہت کم حصہ تھا۔ میں نے رسالے کے بارے میں جو سوالات کئے ان کا جواب سید حسن عسکری صاحب نے دیا جو ان کے ساتھ آئے تھے اور میں نے اس کے متعلق جو تجویزیں پیش کی تھیں ان کی نسبت خود ان کا ردعمل مطلقاً معلوم نہ ہو سکا۔ وہ دوران گفتگو میں بالکل خاموش رہے اور رخصت کے وقت ان کی مہر سکوت ٹوٹی بھی تو ایک آدھ لفظ سے زیادہ ان کی زبان سے نہ نکلا"

بہرکیف قاضی صاحب کو معاصر کے مقاصد سے ہمدردی تھی۔ وہ معاصر کی قلمی معاونت کرنے پر راضی ہو گئے۔ یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ یوں تو میں ان کے نام سے واقف تھا۔ معیار، جو وہ نکالا کرتے تھے اس کے دو شمارے میں نے دیکھے تھے۔ ان کی قابلیت کی شہرت تھی لیکن ملنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔

قاضی صاحب کو شروع سے شعر و ادب اور سیاست سے دلچسپی تھی۔ وہ سیاسی جلسوں میں شریک ہوا کرتے تھے اور جو سیاسی تحریکیں تھیں ان سے دلچسپی تھی۔ ذوق ادب بھی تھا جس کی وجہ سے انہوں نے اپنے خرچ سے شاد کا دیوان شائع کرنا چاہا۔ محمد مسلم صاحب شاگرد شاد جامعہ میں تھے۔ کلام شاد ان کی نگرانی میں شائع ہوا لیکن اس کی اشاعت کے بعد شاد نے طوفان اٹھایا۔ کہا کہ اگر میرے کلام کی اشاعت جاری رہی تو میں اعلان کروں گا کہ یہ میرا کلام نہیں۔ قاضی صاحب پر یہ الزام لگایا کہ وہ دھوکا دے کر ان کا دیوان لے گئے ہیں۔ یہ ان کی نیک نیتی کا صلہ ملا۔

قاضی صاحب نے کیمبرج سے معاشیات میں ٹرائی پوس کیا اور پھر بیرسٹری کا امتحان بھی پاس کیا۔ اسی زمانے میں وہ سخت علیل ہوئے اور علاج کے لیے سوئٹزرلینڈ کے ایک سینی ٹوریم میں داخل ہوئے۔ وہاں سے وہ شفایاب ہو گئے لیکن علالت کے اثرات ان کی زندگی پر تا دیر قائم رہے۔ وہ تقریباً سات سال انگلینڈ میں رہ گئے اور ان کا زیادہ وقت اردو اور فارسی مخطوطات کے مطالعے میں گزرا۔ انڈیا آفس لائبریری، برٹش میوزیم، بوڈلین لائبریری میں مخطوطات کا کھوج لگایا اور معلومات کا ایک خزانہ جمع کر لیا۔ معاشیات اور قانون کی ادبی تحقیق کے سامنے کوئی وقعت نہ رہی۔ ہندوستان واپس آنے کے بعد نہ تو بیرسٹری نے ان کا دامن دل کھینچا اور نہ پروفیسری نے۔ مطالعۂ کتب کی طرف ہمہ تن متوجہ ہو گئے۔ بستر تھا اور کتابیں تھیں۔ انسانی دنیا سے گویا قطع تعلق ہو گیا اور کتابوں خصوصاً مخطوطات کی دنیا میں جا بسے۔ گھریلو معاملات میں بھی دلچسپی نہ رہی۔ جائداد کی دیکھ بھال بھی سعید مرحوم کرتے رہے۔ لوگ ملنے کے لئے آتے تو قاضی صاحب اپنی نئی دریافتوں کا ان سے ذکر کرتے انہیں بولنے کا موقع مل جاتا اور وہ بولتے بھی بہت اچھا ہیں اس لئے لوگ ہمہ تن گوش سنا کرتے۔ ہم کہیں اور سنا کرے کوئی والی کیفیت ہوتی۔ کتب بینی کے ساتھ مضامین

بھی لکھتے رہتے تھے جو مختلف رسالوں میں شائع ہوتے رہتے تھے۔ ان کا واحد مشغلہ پڑھنا اور لکھنا۔ پڑھنا زیادہ، لکھنا کم ہو گیا اور وسعت معلومات میں اضافہ ہوتا گیا۔ ہوتا گیا۔ خصوصاً تذکروں سے متعلق جتنی معلومات قاضی صاحب کو ہیں وہ کسی کو نہیں۔

برسوں پڑے رہنے نے قاضی صاحب کو زبردست محقق بنا دیا لیکن جیسا کہ میں نے کہا ہے انسانوں کی دنیا سے وہ گویا الگ ہو گئے۔ اگر وہ بیرسٹری کا پیشہ کرتے تو بھانت بھانت کے لوگوں سے انھیں ملنا جلنا پڑتا۔ دوسروں کی سنتے، اپنی کہتے، ملنے جلنے سے ان کی شخصیت پر غیر شعوری طور پر اثر پڑتا۔ اسی طرح دوسروں کی سننے سے، ان کے نقطۂ نظر کو سمجھنے سے، اپنی باتوں کے خلاف دلائل و براہین دیکھنے سے، ان کے سوچنے اور بولنے کے ڈھنگ میں کچھ نہ کچھ تبدیلی ضرور ہوتی۔ اسی طرح سے اگر وہ پروفیسر ہوتے تو دوسرے اساتذہ سے ملتے، طالب علموں سے ملتے۔ ایک سے تبادلۂ خیالات کرتے اور دوسروں کو اپنی باتیں سمجھاتے، کمیٹیوں میں کام کرنا پڑتا تو جہاں اپنی باتیں کہتے وہاں دوسروں کی باتیں بھی سننی پڑتیں۔ اگر یہ سب کچھ ہوتا تو قاضی صاحب کی شخصیت پر اثر ضرور پڑتا۔ تنہا رہنے کی وجہ سے، انسانوں کی دنیا سے قطع تعلق ہو جانے سے ان کی شخصیت ایک خاص رنگ میں رنگ گئی ہے۔ اگر وہ بستر نشین نہ ہو جاتے اور دوسرے لوگوں کی طرح انہیں بھی تنہا نہیں، مل جل کر روزانہ کام کرنا ہوتا تو شاید ان میں اتنی قطعیت نہ ہوتی۔ وہ تنہا سوچتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ جو وہ سوچتے ہیں وہی صحیح ہے اور جو اس طرح نہیں سوچتا وہ غلطی پر ہے۔ اور اس کی غلطی پر تنبیہ کرنا بھی وہ اپنا فرض سمجھتے ہیں یعنی ان کا طریقہ کچھ Dictatorial ہے اور یہ صرف تنہا رہنے اور تنہا سوچنے کا نتیجہ ہے اور کچھ نہیں۔ وہ بہت سمجھدار ہیں اور اگر سمجھدار نہ ہوتے تو کامیاب محقق بھی نہ ہوتے۔

کچھ لوگ ان کے شاکی رہتے ہیں کہ جس سے بات ان نے شکایت ضرور کی کے معاصرانہ۔ لیکن شکایت زیادہ سے زیادہ بیجا ہوتی ہے۔ اصلی بات یہ ہے کہ قاضی صاحب Humbug کو برداشت نہیں کرسکتے ہیں اور وہ Humbug کو کسی صورت میں دیکھتے ہیں تو برہم ہو جاتے ہیں۔ ایک تو وہ اصول کے پابند ہیں۔ چاہتے ہیں کہ جو کام بھی ہو اس میں کوئی اصولی بھول نہ ہو۔ لیکن عام طور سے لوگ اصول اصول تو زبان سے کہتے رہتے ہیں لیکن عمل کرتے وقت اصول کو بالائے طاق رکھ دیتے ہیں۔ اگر اس حرکت پر کوئی برہم ہو تو اس کی برہمی جائز ہے۔ اسی طرح سے عام طور پر لوگ وعدے کر دیا کرتے ہیں لیکن شاید وعدہ کرتے وقت بھی وہ جانتے ہیں کہ وہ اسے پورا نہیں کریں گے اور کوئی اصرار کرتا ہے تو الٹا اسی پر خفا ہو جاتے ہیں۔ بہت سی باتیں کہی جاتی ہیں صرف خوش بیانی کے لئے۔ کسی کو وقتی طور پر خوش کرنے کے لئے یا کچھ Reservations کے ساتھ۔ یہ سب آئے دن ہوا کرتا ہے لیکن قاضی صاحب ان سب چیزوں کو برداشت نہیں کرسکتے ہیں اور وہ سخت گیری کرتے ہیں اور ان کی سخت گیری جائز ہے۔ جو کہئے وہ کیجئے ورنہ مت کہئے۔

میں قاضی صاحب کا احترام کرتا ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں ان کی وسعت نظر کا قائل ہوں۔ ان کا حافظہ غضب کا ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان کے پیش نظر تحقیق کا ایک بلند آئیڈیل (ideal) ہے جسے وہ ہمیشہ بلند رکھتے ہیں۔ مجھ سے لوگ کہا کرتے تھے کہ قاضی صاحب چھوٹی چھوٹی باتوں کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ بھلا اس میں کیا رکھا ہے کہ فلاں شاعر پانچ بج کر دس منٹ پر مرا یا پانچ بج کر بیس منٹ پر۔ اور اس میں کیا رکھا ہے کہ فلاں شاعر کے دیوان کے فلاں نسخے میں کسی لفظ کے نون میں نقطہ ہے اور دوسرے نسخے میں نون میں نقطہ نہیں ہے۔ یہ صحیح ہے کہ بات صرف

اس قدر ہے تو یہ اہم نہیں ہے لیکن بات یہ ہے کہ تحقیق میں کوئی چیز چھوٹی نہیں ہوتی۔ اور پھر یہ نقطۂ نظر کا سوال ہے۔ اگر تحقیق میں طبیعت کاہلی کی خوگر ہو گئی اگر ذہن نے نام کو ڈھیل دی، اگر تعین کی اہمیت جاتی رہی تو بڑی بڑی باتوں میں بھی یہی کاہلی ہوگی، یہی ڈھیلا پن ہوگا اور ان کی اہمیت کا صحیح احساس نہیں ہوگا۔ اس لئے تحقیق میں ضرورت ہے کی وہ exactness بڑی چیزوں میں ہو یا چھوٹی چیزوں میں ہو اور اگر یہ چیز ہاتھ سے جاتی رہی تو پھر تحقیق ممکن نہیں۔ قاضی صاحب کا نقطۂ نظر سائنٹیفک ہے وہ پوری جانکاری ہم پہنچانا چاہتے ہیں، جو شے جیسی ہے اسے ویسی ہی دیکھنا چاہتے ہیں۔ اور پھر اسے ویسی ہی پیش کرنا چاہتے ہیں وہ نہیں چاہتے ہیں کہ اس میں کسی قسم کی تبدیلی ہو، ارادی یا غیر ارادی طور پر اس میں کچھ فرق آ جائے۔

نہ جانے کتنے مضامین ـــ مقالے، تبصرے، اشارات، آوارہ گرد اشعار، تعین زمانہ، جہانِ غالب، پرانے شعرا کا کلام ـــ ان کے قلم سے نکلے ہیں اور یہ مضامین اردو رسالوں میں بکھرے ہوئے ہیں۔ میرے خیال میں ان کے مضامین کا سب سے اہم حصہ وہ تبصرے ہیں جو وہ وقتاً فوقتاً لکھتے رہے ہیں ـــ انھیں تبصروں میں ان کے اصلی جوہر کھلتے ہیں۔ ذاکر صاحب مرحوم نے قاضی صاحب اور میرے متعلق کہا تھا کہ یہ لوگ تنبیہ الغافلین قسم کے لوگ ہیں۔ اور یہ سچ ہے کہ قاضی صاحب تنبیہ الغافلین کا کام بدرجۂ اتم انجام دیتے ہیں۔ وہ مالک رام دہلوی ہوں یا شاد عظیم آبادی، غالب ہوں یا عبدالحق صاحب یا خواجہ احمد فاروقی یا وہ پی۔ ایچ۔ ڈی اور ڈی۔ لٹ ڈگری کے مقالے ـــ وہ کسی کو نہیں چھوڑتے اور سبھوں کی غلطیوں کی نشان دہی کرتے ہیں اور بہت ٹھکانے سے کرتے ہیں اور اس کام کا انہیں خاص ملکہ ہے اور اس میں انہیں خاص لطف بھی ملتا ہے۔ ان کا مضمون "عبدالحق بحیثیت محقق" مقالہ نہیں حقیقت میں تبصرہ ہے اور اس طویل مضمون میں عبدالحق صاحب کی محقق کی حیثیت سے جو جو کوتاہیاں ہیں ان پر روشنی ڈالتے ہیں اور جو جو غلطیاں

انھوں نے کی ہیں انھیں وہ ایک خاص Zest کے ساتھ بیان کرتے ہیں اسی طرح خواجہ احمد فاروقی کی دو تصنیفوں پر وہ تفصیلی تبصرہ کرتے ہیں۔ ایک جو تیر یان کی کتاب ہے اور دوسرا تذکرہ سرور جس کو انھوں نے اڈٹ کیا ہے۔ ان دونوں کتابوں پر میر حاصل تبصرہ ہے اور خصوصاً تحقیق میں جو جو لغزشیں ہیں ان کا تفصیلی ذکر ہے۔ یہ دو مثالیں ہیں جن سے قاضی صاحب کی افتادِ طبیعت کا پتہ چلتا ہے۔

سائنٹسٹ دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو نئی نئی دریافتیں کرتے ہیں اور دوسرے وہ جو ان نئی دریافتوں کو تنقید کی روشنی میں دیکھتے ہیں اور کہیں کوئی کمی رہ گئی ہے تو اسے بتاتے ہیں یعنی ایک تو Scientists ہوئے اور دوسرے critics of Science ہوئے۔ کیونکہ بہت سی دریافتیں ایسی ہوتی ہیں جن کی بنا مفروضوں پر ہوتی ہے یا جن میں بہت پیچیدہ حساب کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ نقاد دیکھتے ہیں کہ مفروضوں میں کوئی بھول تو نہیں یا حساب میں کوئی کمی تو نہیں رہ گئی ہے۔ اسی طرح قاضی صاحب یہ دیکھتے ہیں کہ کسی تحقیقی کتاب یا تحقیقی مقالے میں کوئی کمی یا کوئی غلطی رہ گئی ہے یا نہیں۔ چونکہ اردو میں تحقیق کا معیار اچھا نہیں ہے اور قاضی صاحب کا معیار بہت بلند ہے اور وہ اسے بلند رکھنا چاہتے ہیں اس لئے انہیں ان کتابوں اور مقالوں میں ان گنت خامیاں یا غلطیاں دکھائی دیتی ہیں جن کی طرف وہ مصنفین اور قارئین دونوں کی توجہ مبذول کرتے ہیں آرنلڈ نے تنقید کے بارے میں کہا تھا Let us keep our Standards high قاضی صاحب کا تحقیق کے بارے میں بھی یہی خیال ہے۔ معیار بلند رکھو اور وہ معیار کو بلند رکھتے ہیں۔ یہی بات لوگوں پر گراں گزرتی ہے لیکن اس میں قاضی صاحب کا کیا قصور ہے معیار بلند رکھو — قاضی صاحب کا معیار اس قدر بلند ہے کہ شاید انھیں اپنے کام سے بھی پوری تشفی نہیں ہوتی۔ معاصر میں ان کے بہت سے مضامین نکل چکے تھے تو میں نے

ان سے کہا کہ ان مضامین کو اکٹھا کر کے شائع کر دیا جائے تو اچھا ہو۔ کہنے لگے: ان پر نظر ثانی کرنی ہوگی اور میں جانتا تھا کہ اگر وہ مضامین نظر ثانی کے لئے گئے تو پھر کبھی نہ شائع ہو سکیں گے۔ اس لئے میں نے ارادہ فسخ کر دیا۔ معاصر میں انھوں نے مثنوی مہاراجہ کلیان سنگھ، دیوان رضا، تذکرہ مسرت افزا قسط وار شائع کئے۔ ان سے فرمائش کی گئی تھی اور انھوں نے وعدہ کیا تھا کہ ان پر تفصیل سے مقدمے بھی لکھیں گے۔ ان کتابوں کی الگ سے ۲۵۰ کاپیاں بھی چھپوائی گئی تھیں۔ ان سے کئی بار کہا گیا تھا لیکن آج تک نہیں لکھا۔ دوسری جنگ عظیم کا زمانہ تھا معاصر نکل رہا تھا۔ قاضی صاحب نے مجھ سے کہا کیوں نہیں ایک اردو ادب کی تاریخ لکھی جائے۔ میں آپ کو مواد دوں گا۔ لکھنے کا کام آپ کے ذمہ ہوگا۔ میں راضی ہو گیا۔ تو کہنے لگے۔ ابھی یہ کام نہیں ہو سکتا ہے کیونکہ کچھ تذکرے اور دوسری کتابیں ہندوستان میں نہیں ہیں۔ ابھی جنگ کا زمانہ ہے، انھیں انگلینڈ سے منگایا بھی نہیں جا سکتا ہے۔ جنگ ختم ہو جانے کے بعد یہ کام شروع کیا جائے گا۔ میں نے کہا کہ جو مواد ابھی موجود ہے اسی کی بنا پر کام شروع کر دیا جائے۔ اگر وہ کتابیں مل گئیں تو ضروری اضافے کر دیئے جائیں۔ لیکن قاضی صاحب راضی نہ ہوئے۔ میں "دو تذکرے" کی ترتیب دے رہا تھا تو بوڈلین سے تذکرہ عشقی کا جو فوٹو اسٹیٹ منگایا تھا اس میں شاید ۱۰ اوراق نہیں تھے۔ قاضی صاحب کے پاس تذکرہ عشقی کا ایک نسخہ تھا۔ میری درخواست پر وہ مجھے دیکھنے کے لئے دیا۔ ایک بڑا سا لفافہ تھا اس میں تذکرہ عشقی کے منتشر اوراق تھے اور کچھ اوراق کی کتابت ہو چکی تھی۔ ایک بار نہیں دو بار۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ قاضی صاحب خود تذکرہ عشقی کو شائع کرنا چاہتے تھے اور اس کی کتابت بھی شروع کی تھی لیکن کتابت سے انھیں شاید تشفی نہیں ہوئی یا اور کوئی وجہ ہو، کتابت ختم نہ ہوئی اور کتاب شائع نہ ہوئی۔ مجھے یہ فائدہ ہوا کہ وہ اوراق جو بوڈلین والے نسخے میں نہیں تھے اس نسخے میں مل

گئے۔ لیکن دیکھا تو اس تذکرے کے بہت سے اوراق غائب تھے۔ پتا نہیں کاتبوں کے پاس رہ گئے یا کیا ہوئے۔ قاضی صاحب کے پاس مصحفی کے دواوین ہیں اور بہت دنوں سے وہ چاہتے ہیں کہ انہیں شائع کریں لیکن وہ تکمیل کی خواہش کام میں مانع ہوئی۔ خدا بخش لائبریری میں باخرزی کی رباعیوں کا شاید واحد قلمی نسخہ ہے۔ قاضی صاحب نے تحریک کی کہ انہیں شائع کیا جائے اور یہ کام انہیں کے ذمہ سپرد ہوا۔ رباعیوں کی نقلیں کی گئیں، بلوکس" بنوائے گئے، کاغذ خریدا گیا لیکن یہ کام بھی انجام نہ پاسکا۔ یہ مثالیں میں نے صرف اس لئے دی ہیں کہ یہ بات ظاہر ہو جائے کہ قاضی صاحب کو جب تک پوری تشفی نہیں ہو جاتی وہ کوئی کام نہیں کرتے۔ انہیں تحقیق کی ذمہ داریوں کا شدید احساس ہے اور وہ صرف نام و نمود کی خاطر کتابیں شائع نہیں کرنی چاہتے ہیں، انھوں نے دو کتابیں شائع کیں۔ ایک ابن طوفان کا تذکرہ۔ یہ مختصر سا تذکرہ ہے۔ اسے انہوں نے اڈٹ کیا لیکن پھر شاید اس میں کوئی کمی نظر آئی تو اسے واپس لے لیا۔ دوسری کتاب دیوان جوشش ہے جس کا واحد قلمی نسخہ انہیں مل گیا تھا جو ناقص بھی تھا۔ اسے انہوں نے تحقیق کی طرح سے اڈٹ کیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی قدیم شاعر کے دیوان کو کس طرح پیش کرنا چاہئے یہ اور بات ہے کہ دیوان شائع ہونے کے بہت دنوں کے بعد دو اور نسخوں کا پتا چلا۔ ایک مرشد آباد لائبریری میں ــــ جواب وہاں نہیں ہے اور یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ کیا ہوا ــــ اور دوسرا انڈیا آفس لائبریری میں جس میں ۵۶ غزلیں ایسی بھی ہیں جو قاضی صاحب والے نسخے میں نہیں ہیں۔ لیکن ان دو نسخوں کی دریافت کے باوجود دیوان جوشش جسے قاضی صاحب نے اڈٹ کیا ہے اس کی اہمیت میں کمی نہیں ہوتی اور وہ آج بھی مشعل راہ ہے۔

جو دنیا سے الگ رہے وہ دنیاداری نہیں جانتا۔ قاضی صاحب کا بھی یہی حال ہے۔

میں جب ڈی۔پی۔آئی تھا تو میں نے چاہا کہ ان سے کچھ دنیا کا بھی کام لیا جائے لیکن ادبی قسم کا۔ انہیں گورنمنٹ نے گورنمنٹ اردو لائبریری کی مینیجنگ کمیٹی کا ممبر نامزد کیا۔ اور پھر وہ خدا بخش لائبریری کی مینیجنگ کمیٹی کے ممبر بھی نامزد ہوئے لیکن اردو لائبریری میں یہ زیادہ دنوں تک نہیں رہ سکے حالانکہ لائبریری کے سکریٹری ان کے دوست حیدر امام صاحب مرحوم تھے۔ بات یہ تھی کہ حیدر امام صاحب مینیجنگ کمیٹی کی میٹنگ سال میں صرف ایک بار کیا کرتے تھے اور پھر سلطان احمد صاحب لائبریرین اپنی مرضی کے مطابق کتابیں لائبریری کے لئے خرید لیا کرتے تھے۔ قاضی صاحب نے کہا کہ کمیٹی کی میٹنگ سال میں کم سے کم دو بار ہوا کرے اور کتابوں کی فہرست ممبروں سے مانگ لی جائے اور اس کے مطابق کتابیں خریدی جائیں۔ اس طرح اچھی کارآمد کتابیں لائبریری کے لئے لی جا سکیں گی۔ دونوں باتیں بہت معقول تھیں لیکن حیدر امام صاحب نے ان باتوں پر دھیان نہیں دیا۔ قاضی صاحب نے استعفیٰ دیدیا۔

میں ڈی۔پی۔آئی تھا تو قاضی صاحب نے مجھ سے کہا کہ وہ غالب کی تصانیف کو اڈٹ کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے لئے اسکیم بنا کر گورنمنٹ سے منظوری لینے کی ضرورت تھی لیکن میں نے کام شروع کرنے کے لئے پانچ ہزار روپے دیدیئے۔ انہوں نے ذاکر صاحب سے بھی اس کا تذکرہ کیا تھا۔ انہوں نے مجھے بلا بھیجا اور کہا: کلیم صاحب کوئی صورت نکالئے۔ میں چاہتا ہوں کہ اچھا سا ایڈیشن ہو۔ اوفسٹ پرنٹنگ ہو کیونکہ یہ کام بار بار تو ہو نہیں سکتا۔ اگر مجھے کسی سے پیروی کرنے کے لئے کہئے گا تو میں کروں گا۔ میں نے کہا میں کوشش کرتا ہوں۔ میں نے قاضی سعید سے کہا کہ ایک اسکیم بنا کر دیجئے۔ لیکن جو اسکیم انہوں نے بنائی وہ ناکافی تھی۔ میں نے خود ایک اسکیم بنائی تفصیل کے ساتھ، کتنی جلدیں ہوں گی۔ کتابت، طباعت، کاغذ، جلد بندی وغیرہ میں کیا خرچ ہوگا۔ مواد جمع کرنے میں کیا خرچ ہوگا۔ تقریباً ایک

لاکھ روپوں کی اسکیم تھی اور یہ اسکیم منظور بھی ہوگئی۔ ڈاکٹر صاحب بہت خوش ہوئے۔ قاضی صاحب کے پاس مواد تو موجود ہی تھا، بہت کچھ کام بھی وہ کر چکے تھے۔ کام شروع ہوا لیکن وقت گزرتا گیا اور ایک جلد بھی شائع نہ ہوئی تو میں نے قاضی صاحب سے پوچھا انہوں نے کہا کہ۔ مقدمہ لکھنا باقی ہے جب زیادہ دیر ہوئی تو میں نے رائے دی کہ وہ متن شائع کردیں اور سارے مقدمے ایک علٰحدہ جلد میں شائع کر دیئے جائیں گے۔ میرا خیال تھا کہ اس طرح کام میں سہولت ہوگی اور کم سے کم غالب کی ساری تصنیفات تو 69ء تک شائع ہوجائیں گی۔ لیکن یہ بھی نہ ہوا۔ پہلی جلد برہان قاطع کا متن شائع ہوئی باقی جلدیں شائع نہ ہوسکیں۔ اس پر مجھ کو تاسف بھی ہوا۔ وجہ وہی تکمیل کی جستجو تھی۔ جب تک یہ اطمینان نہ ہوجائے کہ کوئی غلطی نہیں، کوئی کوتاہی نہیں، کوئی ضروری مسئلہ ایسا نہیں جس پر روشنی نہ ڈالی گئی ہو، اس وقت تک قاضی صاحب اپنے کو Commit کرنا نہیں چاہتے ہیں یہ بات بہت اچھی ہے لیکن اس کی وجہ سے ایک بڑا نقصان ہوگیا۔ اگر مکمل ایڈیشن شائع ہوجاتا تو وہ ایک یادگار چیز ہوتی۔

ہر سال مرکزی حکومت سنسکرت، عربی اور فارسی کے علماء کو Certificate of Honour دیا کرتی ہے۔ ہر صوبے سے نام مانگے جاتے ہیں۔ ایک کمیٹی ہے جس کے صدر وزیر تعلیم ہوتے ہیں۔ ڈی پی۔ آئی سکریٹری ہوتا ہے۔ اڈوکیشن سکریٹری اور کچھ ex-officio اراکین ہوتے ہیں۔ ایک دفعہ کمیٹی کی میٹنگ ہوئی تو عسکری صاحب نے قاضی صاحب کا نام پیش کیا، وزیر تعلیم نے مجھ سے پوچھا، میں نے تائید کی اور کمیٹی نے منظور کرلیا۔ سفارش مرکزی حکومت کو بھیج دی گئی تھی کہ وہاں سے ایک خط آیا کہ وائس پریسیڈنٹ جاننا چاہتے ہیں کہ قاضی عبدالودود کا نام اس Award کے لئے بھیجا جاسکتا ہے یا نہیں۔ زبیری صاحب نے جو ڈپٹی سکریٹری تھے لکھا کہ مجھے یہ کہتے ہوئے خوشی ہوتی ہے کہ حکومت بہار نے خود ہی قاضی عبدالودود صاحب کے نام کی سفارش کی ہے چنانچہ

قاضی صاحب کو Certificate of Honour مل گئی۔

میں نے کہا ہے کہ قاضی صاحب کسی شکل میں بھی Humbug کو برداشت نہیں کرتے ہیں۔ وہ شاد ہوں ابوالکلام آزاد ہوں یا غالب یا اور کوئی ہو کسی کو وہ نہیں بخشتے ہیں اور ایسا ہوتا ہے کہ خاص خاص زمانے میں ان کا کوئی خاص bete noire ہو جایا کرتا ہے۔ اور وہ جب گفتگو کرتے ہیں تو اسی کے متعلق۔ کبھی شاد کی نوبت آئی تو انھیں کی غلط بیانیوں پر گفتگو ہونے لگی ہے۔ شاد کی ایک ایک تصنیف میں جتنی ارادی یا غیر ارادی غلطیاں ہیں وہ موضوع گفتگو بن جاتی ہیں۔ اور کچھ دنوں تک یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ کبھی ابوالکلام آزاد پر نکتہ چینیاں ہوتی ہیں اور ان کی صریح غلطیوں اور غلط بیانیوں پر تیز روشنی ڈالی جاتی ہے۔ کبھی غالب کی شخصیت کی دھجیاں اڑائی جاتی ہیں اور یہ سب باتیں محققانہ طور پر ثبوت کے ساتھ، حوالوں کے ساتھ ہوتی ہیں اور یہ سلسلہ کچھ دنوں تک جاری رہتا ہے پھر کوئی دوسرا bete noire مل جاتا ہے تو ادھر توجہ مبذول ہو جاتی ہے وہ ایک ہی نشست میں بہت سے مصنفوں کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں اور نئی نئی باتیں بتلاتے ہیں اور ان کی گفتگو میں بوقلمونی ہوتی ہے اور جیسا کہ میں نے کہا ہے ان کا حافظہ بھی بہت اچھا ہے اور وہ بولتے بھی بہت اچھا ہیں اور وہ اردو کے زبردست حامیوں میں ہیں اور اپنے نقطۂ نظر میں ایسے راسخ ہیں کہ اس کے خلاف کوئی بات نہیں برداشت کر سکتے ہیں۔ ڈاکٹر محسن نے شاید لکھ دیا کہ اردو کو دیوناگری رسم الخط اپنا لینا چاہئے اور محمد حسنین نے بھی، جو باتیں کبھی کبھی غیر سنجیدہ طریقے سے کیا کرتے ہیں، قاضی صاحب سے کہہ دیا کہ اس میں کیا مضائقہ ہے۔ بس وہ خفا ہو گئے اور کہنے لگے میں ایسے شخص سے کوئی تعاون نہیں کر سکتا۔ فراق گورکھپوری کے لئے کوئی خاص نمبر نکل رہا تھا یا Commemoration volume قاضی صاحب سے بھی لوگوں نے کچھ لکھنے کی فرمائش کی تو کہا میں نہیں لکھوں گا ــــ وجہ یہی کہ فراق نے بھی کہہ دیا تھا کہ اردو کو دیوناگری حروف

میں لکھا جائے۔ اسی طرح انہیں معلوم ہوا کہ جمیل مظہری صاحب نے گجرال کمیٹی کے سامنے بیان دیا ہے کہ اردو و ہندی دو زبانیں نہیں ایک زبان ہے اس لئے اردو کی علاحدہ کوئی ضرورت نہیں تو قاضی صاحب نے اپنی خفگی کا اظہار کیا۔

میں کہہ چکا ہوں کہ قاضی صاحب کا مطالعہ بہت وسیع ہے اور اس کی بنا پر کبھی کبھار وہ یہ دعویٰ کر بیٹھتے ہیں کہ فلاں تذکرے یا فلاں کتاب کا میرے علم میں صرف ایک نسخہ ہے اور کہتے کچھ اس ڈھنگ سے ہیں جس سے اثر ہوتا ہے کہ چونکہ ان کے علم میں صرف ایک نسخہ ہے اس لئے صرف ایک ہی نسخہ ہوگا۔ اور شاید ۹۹ فی صد میں ایسا ہی ہوتا ہے لیکن کبھی کبھار اس کے خلاف بھی ہوتا ہے۔ عبدالمالک آروی نے تذکرۂ شورش کا حوالہ دیا تھا تو قاضی صاحب نے لکھا تھا کہ اس کا صرف ایک نسخہ ہے جو ... لائبریری میں ہے۔ عبدالمالک آروی نے غلط لکھا تھا۔ انہوں نے تذکرۂ شورش نہیں دیکھا تھا۔ مجھے تذکرۂ شورش کا دوسرا نسخہ ہندوستان ہی میں مل گیا۔ اسی طرح جب تذکرۂ مسرت افزا معاصر میں قسط وار شائع ہو رہا تھا تو قاضی صاحب نے یہی کہا تھا کہ اس کا صرف ایک نسخہ ہے جس کی فوٹو اسٹیٹ کاپی پٹنہ یونیورسٹی لائبریری کے لئے منگائی گئی تھی۔ لیکن پھر اس کا ایک دوسرا نسخہ ہندوستان میں مل گیا۔ اصل یہ ہے کہ یورپ میں جو لائبریریاں ہیں ان کے کیٹلوگ ملتے ہیں۔ جو پرائیوٹ لائبریریاں ہیں ان کے بھی کیٹلوگ مل جاتے ہیں۔ آپ جا کر انہیں دیکھ سکتے ہیں۔ ہندوستان میں لائبریریوں کے کیٹلوگ مکمل نہیں ملتے ہیں۔ پھر نجی لائبریریوں میں کون کون سی کتابیں ہیں اس کا مطلق پتا نہیں۔ پھر بہت سی خانقاہیں، بہت سے افراد کے پاس کتابیں ہیں اور انہیں خود بھی خبر نہیں کہ ان کے پاس کون کون سی کتابیں ہیں۔ اس لئے کسی کتاب کے متعدد نسخوں کا پایا جانا بعید از قیاس نہیں۔ مثلاً بتیا راج لائبریری سے دیوان جوشش، دیوان فدوی، دیوان عشق کے علاوہ دیوان ضاحک کا ایک نسخہ مل گیا جسے سمجھا جاتا تھا کہ نایاب

ہے اور جس کے بارے میں آزاد نے یہ قصہ گھڑا تھا کہ ضاحک کی وفات کے بعد میر حسن دیوان ضاحک لے کر سودا کے پاس گئے اور اسے دھو ڈالا۔ اور سودا نے بھی ضاحک کی جو ہجویں لکھی تھیں انھیں پھاڑ ڈالا۔ بہت سی کتابیں تو ضائع ہو گئیں، بہت سی ضائع ہو رہی ہیں لیکن پھر بھی بعض نئی کتاب یا کسی کتاب کے نئے نسخے کے مل جانے کا امکان ہے۔

قاضی صاحب کو دائرۂ ادب اور معاصر سے گہری دلچسپی رہی ہے۔ حالانکہ وہ دائرۂ ادب کے رکن نہیں ہیں۔ لیکن وہ پٹنے میں رہتے ہیں اور باصحت رہتے ہیں تو دائرۂ ادب کے جلسوں میں شریک ہوتے ہیں۔ اور ان کے مشورے ہمیشہ مفید اور پرخلوص ہوتے ہیں۔ معاصر کے لیے وقت نکال کر برابر لکھتے رہے ہیں۔ معاصر کو نکلتے ہوئے تقریباً ۳۵ سال ہوئے ہیں۔ اس طویل مدت میں قاضی صاحب کی ہمدردی برابر معاصر کے ساتھ رہی ہے اور اس مدت میں جتنے مضامین انھوں نے معاصر کے لئے لکھے ہیں میں سمجھتا ہوں کسی دوسرے رسالے کے لئے نہیں لکھے ہیں۔ اور کئی بار تو انھوں نے معاصر کو بند ہونے سے بچا لیا۔ ہوا یہ کہ 1949 کے بعد معاصر کے انتظامی امور میں بدنظمی آگئی۔ دائرۂ ادب کے جلسے مہینوں پر ہوتے۔ معاصر کبھی نکلتا، کبھی نہیں نکلتا۔ مجھے یہ صورت حال پسند نہ آئی اور ۱۹۵۰ء میں دائرۂ ادب کے کسی جلسے میں میں نے کہا کہ اب اگر ہم لوگ معاصر کو باضابطہ نہیں نکال سکتے ہیں تو اسے بند کر دیا جائے۔ کچھ لوگوں نے اس کی مخالفت کی۔ خصوصاً قاضی صاحب نے کہا کہ معاصر کو بند نہیں ہونا چاہیے۔ انتظامی امور کو سنبھالنا چاہیے۔ اور انھوں نے یہ تجویز پیش کی کہ اسے سہ ماہی، علمی، تنقیدی، تحقیقی رسالے کی صورت میں نکالا جائے۔ یہ رائے سبھوں کو پسند آئی اور معاصر ماہوار رسالے سے سہ ماہی رسالہ ہو گیا۔ اور ابھی تک ہے۔ قاضی صاحب نے زیادہ سے زیادہ مضامین لکھے لیکن پھر کوئی ۱۹۷۰-۷۱ء میں میں نے دیکھا کہ پرانی بدنظمی عود کر آئی ہے۔ شروع میں چار نہیں تو تین نمبر ہر سال نکلتے تھے لیکن آہستہ آہستہ ان کی تعداد میں کمی ہونے لگی

اور میں نے دیکھا کہ آخری نمبر جو اس وقت نکلا تھا وہ تقریباً تین برسوں کے بعد۔ دائرۂ ادب کے جلسے بھی سات آٹھ مہینوں پر کبھی کبھار ہو جایا کرتے تھے تو پھر میں نے وہی تجویز پیش کی کہ شاید دائرۂ ادب اور معاصر کی ضرورت اب باقی نہیں رہی اس لئے انہیں بند کر دیا جائے تو بہتر ہے قاضی صاحب نے مجھ سے علحدہ بھی کہا کہ معاصر کو جاری رکھئے۔ یہ آپ کے والد کی یادگار ہے اور پھر میٹنگ میں بھی انہوں نے یہی کہا کہ معاصر کو جاری رہنا چاہئے اور یہ جاری رہا اور ہے۔ ظاہر ہے کہ قاضی صاحب کو معاصر سے دلچسپی تھی اور ہے،

آزاد خیال ہوتے ہوئے بھی وہ اپنی آزاد خیالی کا ڈھنڈورا نہیں پیٹتے ہیں۔ وہ مذہب کی قیود سے آزاد ہیں۔ میرے پاس ان کی ایک تحریر تھی (یہ سیلاب میں ضائع ہو گئی) جس میں وہ لکھتے ہیں:

"آلڈس ہکسلے نے ایک مضمون میں تصور توحید سے بحث کی ہے۔ سطر ۹ تا ۱۶ میں جو کچھ ہے اس سے مجھے بالکل اتفاق ہے (یہ اشارہ "اپنی تلاش میں" کی طرف ہے)۔ اسی قسم کے معاملات ہیں جن کی وجہ سے میرے نزدیک مذہب انسانی ایجاد معلوم ہوتا ہے۔ خدائی نہیں۔ میرا عقیدہ ۲۹ - ۳۰ برس کی عمر سے یہ ہے کہ کوئی مذہب قابل قبول نہیں۔ سائنس حقیقت کا انکشاف واقعی نہیں کر سکتا۔ فلسفہ بھی محض قیاس آرائی ہے مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ مذہب وحی یا کشف کی بنا پر جو کچھ کہے وہ صحیح مان لیا جائے۔ اگر کشف سے حقیقت معلوم ہو سکتی تو مذاہب کا اختلاف کیوں ہے۔ پھر مدعیان کشف کو اس کا اقرار بھی ہے کہ شیطان دھوکا دے سکتا ہے۔ احمد سرہندی مدعی مجدد وقت نے لکھا ہے کہ پہلے کشف سے معلوم ہوا کہ وحدت وجود درست ہے بعد کو کشف سے یہ پتا لگا کہ یہ نہیں وحدت شہود درست ہے۔ شاہ ولی اللہ نے جن کا پیشہ ہمیشہ تاویل تھا۔ یہ دکھانے کی نہایت ناکامیاب سعی کی ہے کہ دونوں ایک ہیں۔"

یہ باتیں انہوں نے "اپنی تلاش میں" پر comment کرتے ہوئے لکھی تھیں۔ ان سے ان کے

نقطۂ نظر کی وضاحت ہوتی ہے اور یہی ان سطروں کی اہمیت ہے۔ یوں زبانی تو وہ تفصیل کے ساتھ کہتے ہیں کہ کوئی مذہب قابلِ قبول نہیں لیکن معاصر کے اس نثر سے پہلے کبھی لکھ کر انہوں نے اپنے عقاید کا اعلان نہیں کیا۔ شاید اس کی ضرورت بھی انہیں نہیں محسوس ہوگی کیونکہ یہ ذاتی معاملہ ہے لیکن کوئی لکھ کر اس قسم کی آزاد خیالی کا اظہار کرتا ہے تو وہ اس کی جرأت کی تعریف کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ظفر حمیدی صاحب نے اپنی غزلوں اور نظموں کے مجموعے پر ایک مقدمہ لکھا تھا۔ اس میں اپنے عقاید کا بیباکی سے بیان کیا تھا تو قاضی صاحب نے مجھ سے کہا تھا کہ ظفر حمیدی نے بہت جرأت سے کام لیا ہے۔ جو مذہب کے قائل نہ ہوں لیکن کلچر کے لحاظ سے وہ اپنے کو مسلمانوں میں شمار کرتے ہیں۔ دعوت رد نہیں کرتے حالانکہ انہیں کھانے سے پرہیز ہے۔ کہیں شادی ہوئی تو شریک ضرور ہوتے ہیں، کوئی بیمار پڑا تو عیادت کے لئے ضرور جاتے ہیں۔ میرے چھوٹے لڑکے اظہر نے انگلینڈ میں ایک عیسائی لڑکی سے شادی کر لی قاضی صاحب نے سنا تو کہا خیر! اچھا کیا ہے۔

جہاں تک اخلاق کا تعلق ہے قاضی صاحب بالکل آزاد خیال نہیں ہیں بلکہ وکٹورین عالم ہوتے ہیں۔ ادب میں انگریزی ادب میں عریانی کو دیکھتے ہیں تو انہیں Shock سا لگتا ہے۔ کہنے لگے فلاں امریکن ناول بہت عریاں ہے Sexual act تک کا بیان ہے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں۔ انگلینڈ میں بیسویں صدی کی ابتدا سے ہی یہ انقلاب شروع ہو گیا تھا۔ ایک صاحب نے لکھا تھا کہ اگر ناول کے دس صفحے Sex سے متعلق نہ ہوں تو وہ ناول ہی کیا! البتہ ڈی ایچ لارنس اور جیمس جوائس کے ناول انگلینڈ میں ban ہوئے اور فرانس میں شائع ہوئے پھر بعد میں عام ہو گئے۔

عموماً تعمیری تحقیق اور تخریبی تنقید میں فرق کیا جاتا ہے۔ مثلاً کسی نے کسی قدیم شاعر کا دیوان اڈٹ کیا، اس کے متعلق معلومات جمع کیں تو اسے تعمیری تحقیق کہتے ہیں۔ کسی نے اس کتاب پر تبصرہ کیا اور بتایا کہ دیوان کے متن میں غلطیاں رہ گئی ہیں اور مختلف نسخوں کے حوالے سے اپنی بات ثابت کر دی اور یہ بھی بتایا کہ شاعر یا اس کے زمانے سے متعلق جو بیانات ہیں ان میں بے شمار غلطیاں رہ گئی ہیں اور original source کے حوالے سے جن سے مصنف کو واقفیت بھی نہ تھی غلط بیانیوں کی تصحیح کی تو اسے تخریبی تحقیق کہتے ہیں۔ اسی طرح اگر کسی نے کسی مصنف پر سیر حاصل کتاب لکھی بہت سی معلومات جمع کیں تو اسے تعمیری تحقیق کہتے ہیں اور اگر کسی نے اس کتاب کی دھجیاں اڑا دیں اور یہ واضح کر دیا کہ مصنف کی رائیں غلط ہیں، ناکافی شہادت پر مبنی ہیں اور یہ بھی بتایا کہ حقیقت کیا ہے تو اسے بھی تخریبی تحقیق کہیں گے۔ حالانکہ اگر پہلے دو مصنفوں کی غلطیوں کی تصحیح نہ کی جاتی تو نہ جانے کتنی غلطیاں صحت اور سچ کا جامہ پہن لیتیں اور آئندہ آنے والوں کی گمراہی کا سبب ہوتیں۔ غلطیوں کی نشان دہی کر کے تبصرہ نگار نے نہ صرف مصنفوں کو ان کی

غلطیوں پر متنبہ کیا بلکہ آئندہ آنے والوں کو گمراہی سے بچا لیا۔ اس کے علاوہ تحقیق غلطیوں کی نشان دہی صحیح، معتبر، تعمیری تنقید ہی سے ہو سکتی ہے۔ یہاں رایوں کا سوال نہیں جہاں اختلاف ممکن ہے، بلکہ عمر کا سوال ہے جہاں اختلاف کی گنجائش نہیں۔

میرا خیال تو یہ ہے کہ تحقیق تخریبی ہو ہی نہیں سکتی ہے۔ تحقیق کا مقصد ہے نئی معلومات کی دریافت اور ان کا بے کم و کاست بیان۔ پھر یہ تخریبی کیسے ہو سکتی ہے۔ قاضی صاحب کی تحقیق کو لوگ تخریبی اس لئے کہتے ہیں کہ انہوں نے دوسروں کی غلطیوں کی نشان دہی کی ہے لیکن ایسا کہنے والے اس حقیقت کو فراموش کر دیتے ہیں کہ یہ نشان دہی اور اس عظیم پیمانے پر بغیر وسیع، گہری اور مثبت تحقیق کے ناممکن ہے۔ اور قاضی صاحب کی تحقیق میں یہی وسعت، یہی گہرائی، یہی اثبات، یہی تعمیر ہے جس کا اندازہ وہی لوگ لگا سکتے ہیں جو ان کی تحریروں سے پوری طرح واقف ہیں۔

ایک بات یہ بھی کہی جاتی ہے کہ دیوان جوشش، تذکرہ ابن طوفان، اشتر و سوزن اور عیارستان کے علاوہ قاضی صاحب نے مستقل کتابیں نہیں لکھیں اور آخری دو تو ان تبصروں پر مشتمل ہیں جو معاصر میں شائع ہوئے تھے۔ بظاہر یہ بات درست معلوم ہوتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کا ایک ایک تبصرہ ایک ایک مقالہ کتاب کی حیثیت رکھتا ہے۔ غالب بحیثیت محقق، آزاد بحیثیت محقق، عبدالحق بحیثیت محقق ان میں سے ہر ایک مستقل کتاب ہے۔ تذکروں پر جو ان کے تبصرے ہیں وہ الگ ایک کتاب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اگر انہیں اکٹھا کر دیا جائے۔ مجھے خوشی ہے کہ بہار اردو اکادمی نے ان کے منتخب مضامین کو شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے — اور یہ منتخب مضامین بھی ۱۰-۱۲ جلدوں میں ہوں گے — اگر یہ کام مکمل ہو گیا تو قاضی صاحب کی عظمت کا صحیح اندازہ ہو سکے گا اور یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جائے گی کہ وہ ایک مثالی محقق ہیں۔
